قوم کو متحد اور یکجا کرنے کے لیے جنگ ستمبر کی ایمان افروز فضا پیدا کرنا ہوگی

جذبہ دفاع پاکستان

اُردو ڈائجسٹ

ستمبر ۲۰۱۷ء

urdudigest.pk
www.urdudigest.pk

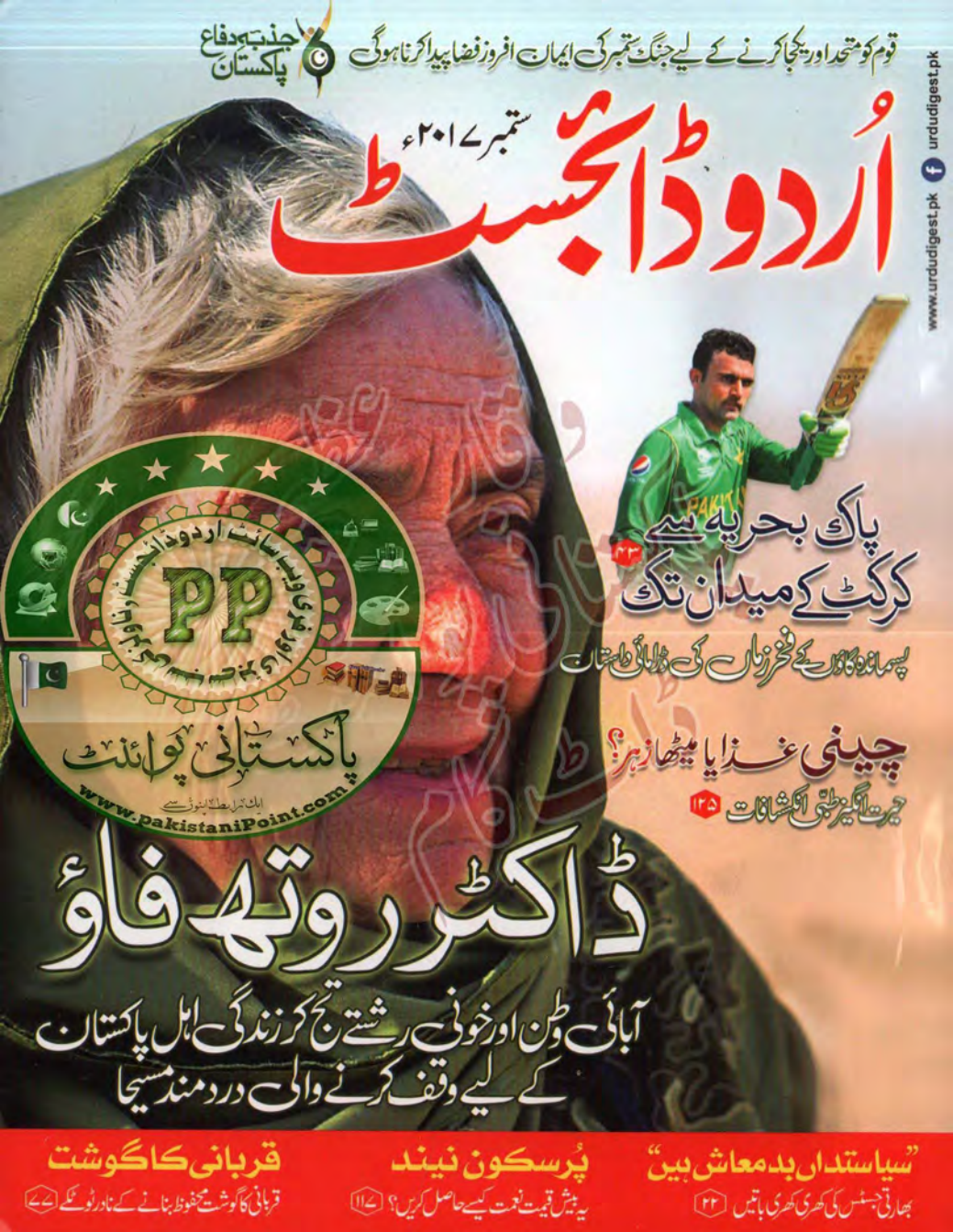

پاک بحریہ سے کرکٹ کے میدان تک ۴۳

پسماندہ گاؤں کے فخر زماں کی ڈرامائی داستان

چینی غذا یا میٹھا زہر؟

حیرت انگیز طبی انکشافات ۱۲۵

ڈاکٹر روتھ فاؤ

آبائی وطن اور خونی رشتے تج کر زندگی اہلِ پاکستان کے لیے وقف کرنے والی دردمند مسیحا

"سیاستداں بدمعاش ہیں"

بھارتی جسٹس کی کھری کھری باتیں ۲۲

پُرسکون نیند

یہ بیش قیمت نعمت کیسے حاصل کریں؟ ۱۱۷

قربانی کا گوشت

قربانی کا گوشت محفوظ بنانے کے نادر ٹوٹکے ۷۷

پاکستانی پوائنٹ
www.pakistaniPoint.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

اللہ کے لیے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے جو اُس (بیت اللہ) تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ (آلِ عمران :۸۹)

حج وعمرہ کو اللہ (عزوجل) کے لیے پورا کرو۔ (البقرۃ :۱۹۶)

تو آپ اپنے رب کے لیے (عید کی) نماز پڑھیں اور قربانی کریں۔ (الکوثر :۲)

رسول ﷺ کا فرمان

فرمانِ نبوی: حج وعمرہ محتاجی اور گناہوں کو ایسے دور کرتے ہیں، جیسے بھٹی لوہے اور چاندی اور سونے کے میل کو دور کرتی ہے اور حج مبرور کا ثواب جنت ہی ہے۔ (جامع الترمذی، الحدیث :۸۱۰، ج۲، ص۲۱۸)

حضرت مخنف بن سلیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم عرفہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس کھڑے تھے، آپ نے فرمایا: ''اے لوگو! ہر سال ہر گھر والے پر ایک قربانی واجب ہے''۔ (احمد بن حنبل، مسند احمد، ۴ :۲۱۵)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو آسودہ حال ہونے کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔'' (ابن ماجہ، رقم الحدیث :۳۱۲۳)

اُردو ڈائجسٹ

ستمبر 2017ء
ذوالحج 1438ھ
جلد نمبر 57 شمارہ نمبر 09

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سیّد عاصم محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
پروف خواں: ارم ناز
ڈیزائنر و کمپوزر: کاشف شہزاد، فیصل ایوب

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0300-4005579
لاہور: ندیم حامد

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk
فون: +92-42-35290707
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر
اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت فی شمارہ: 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

ٹرمپ گرہن

میرے پچھلے چند ہفتے شمالی امریکا میں گزرے۔ دورانِ قیام مجھے امریکی معاشرے کو گہرائی و گیرائی سے دیکھنے کا موقع ملا۔ امریکا میں صدر ٹرمپ نے برسرِ اقتدار آ کر تھرتھلی مچا رکھی ہے۔ جس دن ۹۹ رسال بعد امریکا میں سورج گرہن ہوا، تو اکثر امریکیوں کو یہ کہتے سنا کہ اس کے مضر اثرات نجانے کب آئیں گے ابھی تو وہ ٹرمپ گرہن کا عذاب سہہ رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی حرکتوں سے ٹرمپ امریکی تاریخ کا بدترین صدر کہلانے لگا ہے۔

میں نے بھی خصوصی چشمہ پہن کر سورج گرہن کا منظر دیکھا جو میرے لیے یادگار اور حیرت انگیز تجربہ بن گیا۔ اس فطری عمل نے سورج کے گرد طلسماتی ہالہ بنا ڈالا جس کے کناروں پر اٹھتے شعلے صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ بڑا جادوئی اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا جس نے دیکھنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عظمت آشکارا کر دی۔

دراصل صدر ٹرمپ نے انتخابی مہم کے دوران اپنے ووٹروں سے جو وعدے کیے تھے ابھی تک ان میں سے ایک بھی ایفا نہ ہو سکا۔ پھر انھوں نے حکومت سنبھال کر جو اقدامات کیے ان میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس امر نے ٹرمپ کو سیخ پا کر دیا۔ امریکی صدر کا المیہ یہ ہے کہ وہ لکھی تقریر تو ناکام اداکار کی صورت پڑھ ڈالتے ہیں مگر جب وہ ٹیلی پرامپٹر کے بجائے اپنے خیالات عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، تو انہیں سخت ناکامی ہوتی ہے۔ اکثر ان کی باتیں اسکینڈلز کھڑے کر دیتی ہیں۔ ٹرمپ کسی نامور یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نہیں البتہ ایک عیار و شاطر بزنس مین ضرور ہیں۔ وہ اسی انداز سے امریکی حکومت کے فیصلے بھی کر رہے ہیں۔

امریکا میں تمام اختیارات ''عہدہ صدر'' میں مرتکز نہیں، بہت سے اختیار امریکی کانگریس (پارلیمنٹ) کو بھی حاصل ہیں مگر ٹرمپ کانگریس کو خاطر میں لائے بغیر پالیسی بیان جاری کر دیتے ہیں۔ جھوٹی انا کے مارے امریکی صدر اپنے سامنے کسی کو اہمیت نہیں دیتے۔

ٹرمپ کی پالیسیاں امریکی عوام کو بھی تقسیم کرنے کا کرشمہ دکھا چکیں۔ ٹرمپ گرہن سے جنم لینے والی ایک حالیہ بدشگونی کی کہانی ملاحظہ فرمائیے۔ فروری ۲۰۱۷ء میں امریکی شہر، شارلٹس ویل (Charlottesville) کی بلدیہ نے فیصلہ کیا کہ مقامی پارک میں لگا 'کنفڈریٹ جنرل رابرٹ لی' کا مجسمہ ہٹا دیا جائے۔ بلدیہ نے اسے غلامی کی یادگار قرار دیا تھا۔ جب یہ خبر عام ہوئی تو ٹرمپ کے انتہا پسند سفید فام حامی مجسمہ نہ گرانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ جلد ہی یہ معاملہ متنازعہ بن گیا۔ ۱۲ راگست کو ایک سفید فام نے مجسمہ گرانے کے حامیوں پر کار چڑھا دی۔ نتیجے میں ایک عورت ہلاک اور کئی افراد زخمی ہوئے۔

جلسے جلوسوں میں ٹرمپ کے حامیوں نے اسلحے کی کھلی نمائش کی اور شدید تعصب کا مظاہرہ کیا۔ عام خیال یہ ہے کہ امریکا میں غلامی کا دور ختم ہو چکا، مگر اس تنازع سے عیاں ہوا کہ بہت سے سفید فام آج بھی سیاہ فاموں اور گندمی رنگ کے لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انسانی حقوق کے چیمپئن ملک میں ایسی صورت حال پیدا ہونا انتہائی تشویش ناک ہے۔

امریکی قوم کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے اور خود کو کامیاب دکھانے کے لیے صدر ٹرمپ نے نئی افغان پالیسی کا ڈول ڈال دیا۔ انھوں نے افغانستان میں اپنی فوج کی ناکامی کا ذمے دار پاکستان کو ٹھہرایا اور اپنے اس دیرینہ اتحادی پر برس پڑے۔

یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب سابق جرنیل صدر ایوب خان کے زمانے میں خطے میں سویت یونین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو روکنے کے لیے ''بغداد پیکٹ'' (سینٹو) کے ذریعے پاکستان امریکا کا اتحادی بنا۔ تب امریکا میں بھی ایک سابق جرنیل اور مذہب پرست آئزن ہاور صدر تھا۔ اس معاہدے کے بعد پاکستان کو امریکا سے عسکری و مالی امداد ملنے لگی۔ رفتہ رفتہ امریکا سیاسی، معاشی اور عسکری لحاظ سے اپنے ایشیائی اتحادی پر ایسا حاوی ہوا کہ اسے آقا کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

امریکا کا اتحادی بننے سے قبل پاکستان کی معیشت بہت بہتر تھی۔ ہمارا ملک قرضوں کی لعنت سے پاک تھا۔ پاکستانی گندم اور کپاس کو دنیا بھر میں شہرت حاصل تھی مگر امریکا سے اتحاد ہوتے ہی وطن عزیز قرضوں کے ایسے جال میں جکڑا گیا جن کے ساتھ سخت شرائط نتھی تھیں ساتھ ہی ملک دہشت گردی کا شکار بھی ہوتا چلا گیا۔

پاکستانی حکمران امریکی حکومت سے ہدایات لے کر قومی پالیسیاں بنانے لگے۔ تمام قومی فیصلوں میں امریکی مفادات کو اہمیت دی جانے لگی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ملک امریکی امداد کے سہارے ترقی نہیں کر سکا۔ چند خاندانوں کو چھوڑ کر اس امداد سے عوام کے مسائل حل ہوئے اور نہ ہی اُن کا معیارِ زندگی بہتر ہوا۔

ڈونلڈ ٹرمپ کے افغان پالیسی بیان پر پاکستانی سیاست دانوں نے کوئی شافی جواب نہ دیا۔ تب آرمی چیف کا بیان آیا کہ ہمیں عسکری و مالی امداد نہیں عزت و احترام چاہیے۔ اس سے عیاں ہے کہ وطن عزیز میں طاقت کے ستون سمجھ چکے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان امریکی چھتری کے نیچے سے نکل آئے۔ ہمارے سیاست داں بھی بدلتے حالات سے آگاہ ہیں۔ اس عظیم تبدیلی کے بطن سے ہمارے ملک اور خطے میں زبردست تبدیلیاں جنم لیں گی۔ معیشت ہو یا طرزِ حکمرانی اور حکمرانوں کے چہرے، سبھی کے خدوخال تبدیل ہوں گے۔ یہ ضروری ہے کہ طاقت کے ستون آنے والی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے عوام کو تیار کر لیں۔ بدلتے معاشی حالات میں مہنگائی کی لہر بھی اُٹھ سکتی ہے۔

ہماری سول اور عسکری قیادت کو عملی مثال سے ثابت کرنا ہو گا کہ وہ تبدیلی کے لیے تیار ہیں۔ انہیں سرکاری اخراجات گھٹانا ہوں گے۔ نوجوانوں کو منظم اور تربیت یافتہ فورس بنانا ہو گا جو آج صنعتی ترقی کے لیے شرطِ اول ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری کے لیے ماحول سازگار بنانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ''ٹرمپ گرہن'' کے ذریعے قدرت نے پاکستان کو خود انحصاری کی راہ پر چلانے اور خوددار بنانے کا سنہرا موقع عطا کیا ہے طاقت کے مراکز کو یہ انقلاب ساز لمحہ کسی صورت نہیں گنوانا چاہیے۔

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

فہرست

کچھ اپنی زباں میں......

جنگِ ستمبر کی فضا پیدا کریں...... جو ہمارے لیے عزیمت و ایثار کی زندہ و پائندہ مثال بن چکی — الطاف حسن قریشی — ۰۹

ہم کہاں کھڑے ہیں

مرحلۂ سخت جاں...... یہ وقت صحیح تجزیے اور مضبوط قوتِ ارادی سے کام لینے کا ہے — الطاف حسن قریشی — ۱۲

اسلامی زندگی

نماز میں موبائل فون کا بجنا...... ایک اہم سوال کا عالمانہ جواب — عادل اصلاحی — ۱۵۲

شیر شاہ سوری کا انصاف...... تاریخِ اسلام سے سبق آموز واقعات کا انتخاب — پروفیسر خالد پرویز — ۵۲

قرآن کا معجزہ...... رب کائنات نے جب اپنے بندے کو بے یار و مددگار چھوڑنا گوارا نہ کیا — رفیق سجاد — ۴۹

کمپیوٹر سائنس

بہترین مفت سافٹ ویئر...... شائقینِ کمپیوٹر کے لیے کارآمد پروگراموں کا منفرد تحفہ — ابوصارم — ۹۷

مزاح

چارہ گروں کے درمیاں...... معالجوں کے چنگل میں پھنسے مریض کی دہائی — ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی — ۱۴۲

اُڑتی سی اِک خبر ہے...... اخبار کی ان گنت خوبیاں عیاں کرتا شوخ و شنگ قلم پارہ — ڈاکٹر رؤف پاریکھ — ۲۱۱

انجمن حقوقِ مرداں...... بیوی کے چنگل میں پھنسے مسکین شوہر کی آہوں بھری جگ بیتی — ملک محمد انور — ۱۷۸

خاکے

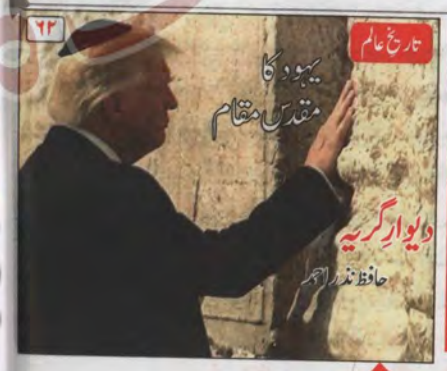

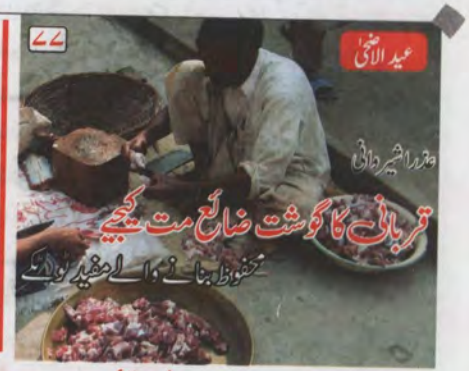

ملتان کا سرسید...... جہالت کے خلاف جہاد کرنے والے مجاہد کی داستان — جاوید مسرت — ۱۷۰

کتاب کا عاشق رخصت ہوا...... علم و ادب کے چراغ جلانے والے درویش کا تذکرہ — محمد طارق انصاری — ۱۸۱

لاہور ریڈیو میدانِ جنگ میں...... اکیاون برس قبل کے ڈرامائی دنوں کی جھلکیاں — تجمل حسین — ۱۰۷

میں ایک فوجی کی ماں...... اُمید کے دیے روشن کرنے والا پاکیزہ جذبات سے مملو قصہ — سعدیہ جبار — ۱۴۸

قومی شاعری...... نامور اردو شعرا کا امنگ بھرا نذرانہ عقیدت — ارم ناز — ۲۳۱

سرورقی کہانی

ڈاکٹر روتھ فاؤ...... جذام کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے والی جرمن معالج کی ولولہ انگیز کہانی — عافیہ مقبول جہانگیر — ۱۲

چشم کشا

سیاست دانوں نے ملک تباہ کر دیا...... بھارتی جسٹس کی دو ٹوک باتیں — ہادی احمد — ۲۲

خصوصی رپورٹ

پاک بحریہ سے کرکٹ کے میدان تک...... پسماندہ گاؤں کے سپوت فخر زماں کی ڈرامائی داستان — سید عاصم محمود — ۴۵

ازدواجیات

شوہر پر قابو پانے کا راز...... ایک عاقل کے سنہرے مشورے نے گھر کو مثل جنت بنا دیا — ناہید جعفر — ۶۷

اخلاقیات

بدتہذیبیاں...... معاشرے کی تکلیف دہ عادات کا بیان جو بے حسی کو اجاگر کرتی ہیں — عافیہ مقبول جہانگیر — ۷۰

حق...... اُس منافق عورت کی کتھا جو غریبوں کو اظہارِ ہمدردی پر ٹالنے کا گر جانتی تھی — بینا صدیقی — ۷۴

عالمی ادب

عشق نہیں آساں...... ایسے شوہر کا پُرلطف ماجرا جس نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری — جے۔ پی۔ الفریڈ — ۵۷

ت دار...... دو دوستوں کا طرح دار قصہ، جو ایک دوسرے پر جان لٹاتے تھے — دلیپ سنگھ — ۱۱۳

ہزادی کا معمہ...... انوکھی چال چل کر پرایا نگر فتح کرنے والے بادشاہ کی کہانی — حفیظ جالندھری — ۱۶۲

آپ بیتی

چھوٹے آدمی کا بڑا پن...... ایک لائبریرین کے دلچسپ تجرباتِ زندگی — م۔ص۔ ایمن — ۸۱

اردو ادب

سہارا...... اولاد پہ جان چھڑکنے والی ماں کا دل افروز فسانہ، اُسے ایک عجب امتحان نے آن گھیرا تھا — خدیجہ مستور — ۱۳۶

انوکھا ڈرائیور...... مالکن کا حکم بجا لانے والا ایسا فرماں بردار کم ہی نظر آتا ہے — حجاب امتیاز علی — ۱۹۷

دوسرا راستہ...... اس قوم کا فسانۂ غم جس کے ناخدا راہ کھو کر بے راہ رو ہو گئے — انتظار حسین — ۲۱۴

قاتل کی تلاش..... قتل کے ایک پیچیدہ کیس کی قدم قدم پر نئے موڑ لیتی تحیر خیز داستان — شاکر لطیف — ۱۰۰

غذائیات

چینی !! غذا یا میٹھا زہر؟..... کیا ہم مٹھاس کے نام پر کیمیائی مادے تو چٹ نہیں کر رہے؟ — ذیشان محمد بیگ — ۱۲۵

آملہ، وٹامن سی کا خزانہ..... قدرت کی طرف سے انسان کے لیے بیش بہا فوائد کا حامل تحفہ — صبا عمران — ۱۹۲

سفرنامہ

توپ کاپی کی زیارت..... اسلامی تبرکات کا مخزن عجائب گھر — ڈاکٹر آصف محمود جاہ — ۱۲۹

معاشرت

اُترن..... سوشل میڈیا کا منفی چہرہ بے نقاب کرتا تازیانہ — نبیلہ خان — ۱۳۵

سرخ گلاب..... معمولی نیکی بھی غم و آلام میں گھرے انسان کا بیڑا پار لگا دیتی ہے — سارا احمد — ۱۷۴

طب و صحت

پُرسکون نیند، ایک بیش قیمت نعمت..... دن بھر کی تھکن اُتار پھینکنے والا تحفۂ خداوندی — ارم ناز — ۱۱۷

لمحۂ فکریہ

وہ اچانک چلے گئے..... انسانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتی بلند آہنگ منادی — رضی الدین سید — ۱۵۰

مہذب کون ہے؟..... دورِ نو کی بظاہر پڑھی لکھی معزز ہستیوں سے چبھتا ہوا سوال — عبدالباسط ذوالفقار — ۲۰۰

دو لاکھ ڈالر..... ایک چالباز کی حیرت آفریں کہانی، اُس نے نشانے کے گرد عیاری سے جال بچھایا — رچرڈ بل — ۲۰۲

معلومات

انارکلی کا بھوت..... ایک پُراسرار ہستی کا بیان، تاریخ میں داستانیں اُس کی ذات سے منتھی ہو چکیں — عالیہ شاہ — ۱۵۸

گمنام شعراء کے مشہور اشعار..... ان شعروں کا تذکرہ جو زبان زدِ عام ہو چکے — پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی — ۲۲۳

تعلیمات

ماسٹر خوشی محمد کی پیسٹری..... ایک عمر رسیدہ قاری کے قلم سے زمانۂ طالب علمی کی خوش کن یادیں — محمد امین باجوہ — ۱۹۴

مستقل سلسلے

☆ چمنِ خیال

جنگِ ستمبر کی فضا پیدا کریں

یہ جنگ ہماری قومی زندگی میں عزیمت و ایثار کے ایک مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ بھارت کی برہمنی قیادت نے پاکستان کا وجود کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا اور بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پاکستان کے پہلے یوم آزادی پر خیر سگالی کا جو پیغام بھیجا اس میں کہا گیا کہ مسلمانوں کی نئی مملکت صرف چھ ماہ قائم رہے گی اور ہمارے اندر دوبارہ شامل ہونے کے لیے منت سماجت کرے گی۔ پاکستان کو انتظامی اور معاشی طور پر مفلوج کرنے کے لیے دس لاکھ سے زائد شہید اور ایک کروڑ کے لگ بھگ مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔ ریاست جموں و کشمیر جسے برصغیر کی تقسیم کے فارمولے کے مطابق پاکستان میں شامل ہونا چاہیے تھا' اس کے دارالحکومت سری نگر میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی رات فوجیں اتار دی گئیں جس نے آگے چل کر بہت بڑے تنازع کی صورت اختیار کر لی۔ اس تنازع پر دونوں ملکوں میں دو سال جنگ ہوتی رہی اور جب پاکستانی فوجیں جموں کے قریب پہنچ گئیں تو اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے بھارت کی درخواست پر فائر بندی کا اعلان کر دیا۔ قرارداد میں طے پایا کہ ریاست جموں و کشمیر ایک متنازع علاقہ ہے جس کے عوام اپنا حق خود ارادیت استعمال کرتے ہوئے آزادانہ رائے شماری سے اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔ پنڈت نہرو آزادانہ رائے شماری کے انعقاد میں روڑے اٹکاتے اور پاکستان پر دباؤ بڑھاتے رہے۔ اُن کے حکم پر ۱۹۵۱ء میں بھارتی فوجیں پاکستانی سرحد پر جمع ہو گئیں اور جنگ کا الٹی میٹم دے دیا۔ وزیراعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان نے پوری قوت سے مکا لہرا کر بھارت کا الٹی میٹم حقارت سے مسترد کر دیا اور عوام کے اندر زبردست جوش و خروش پیدا ہوا۔ بھارت کو اپنی فوجیں پیچھے ہٹانا پڑیں لیکن اس کی جارحانہ سرگرمیاں مختلف صورتوں میں جاری رہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جب بھارتی ظلم جب حد سے بڑھتا گیا تو آزاد جموں و کشمیر کی

فوجیں اپنے بھائیوں کو بھارت کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے مقبوضہ جموں وکشمیر میں اکھنور کے قریب پہنچ گئیں' تب بھارت نے کسی اعلان کے بغیر بین الاقوامی سرحد عبور کرتے ہوئے ۵ اور ۶ ستمبر کی درمیانی رات لاہور پر حملہ کر دیا۔ اسی حملے نے پاکستانی قوم کی کایا پلٹ کے رکھ دی اور یوں بہادری' سرفروشی اور فوج اور عوام کے درمیان مثالی تعلّقات کی ایک نئی تاریخ رقم ہوئی۔

صدر ایوب خان نے ۶ ستمبر کی صبح اپنی اُردو میں نشر ہونے والی تقریر میں جب یہ کہا کہ دس کروڑ دلوں میں لا الہ الا اللہ کی صدا گونج رہی ہے اور دشمن کو یہ نہیں معلوم کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے جس کا ایمان اور ایقان محکم ہے۔ ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک دشمن کی توپیں خاموش نہیں ہو جاتیں' تو ہر گھر سے نعرہ تکبیر بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا تبدیل ہوتی گئی۔ یوں لگا جیسے رنجشوں' کدورتوں' محاذ آرائیوں کے تمام سوتے بند ہو گئے ہوں اور قومی یک جہتی کے چشمے اُبلنے لگے ہوں۔ کوئی دس ماہ پہلے پاکستان میں صدارتی انتخاب کا معرکہ بپا ہوا تھا جس میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح فیلڈ مارشل ایوب خان کے مدمقابل کھڑی تھیں اور انتخابی مہم کے دوران اپوزیشن جماعتوں نے فوجی آمر کے خلاف بڑی تند و تیز تقریریں کی تھیں۔ مشرقی پاکستان اور کراچی میں مادرِ ملت کا زبردست خیر مقدم ہوا تھا اور عمومی تاثر یہ تھا کہ انھیں وہاں سے بھاری اکثریت میں ووٹ ملے مگر سرکاری مشینری نے ایوب خان کو کامیاب قرار دیا جس پر کراچی میں خونریز ہنگامے ہوئے اور ملکی فضا سخت مکدر تھی۔ اس انتہائی کشیدہ ماحول میں صدر ایوب خان نے یہ اعلان کیا کہ دس کروڑ دلوں میں لا الہ الا اللہ کی صدا گونج رہی ہے اور سیاست دانوں کو مشاورت کی دعوت دی تو تمام سیاسی زعما کشاں کشاں چلے آئے اور حکومت کے شانہ بشانہ کھڑے ہو گئے۔ قومی راہنماؤں کے اس طرزِ عمل نے پوری قوم کو غیر معمولی طور پر متحد اور منظم کر دیا جو کسی طور ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس اتحاد و اتفاق نے پاکستان کو سترہ روزہ جنگ میں حیرت انگیز کامیابیاں عطا کیں۔ آج وہی فضا پیدا کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے' کیونکہ مختلف نوعیّتوں کی چپقلشوں سے داخلی اور خارجی چیلنجز بہت گمبھیر ہو گئے ہیں۔

۶ ستمبر کی جنگ سے پہلے مارچ ۱۹۶۵ء میں رن آف کچھ میں جھڑپیں اس قدر شدت اختیار کر گئی تھیں کہ برطانوی وزیراعظم کو سیز فائر کے لیے مصالحتی کردار ادا کرنا پڑا تھا۔ معاہدے کے مطابق طے پایا تھا کہ دونوں طرف کی فوجیں اپنی دفاعی پوزیشنوں سے بھی پیچھے چلی جائیں گی اور سرحدوں کے قریب بچھی ہوئی سرنگیں صاف کر دی جائیں گی۔ ان شرائط کی رو سے پاکستانی فوجیں امن کے دوران کی پوزیشنوں میں چلی گئی تھیں اور سرحدوں پر ٹروپس انتہائی کم

تعداد میں تھے۔ اچانک یلغار کی صورت میں ان ٹروپس نے دشمن کی پیش قدمی اپنی جان پر کھیل کر چوبیس گھنٹوں سے اڑتالیس گھنٹوں روکے رکھی اور اپنی فوج کو تیار ہونے کا موقع فراہم کیا۔ دشمن کا حملہ اچانک اور اس قدر شدید تھا کہ اسے پسپا کرنے کے لیے فوجی افسر جوانوں کی قیادت کرتے ہوئے اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ بھارت جو رقبے' آبادی اور فوجی طاقت کے اعتبار سے پاکستان کے مقابلے میں آٹھ دس گنا بڑا تھا' وہ اپنے مذموم عزائم میں ناکام رہا۔ اس نے عالمی رائے عامہ کو دھوکا دینے کے لیے آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی سے یہ جھوٹی خبر نشر کرائی کہ لاہور پر بھارت کا قبضہ ہو گیا ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج کی ایمانی قوت' بہت محکم' پیشہ ورانہ تربیت نہایت عمدہ' ڈسپلن حد درجہ مثالی تھا کہ اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم نے سرگودھا بیس پر سات منٹ میں سات بھارتی طیارے مار گرائے اور فضائی جنگ میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اسی طرح چونڈہ میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ٹینکوں کی سب سے خوفناک جنگ لڑی گئی جو بھارتی ٹینکوں کے قبرستان میں تبدیل ہو گئی۔ پاکستان اپنی آزادی اور خودمختاری کے دفاع میں معجزانہ طور پر کامیاب رہا تھا۔

۶ ستمبر کی فضا کا سب سے قابلِ ذکر پہلو عوام کا اپنی فوج کو اپنی آنکھوں پر بٹھانا اور کامل ہم آہنگی کا ثبوت دینا تھا۔ فوجی دستے جہاں سے گزرتے لوگ اُن پر پھولوں کی بارش کرتے اور اُن کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھا دیتے۔ خون دینے والوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی رہتیں۔ محاذوں پر بڑی مقدار میں ضروریاتِ زندگی پہنچائی جاتیں۔ نوجوان رضاکارانہ خدمت بجالانے کے لیے بے تاب رہتے۔ پوری فضا قومی نغموں سے معطّر اور مترنم رہتی۔ شہری خوف و ہراس کا شکار ہونے کے بجائے استقامت' بے خوفی اور بلند ہمتی کی تصویر بنے ہوئے تھے اور اپنے فوجی بھائیوں کا حوصلہ بڑھانے اور اُن کا ہاتھ بٹانے میں پیش پیش تھے۔ بفضلِ خدا فوج اور عوام کے مابین محبتوں کے یہ رشتے آج بھی قائم ہیں اور جو عالمی دہشت گردی کے قلع قمع میں نہایت مؤثر ثابت ہو رہے ہیں' مگر گاہے گاہے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جذبات سے مغلوب بعض عناصر اور غیر متوقع ناخوشگوار واقعات ان رشتوں کو ضعف پہنچاتے اور بدگمانیاں پھیلاتے رہتے ہیں۔ انتہائی کڑے امتحان اور آزمائش میں سرخرو ہونے کے لیے ہمیں چھ ستمبر کی فضا پیدا کرنا اور قومی اداروں کے مابین اعتماد کے رشتوں کو استحکام بخشنا ہوگا۔ فوج ہمارے دلوں میں بستی ہے اور اسی گہری محبت کو آئین کی روح میں ڈھال کر پاکستان کے مستقبل کو محفوظ اور تابندہ بنایا جا سکتا ہے۔ اداروں کے مابین کامل ہم آہنگی اور توازنِ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے جس کا شعور ہر طبقے اور ہر سطح پر تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے اور وزیراعظم شاہد خاقان عباسی نے اسٹیبلشمنٹ کی ایک نہایت فکر انگیز تشریح کی ہے کہ منتخب حکومت ہی اصل اسٹیبلشمنٹ ہے۔

الطاف حسن قریشی

مرحلۂ سخت جاں

گزشتہ چند برسوں کے دوران پاکستان کو درپیش داخلی اور خارجی چیلنجز جو شکل اختیار کرتے جارہے ہیں' اس سے خوف آنے لگا ہے یہ وقت صحیح تجزیے اور مضبوط قوت ارادی سے کام لینے کا ہے

اُبھرتے اور بل کھاتے حالات کا جائزہ

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

آزادی کے ستر سالہ سفر میں ہم زمین کی پستیوں سے اُٹھ کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہماری حیثیت ہی کیا تھی؟ ہم بیک وقت انگریزوں اور ہندوؤں کے انتقام اور نفرت کا شکار تھے۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر کم و بیش ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی' اس خطے کو مسلم تہذیب و تمدن سے روشناس کرایا تھا اور زندگی کا ایک نیا اسلوب دیا تھا۔ مسلم حکمرانوں کے عہد میں پہلی بار ایک ملک بنا تھا جبکہ ان سے پہلے وہ مختلف ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہندوستان جو ذات پات کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا' مسلمان حکمرانوں نے اس میں برابری' فیاضی' عالی ظرفی اور عزتِ نفس کے اعلیٰ معیار اور باہمی رواداری کی نہایت عمدہ مثالیں قائم کیں۔ ان تمام احسانات کے باوجود ہندوؤں کو اس بات کا شدید قلق تھا کہ مسلمانوں نے اُن پر طویل عرصے تک حکومت کی ہے اور اس بنا پر اُن سے انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ انھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کی حمایت حاصل ہوگئی جو اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے مسلمانوں کی رہی سہی طاقت بھی کچل دینا چاہتے تھے' چنانچہ انھوں نے ہر میدان میں ہندوؤں کو فوقیت دی' اُن پر تعلیم'

روزگار اور سیاست کے دروازے کھول دیے۔ انڈین کانگریس جو ہندو اکثریت کی سیاسی جماعت تھی' اُس کی بنیاد ایک انگریز نے رکھی۔ اس طرزِ عمل کے برعکس' انگریزی حکومت کے خلاف مزاحمت کرنے پر سیکڑوں علمائے کرام پھانسی پر لٹکا دیے گئے یا عمر قید کی سزا دے کر کالا پانی بھیج دیے گئے۔ مسلمانوں کے کھاتے پیتے خاندانوں کی معاشی حالت اس قدر خستہ ہوتی گئی کہ وہ فاقوں پر مجبور ہو گئے تھے، تعلیمی اداروں میں مسلم طلبہ کی تعداد ناقابل ذکر تھی جبکہ سرکاری محکموں میں ہندی مسلمانوں کا تناسب اور بھی کم تھا۔ وہ انتہائی بے کسی کی حالت میں چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان پستے چلے جارہے تھے۔

سرسید احمد خان جن کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی بصیرت عطا کی تھی انھوں نے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی راہیں تلاش کیں اور علی گڑھ میں مسلم کالج قائم کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ وہ شروع شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور انھیں ایک چہرے کی دو آنکھیں قرار دیتے تھے' لیکن جب برہمن قیادت نے اُردو زبان کے خلاف تحریک چلائی اور مسلمانوں کے بارے میں حقارت آمیز رویہ اختیار کیا' تو وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ یہ دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ اس اعتبار سے سرسید احمد خان دو قومی نظریے کے سیاسی خالق تصور کیے جاتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں نامور مسلم زعما ڈھاکا میں جمع ہوئے جہاں مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ وہ ۱۹۳۷ء تک خواص کی جماعت کے طور پر دیکھی جاتی رہی۔ جناب محمد علی جناح ہندوستان کی سیاست سے بددل ہو کر انگلستان میں آباد ہو گئے تھے۔ اُن کے ساتھ حکیم الامت حضرت محمد اقبال خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ جن کی دور رس نگاہ نے ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ وہ جناح صاحب کو ہندوستان واپس آکر مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کے لیے مسلسل خطوط لکھتے رہے۔ اسی زمانے میں نوابزادہ لیاقت علی خان جو علی گڑھ سے بیرسٹری کر کے آئے تھے' وہ لندن میں جناب محمد علی جناح سے ملے اور انھیں واپس ہندوستان آنے پر قائل کرلیا' چنانچہ وہ ۱۹۳۷ء میں لندن سے آگئے اور آل انڈیا مسلم لیگ نے انھیں اپنا صدر منتخب کرلیا۔

اُن کی قیادت میں یہ جماعت مسلمانوں کے جذبات اور امنگوں کی ترجمان بن گئی اور مارچ ۱۹۴۰ء میں اس کی دعوت پر پورے ہندوستان سے ایک لاکھ سے زائد مندوبین لاہور کے منٹو پارک میں جمع ہوئے اور قائداعظم کی صدارت میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ منظور کیا۔ انگریز اور ہندو اس مطالبے کے سخت خلاف تھے' مگر حضرت قائداعظم نے مکالمے کی قوت' کردار کی عظمت اور مسلمانوں کی بے مثل حمایت سے تینوں بڑی طاقتوں کو قیام پاکستان پر آمادہ کرلیا۔ ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو سے تقسیم ہند کا اعلان ہوا۔ ریڈیو سے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن' پنڈت جواہر لال نہرو اور بلدیو سنگھ کے علاوہ قائداعظم محمد علی جناح نے خطاب کیا اور آخر میں پوری توانائی سے پاکستان زندہ باد کہا۔ یہ سخت معرکہ سیاسی عمل' مذاکرات اور زمینی حقائق کے ادراک سے طے ہوا اور پاکستان ۱۴ اور ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب وجود میں آیا۔ خوش نصیبی سے وہ لیلۃ القدر تھی اور اگلے دن جمعۃ الوداع تھا۔ کروڑوں مسلمان آزادی مل جانے پر اپنے رب کے حضور

سجدۂ شکر بجالائے تھے۔

☆☆☆

ہماری آزادی کے حصول میں سیاسی جدوجہد کے علاوہ بنیادی طور پر روحانی عوامل بھی کارفرما تھے۔ ہم انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی اکثریت کے جبر سے گلوخلاصی پانے کے ساتھ ساتھ اقتصادی' معاشرتی اور علمی ترقی کے بھی آرزومند تھے اور اپنی اعلیٰ قدروں کے مطابق ایک ایسا معاشرہ تشکیل کرنے کے بھی آرزومند تھے جس میں انسانیت کے لیے امن' اخوت اور معاشرتی انصاف کا بہترین ماڈل موجود ہو۔ ان عظیم آدرشوں کے جلو میں ہم نے آزادی کے سفر کا آغاز کیا تھا جبکہ ہمیں ایک کٹا پھٹا پاکستان ملا جس میں انتظامی اور معاشی انفراسٹرکچر بڑی حد تک مفقود تھا۔ برہمن قیادت بار بار ہمیں احساس دلا رہی تھی کہ تقسیم کی لکیر چند مہینوں کے اندر ناپید ہوجائے گی کیونکہ مسلمانوں کو حساب کتاب آتا ہے نہ اُن کے اندر انتظامی امور چلانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے' مگر ایک دنیا یہ منظر نامہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی کہ پاکستان نے ایک کروڑ مہاجرین کا بوجھ بھی اٹھالیا اور انتہائی مضبوط بنیادوں پر دفتری نظام بھی قائم کرلیا تھا۔ وزیرِخزانہ ملک غلام محمد نے پہلا فاضل بجٹ پیش کیا تو بھارت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ۱۹۵۴ء میں تو وہ حواس باختہ ہوگیا جب پاکستانی روپے کی قدر میں بھارتی روپے کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۶۲ء میں پاکستانی معیشت کی شرح نمو دس فی صد کے لگ بھگ پہنچ گئی تھی اور وہ جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرنے والا ملک قرار پایا تھا۔ اس غیر معمولی ترقی میں عوام کا زبردست ایثار' بانیانِ پاکستان کا بے پایاں اخلاص اور بھارت سے پاکستان منتقل ہونے والی بیوروکریسی کی غیر معمولی صلاحیتوں کا بڑا عمل دخل تھا۔ تقسیم کے بعد غیر مسلم بیوروکریٹس اور ٹیکنوکریٹس بھارت چلے گئے تھے اور دفتر خالی پڑے تھے۔ مہاجرین اور مقامی لوگوں نے یہ خلا نہایت مشکل حالات میں پُر کیا۔ دفتروں میں بیٹھنے کے لیے کرسیاں تھیں نہ لکھنے کے لیے دافر کاغذات' مگر لوگ اپنے وطن کی تعمیر میں جُت گئے اور دن رات ایک کردیا۔ بھارتی لیڈرشپ کی خواہشات کے علی الرغم پاکستان حیرت انگیز رفتار سے اپنے قدم جماتا اور ترقی اور خوشحالی کی منزلیں طے کرتا گیا جس کی بدولت وہ عالمی طاقتوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور اسلامی دنیا میں اسے ایک مرکزی حیثیت ملتی گئی۔

بھارت کو اپنی فوجی طاقت پر بھی بہت زعم تھا' مگر اسے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کی جنگوں میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے سیز فائر کی بھیک مانگنا پڑی تھی۔ تب اس نے ایٹمی طاقت بن جانے کا آپشن اختیار کیا اور 'بدھا مسکراتا ہے' کے نام سے پہلا ایٹمی دھماکا ۱۹۷۴ء میں کر ڈالا۔ اس پر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق نے بڑی طاقتوں کی سخت مخالفت اور اُن کی طرف سے کڑی پابندیوں کے باوجود پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے لیس کردیا۔ بھارت کی برہمن قیادت نے پاکستان کو مرعوب کرنے اور آزاد کشمیر میں فوجیں اُتار دینے کے لیے ۱۹۹۸ء میں پانچ ایٹمی دھماکے کیے جس کے جواب میں چند ہفتوں بعد چاغی کی پہاڑیوں میں چھ ایٹمی دھماکے کیے جو دنیا بھر کی بڑی تجربہ گاہوں میں ریکارڈ کیے

گئے۔ یوں پاکستان صرف نصف صدی میں کیکر کے کانٹوں سے کہوٹہ تک پہنچ گیا تھا۔ بین الاقوامی ماہرین اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت بھارت سے کئی درجے بہتر ہے اور اس کے میزائل ٹیکنالوجی میں بہت آگے ہیں۔ گزشتہ ایک عشرے سے بھارت کی فوجی قیادت 'محدود جنگ' کی دھمکیاں دیتی رہی ہے کہ ہم تیزی سے پاکستان کی اسٹریٹیجک تنصیبات کو نقصان پہنچا کر واپس آجائیں گے۔ پاکستان کے سائنس دانوں اور ٹیکنالوجسٹ نے اس خطرے کے جواب میں ٹیکنیکل بم تیار کرلیے ہیں جو کم فاصلے پر دشمن کی فوج کو تباہی سے دوچار کرسکتے ہیں۔ ان چھوٹے ایٹم بموں سے بھارت جھنجھلا اٹھا ہے اور اس نے کنٹرول لائن کی سنگین خلاف ورزیوں کا سلسلہ شروع کردیا ہے جس کا مقصد پاکستان کو مسلسل دباؤ میں رکھنا ہے' لیکن مقبوضہ کشمیر میں برہان وانی کی شہادت کے بعد نوجوانوں کی جو تحریک اُٹھی ہے وہ پوری وادی میں پھیلتی جارہی ہے۔ اسے دبانے کے لیے بھارت انتہائی غیر انسانی ہتھکنڈے استعمال کررہا ہے جن کے خلاف بھارت کے اندر سے طاقت ور آوازیں اُٹھ رہی ہیں اور پاکستان بھی دنیا کو اس کا اصل چہرہ دکھا رہا ہے۔ اس نئی صورت حال سے پورے خطے میں ایک خوفناک چپقلش دیکھنے میں آرہی ہے جو علاقائی اور عالمی امن کے لیے بہت بڑے خطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

آزادی کے ثمرات گزشتہ ستر برسوں میں قدم قدم پر محسوس ہوتے رہے ہیں کہ پاکستان نے ہر میدان میں قابل ذکر ترقی کی ہے اور اس کے شہریوں کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب آیا ہے۔ تعلیم' تحقیق اور سائنس کے شعبوں میں ہمارے نوجوان دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کررہے اور ایجادات و اختراعات میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ ہمارے لاکھوں ہنرمند شہری مختلف ممالک کی معیشت اور انتظام و انصرام میں گراں قدر خدمات سرانجام دے کر داد حاصل کررہے ہیں اور پچیس ارب ڈالر سے زائد زرمبادلہ اپنے ملک بھجواتے ہیں۔ اس زرِمبادلہ سے جہاں پاکستان کو اقتصادی قوت حاصل ہورہی ہے' وہاں لاکھوں خاندانوں کا معیارِ زندگی یقیناً بہتر ہوا ہے۔ پاکستانی تارکین وطن اب جن ملکوں میں آباد ہیں' وہاں کی سیاست اور طرزِ معاشرت پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں آگے جارہے ہیں۔ قدرت نے ہمیں آگے بڑھنے کے بڑے بڑے مواقع عطا کیے اور عظیم امکانات کے در کھول دیے ہیں۔ پاکستان کی آب و ہوا' اس کے موسم' اس کے دریا' اس کے سمندر' اس کے کوہسار' اس کے صحرا اور اس کی زرخیز سرزمین اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں جو قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں۔ اس کا جغرافیائی محل وقوع ایک دنیا کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور سی پیک کے عظیم منصوبے نے براعظموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور اقتصادی اور سیاسی تعلقات میں گہرائی اور استحکام پیدا کرنے کے عمل کو مہمیز دی ہے جس میں پاکستان کو مرکزی مقام حاصل ہے۔

بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک روا رکھا جارہا ہے اور مسلمانوں کی تہذیب اور تشخص کو مٹانے کے جو جتن

ہورہے ہیں' انھوں نے پاکستان کی قدر ومنزلت میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے اور یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ہمارے اسلاف نے ایک آزاد وطن کے لیے جو عہد آفریں جدوجہد کی تھی اور بے مثال قربانیاں دی تھیں' وہ عمل ہندو سامراج سے نجات حاصل کرنے اور مسلمانوں کو ایک روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے ناگزیر تھا۔ پاکستان اس پورے خطے میں بھارتی استبداد کے خلاف ایک ناقابل تسخیر طاقت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس نے عالمی دہشت گردی کی کمر توڑ دینے میں ایک محیرالعقول کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کی فوج جو دنیا کی چھٹی بہترین فوج شمار ہوتی ہے' اس نے عوام کی حمایت سے عسکریت پسندوں کے محفوظ ٹھکانے اور ٹریننگ سنٹر مسمار کردیے ہیں۔ اب حکومت کو ذہنوں کی تبدیلی پر کام کرنا چاہیے۔ امید ہے کہ دانش وروں' علما اور میڈیا کے تعاون سے انتہاپسندانہ ذہنیت پر جلد قابو پالیا جائے گا۔ بلاشبہ ہم ان کارناموں پر فخر کرسکتے ہیں' مگر کچھ برسوں سے ہمارے داخلی حالات ایک ایسا رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں جس کے باعث ہمیں اندیشہ ہائے دوردراز نے گھیر لیا ہے' کبھی کبھی سانحہ مشرقی پاکستان کے مناظر آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگتے ہیں اور دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے۔

☆☆☆

آزادی کے سفر میں جہاں ہم عظیم الشان کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے' وہاں ہماری تعمیر میں خرابی کی صورتیں بھی پیش آتی رہیں جو آج نہایت گمبھیر چیلنج بنتی جارہی ہیں۔ ہم اختصار کے طور پر یہاں چند بنیادی عوامل کا ذکر کریں گے۔ (۱) سیاسی جماعتوں کی غیر جمہوری افزائش' (۲) قومی یک جہتی کا فقدان' (۳) آئین سازی میں تاخیر اور عدم توازن' (۴) غیر شفاف انتخابات' (۵) معاشرتی اور عدالتی انصاف کی عدم فراہمی (۶) تعلیم وتربیت کے بارے میں شدید غفلت (۷) خارجہ تعلقات میں بے احتیاطی (۸) اداروں کا ناقابل تصور زوال۔ ان چند منفی عوامل ہماری آزادی کے سفر میں رخنے بھی ڈالتے رہے اور ہمیں انتہائی خوفناک بحرانوں سے دوچار بھی کرتے رہے۔ بنیادی خرابی ہماری سیاسی جماعتوں اور ہمارے نظام تعلیم کے اندر پائی جاتی ہے جو ایک جمہوری اور سیاسی نظام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلم لیگ جو پاکستان کی خالق جماعت تھی' حصول آزادی کے بعد مختلف دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اور اس پر طالع آزما قابض ہوتے گئے۔ پھر نادیدہ قوتوں نے راتوں رات ری پبلکن پارٹی قائم کی اور اقتدار اسی کے گرد گھومتا رہا اور علاقائی سازشیں پروان چڑھتی رہیں۔ سول اور ملٹری بیوروکریسی کی ملی بھگت سے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوا جس میں سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ پابندی اٹھی تو فیلڈ مارشل ایوب خان کی کنونشن لیگ وجود میں آئی جس کے سیکرٹری جنرل جناب ذوالفقار علی بھٹو مقرر ہوئے' اس کے اور کونسل مسلم لیگ' عوامی لیگ اور جماعت اسلامی کے مابین زبردست کشمکش جاری رہی۔ ۱۹۶۷ء میں بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی بنانے کا اعلان کیا۔ ۱۹۷۰ء میں انتخابات ہوئے تو عوامی لیگ نے بنگلہ عصبیت اور منظم دھاندلی کے بل بوتے پر تقریباً تمام نشستیں جیت لیں اور مغربی پاکستان کے دو

بڑے صوبوں میں پیپلز پارٹی نے بھاری اکثریت حاصل کرلی۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل آغا خان نے دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کرائے تھے مگر حالات ایسا رخ اختیار کرتے گئے کہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہی نہ ہوسکا اور سیاسی جماعتیں کسی آئینی مسودے پر اتفاق نہ کرسکیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالات قابو سے باہر ہوتے گئے اور بھارت کی فوجی مداخلت سے مشرقی پاکستان ہم سے کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ سیاسی جماعتوں کے اندر شدید محاذ آرائی اور فوجی قیادت کے بے بصیرتی اور ہوس اقتدار نے ہمیں یہ بُرے دن دکھائے تھے۔

پینتالیس برس بعد سیاسی جماعتوں کے مابین سرپھٹول کا ایک ایسا ہی منظر تاریخ کے افق پر نمودار ہوا ہے۔ اپریل ۲۰۱۶ء میں پاناما پیپرز لیکس کا غلغلہ بلند ہوا جس میں وزیراعظم نواز شریف کے بیٹوں اور بیٹی کے نام تو تھے' مگر اُن کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ تحریک انصاف کے چیئرمین جناب عمران خان' امیر جماعت اسلامی سینیٹر سراج الحق اور عوامی لیگ کے صدر شیخ رشید احمد نے آئین کے آرٹیکل (۳) ۱۸۴ کے تحت وزیراعظم نواز شریف اور اُن کے خاندان کے خلاف عدالت عظمیٰ میں رٹ دائر کی۔ فاضل عدالت کے رجسٹرار نے اسے غیر سنجیدہ قرار دیتے ہوئے واپس کردیا۔ اکتوبر میں عمران خان نے اسلام آباد کو لاک ڈاؤن کرنے کے لیے ۲ نومبر کی کال دی۔ اس پر فاضل چیف جسٹس انور ظہیر جمالی نے انتہائی عجلت میں اس درخواست کی سماعت کے لیے یکم نومبر کی تاریخ مقرر کردی۔ تحریک انصاف کا لاک ڈاؤن بُری طرح ناکام رہا' لیکن مقدمے کی سماعت کے دوران عدالت کے باہر فریقین اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے اور ٹی وی اسکرین پر چھائے رہے۔

☆☆☆

۲۰/اپریل ۲۰۱۷ء کو پانچ رکنی بنچ جس کے سربراہ فاضل جسٹس آصف سعید کھوسہ تھے' نے تقسیم شدہ فیصلہ سنایا۔ دو جج صاحبان نے قرار دیا کہ وزیراعظم صادق اور امین نہیں رہے اور انھیں اقتدار سے دستبردار ہوجانا چاہیے۔ تین جج صاحبان نے فیصلہ دیا کہ مزید ثبوت حاصل کرنے کے لیے جے آئی ٹی تشکیل کی جاتی ہے جو دو ماہ کے اندر اندر اپنی رپورٹ پیش کرنے کی پابند ہوگی۔ یہی تین جج صاحبان ہر پندرہ روز بعد جے آئی ٹی کی رپورٹ کا جائزہ لیتے اور حتمی رپورٹ آنے پر پانچ روز مقدمے کی سماعت فرماتے رہے۔ سماعت کے دوران بعض جج صاحبان نے جو ریمارکس دیے ان میں کھلا تضاد محسوس ہوتا رہا۔ ایک طرف یہ ارشاد ہوا کہ جے آئی ٹی رپورٹ میں وزیراعظم کے خلاف کرپشن اور اختیارات سے تجاوز کا کوئی الزام نہیں۔ دوسری طرف وزیراعظم سسلین مافیا کے لقب سے نوازے گئے۔ پھر اچانک اعلان ہوا کہ پانچ ججوں پر مشتمل بنچ فیصلہ سنائے گا۔ قانونی حلقے اس اعلان پر چونکے کہ وہ دو جج صاحبان جنھوں نے جے آئی ٹی کی رپورٹ کی سماعت میں حصہ نہیں لیا' وہ فیصلہ کیسے سنا سکتے ہیں۔ متفقہ فیصلہ صادر ہوا کہ وزیراعظم نے اپنے بیٹے کی کمپنی سے تنخواہ وصول نہیں کی اور اسے اپنا اثاثہ ظاہر نہیں کیا' اس لیے وہ امین اور صادق نہیں رہے۔

اس عدالتی فیصلے سے قانونی' سیاسی اور بین الاقوامی حلقوں میں ایک ارتعاش پیدا ہوا ہے۔ وزیراعظم نواز شریف نے

عدالت عظمیٰ کے حکم نامے پر وزارت عظمیٰ سے فوری طور پر استعفا دے دیا۔ ان کی جگہ بھاری اکثریت سے جناب شاہد خاقان عباسی وزیراعظم کا منصب سنبھال چکے ہیں۔ بظاہر کاروبار حکومت معمول کے مطابق چل رہے ہیں' مگر فضا میں ایک ہیجان بپا ہے اور سوالات کے تیر ذہنوں کو چھلنی کیے دیتے ہیں۔ اداروں کے درمیان تصادم کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔

سابق وزیراعظم جناب نواز شریف نے اسلام آباد سے لاہور آتے ہوئے بڑے بڑے جلسوں میں عوام سے بار بار یہ سوال پوچھا' کیا تمھیں عدلیہ کا فیصلہ منظور ہے؟' جواب نفی میں آتا رہا۔ ان سے یہ عہد بھی لیا گیا کیا تم معاشی' معاشرتی اور عدالتی انصاف کے حصول کی خاطر میرا ساتھ دو گے؟ پُرجوش نعروں میں ہاں میں جواب ملا۔ انھوں نے یہ سوال بھی جگہ جگہ اٹھایا 'کیا تمھیں یہ منظور ہے کہ بیس کروڑ عوام جس شخص کو اپنا وزیراعظم چنیں' اسے پانچ جج نکال باہر کردیں؟ جواب یہی تھا کہ ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔ عمومی تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ نواز شریف جب یہ کہتے ہیں کہ میرے سینے میں بہت سارے راز پوشیدہ ہیں' میں انھیں ایک روز فاش کردوں گا۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ ان رازوں کا تعلق عدلیہ' فوج اور سیاست میں اُن مفاد پرست عناصر سے ہے جو اپنی انا کی تسکین کی خاطر جمے جمائے نظام کو تلپٹ کردینا چاہتے ہیں۔ خدشہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اداروں کے مابین تصادم شدت اختیار کر جائے گا جس کے نتیجے میں پاکستان میں عدم استحکام بڑھے گا اور اس خطے کی تقدیر بدلنے والے منصوبے سی۔ پیک پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام ہر سطح پر کرپشن کا خاتمہ اور میرٹ کی حکمرانی چاہتے ہیں مگر پاناما پیپر زمقدمے کا جو فیصلہ سامنے آیا ہے' اس نے تنازعات کا پینڈورا باکس کھول دیا ہے جس سے ریاست کا وجود زخمی ہوتا جا رہا ہے۔ کرپشن اور ہر نوع کے استحصال پر قابو پانے کے لیے سنجیدگی سے قانون سازی کرنا اور احتساب کے نظام کو مؤثر بنانا ہوگا۔ وہ رشوت ستانی اور بدعنوانی جس کا سرطان ہماری رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے' اس کی بیخ کنی کے لیے اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے علاوہ ایک زبردست اصلاحی تحریک چلانے کی ضرورت ہوگی۔ یہ اشرافیہ جس میں نواز شریف' عمران خان اور آصف زرداری' جہانگیر ترین' اعظم سواتی اور ہزاروں کی تعداد میں وڈیرے شامل ہیں' ان کی شاہانہ زندگی کا مواخذہ قانونی دائرے میں رہتے ہوئے ضرور ہونا چاہیے۔ سابق وزیراعظم اور ان کے خاندان کے خلاف سپریم کورٹ کے پانچ رکنی بنچ نے نیب کو ریفرنسز دائر کرنے کی ہدایت کی ہے لیکن آزاد قانونی حلقے ان ہدایات کو فطری انصاف کے تقاضوں کے خلاف قرار دیتے ہوئے اس خدشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس طرح کی کارروائی سے معاشرہ مزید تقسیم ہوگا اور اداروں کے مابین بدگمانیوں کو ہوا ملے گی۔

☆☆☆

اس وقت ہم سیاسی جماعتوں کو جس طرح ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں' وہ ہمیں ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء کے تاریک دنوں کے مناظر یاد دلا رہی ہیں۔ تب ان کے درمیان دشمنی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور آج بھی وہی عالم ہے۔ سوشل میڈیا

شعلوں پر تیل چھڑک رہا ہے اور کوئی بھی معقول بات سننے پر آمادہ نہیں۔ گالم گلوچ جس کا کلچر تحریک انصاف نے روشناس کرایا ہے' وہ نوجوانوں پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا ہے اور عوام سیاست دانوں سے بیزار نظر آتے ہیں۔ آج کی انتہائی پیچیدہ صورت حال کا یہی پہلو حد درجہ خطرناک ہے۔ سیاست دانوں کو عام لوگوں کی نگاہوں میں نامعتبر کرنے سے قومی شیرازہ بکھرنے لگتا ہے اور غیر سیاسی طاقتوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ قومی طاقت کے بنیادی عوامل ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہونے کے بجائے تصادم کی راہ اختیار کرتے اور عالمی برادری میں جگ ہنسائی کا باعث بنتے ہیں۔

سیاست دانوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی جھڑپوں نے عظیم قومی مفادات کو بہت زک پہنچائی ہے۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے بعد صوبائی خودمختاری کے نام پر صوبے وسیع اختیارات و وسائل کے مالک بن جانے سے بڑی حد تک بے لگام ہو گئے ہیں۔ اس ترمیم نے پاکستان کی فیڈریشن کو کنفڈریشن میں تبدیل کر دیا ہے۔ معاشرے میں طبقاتی کشمکش تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ ڈسپلن کو شدید ضعف پہنچ جانے سے ینگ ڈاکٹرز آئے روز ہڑتال کرتے اور بڑے بڑے سماجی مسائل پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ہم کبھی طلبہ کو اپنی یونیورسٹیوں کے خلاف سراپا احتجاج دیکھتے ہیں اور آج کل نوجوان وکلا عدالتوں کا وقار پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں اساتذہ اپنے مطالبات کے حق میں طاقت کا اظہار کرنے چلے تھے۔ کسانوں کے اضطراب کی داستان مزید لرزہ خیز ہے۔ اس انتشار اور افراتفری میں پاکستان مخالف طاقتوں کو اپنے اہداف تک پہنچنے کے راستے ہموار ہوتے جاتے ہیں۔

بھارت جو داخلی طور پر ہم سے کہیں زیادہ سنگین مسائل سے دوچار ہے' وہ بڑی ہوشیاری اور عیاری سے علاقائی اور عالمی سطح پر اپنے اثر و نفوذ میں اضافہ کیے جا رہا ہے۔ بلاشبہ اس کی ترقی پذیر معیشت' اس کی مڈل کلاس کا حجم' اس کا رقبہ اور اس کا جمہوری چہرہ اقوام عالم کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ اس کی یونیورسٹیوں' اس کے تحقیقی ادارے اور اس کے سفارت خانے اور اس کے وسیع تعداد میں تارکین وطن اپنے ملک کا امیج سنوارنے اور دوسرے ملکوں میں 'ان روڈز' بنانے میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ انھی کاوشوں کے نتیجے میں بھارت نے متحدہ عرب امارات' سعودی عرب اور دوسرے مسلم ممالک میں بھی غیر معمولی پیش رفت کی ہے۔ افغانستان' ایران اور عمان نے بھی اس سے خاصے مضبوط تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ امریکا جس کے پاکستان کے ساتھ تاریخی رشتے قائم رہے ہیں' بھارت نے اس کے ساتھ روابط مستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی وسیع پیمانے پر فروغ دیا ہے۔ امریکی صدر ٹرمپ نے ۲۲/اگست کو افغانستان کے حوالے سے جو پالیسی بیان دیا ہے اس میں بھارت کی عظمت کے گیت گائے گئے ہیں جبکہ پاکستان کے حصے میں ننگی دھمکیاں آئی ہیں کہ اگر اس نے تمام دہشت گردوں کا صفایا نہ کیا اور وہ افغان طالبان کو مذاکرات کی میز پر لانے میں ناکام رہا' تو اسے بہت کچھ بھگتنا پڑے گا۔

☆☆☆

صدر ٹرمپ نے افغانستان کے بارے میں جو پالیسی بیان دیا ہے' اس میں اُن کی سیماب صفتی بھی منعکس ہوتی ہے اور اس میں پاکستان کے داخلی حالات کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی انتخابی مہم کے دوران بھارت کے ساتھ بڑے پیمانے پر تعاون بڑھانے کی بات کی تھی جس کا اظہار اُن کے پالیسی بیان میں بھی ہوا ہے' مگر اقتدار سنبھالنے کے بعد انھوں نے امریکا میں آباد پاکستانیوں کی صلاحیتوں اور اُن کی بہت ساری خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ مل کر خطے میں فروغ امن کے لیے کام کرنے میں خوشی محسوس کریں گے' کیونکہ ان میں قائدانہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ انھیں جس انداز میں اقتدار سے محروم کیا گیا ہے' اس کے منفی اثرات صدر ٹرمپ کے پالیسی بیان میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ حکومت پاکستان' اپوزیشن اور خارجہ امور کے ماہرین کی طرف سے مختلف لہجے اور مختلف زاویوں سے جواب دیا گیا ہے۔ اس بیان کی مخالفت چاروں طرف سے ہوئی ہے۔ سخت باتیں بھی ہوئی ہیں' مگر بڑی حد تک احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ پالیسی بیان آتے ہی شاہد خاقان عباسی سے فوری طور پر کابینہ کا اجلاس طلب کیا جس میں پالیسی بیان کے تمام پہلو زیرِغور آئے ہیں۔ وہ سعودی عرب مشاورت کے لیے سعودی عرب ایک روزہ دورے پر گئے اور شاہ سلمان کے علاوہ انھوں نے اُن کے صاحبزادے اور ولی عہد محمد بن سلمان سے تفصیلی مشاورت کی ہے جن کے نئی امریکی انتظامیہ سے گہرے روابط ہیں۔ انھوں نے واپس آتے ہی قومی سلامتی کمیٹی کی صدارت کی جس میں ایک ہمہ پہلو ریسپانس تیار کیا ہے۔ سیاسی اور عسکری قیادت پانچ گھنٹے غور وخوض کے بعد متفقہ طور پر امریکی صدر کے پالیسی بیان میں پاکستان کے خلاف لگائے ہوئے تمام الزامات کو مسترد کر رہے ہیں اور اسے حد درجہ افسوس ناک قرار دیا ہے کہ اس میں پاکستان کی عظیم قربانیاں نظرانداز کر دی گئی ہیں۔ قومی سلامتی کمیٹی کے اعلامیے میں امریکا سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ افغانستان میں دہشت گردوں کی جو محفوظ پناہ گاہیں موجود ہیں سب سے پہلے اُن کا صفایا کیا جائے۔ اس کے علاوہ امریکی صدر نے اپنے بیان میں بھارت کو افغانستان میں جو کردار سونپا ہے اس کے نتائج بہت مہلک نکلیں گے' کیونکہ وہ اس خطے میں دہشت گردی پھیلانے کا سب سے زیادہ ذمے دار ہے۔ اس اعلامیے میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ پاکستان نے عالمی دہشت گردی کے خلاف جنگ ڈالروں کے لالچ کے بجائے اپنے بہترین قومی مفاد میں لڑی ہے اور وہ افغانستان میں قیامِ امن کا سب سے زیادہ خواہش مند ہے۔ اعلامیے میں اس عزم کا اعادہ کیا گیا ہے کہ پاکستان ماضی کی طرح اپنی سرزمین کسی کے خلاف استعمال نہیں ہونے دے گا اور وہ اپنے ہمسایوں سے بھی یہی توقع رکھتا ہے۔ چین اور روس کے اعلیٰ عہدے داروں نے امریکی صدر کے پالیسی بیان پر کڑی تنقید کرتے ہوئے افغانستان میں پاکستان کے کردار کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور مشورہ دیا ہے کہ اس کی حاکمیت اور اس کے خدشات کو بنیادی اہمیت دینا ہوگی۔ پالیسی کے اس فیصلے سے شدید اختلاف کیا گیا ہے جس میں افغانستان کا فوجی حل اپنایا گیا ہے۔ قومی سلامتی کمیٹی نے دوٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ پاکستان صرف سیاسی حل ہی میں امن کی ضمانت فراہم کرسکتا ہے۔ کل آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ نے امریکی سفیر سے

گفتگو کرتے ہوئے باوقار انداز میں کہا ہے کہ ہمیں امریکی امداد کے بجائے اعتماد کی ضرورت ہے اور قیامِ امن میں تمام اسٹیک ہولڈروں کو مشترکہ کوششیں کرنا ہوگی۔ سینٹ کے چیئرمین جناب رضا ربانی نے امریکی قیادت کو ویت نام اور کمبوڈیہ کا انجام یاد دلاتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان کے تعاون کے بغیر افغانستان امریکا کا قبرستان بن جائے گا۔ زیادہ تر سنجیدہ حلقوں کی سوچ یہ ہے کہ امریکا جو واحد سپر پاور ہے' اس کے ساتھ مذاکرات کا عمل جاری رکھنا چاہیے اور زمینی حقائق پر مبنی بیانیہ ترتیب دے کر اسے اہم امریکی مراکز تک پہنچایا جائے۔ اس ضمن میں کانگریس تھنک ٹینکس اور میڈیا بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن میں پاکستان کی اہمیت کو سمجھنے والے دماغ خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ صدر ٹرمپ کے لب و لہجے میں درشتی پاکستان کے اندر ظہور پذیر ہونے والے ناخوشگوار واقعات سے بھی آئی ہے۔

گزشتہ ہفتوں میں حالات جس تیزی سے بے قابو ہوتے جارہے تھے' ان میں اب قدرے ٹھہراؤ پیدا ہوا ہے۔ ڈی جی آئی ایس پی آر میجر جنرل آصف غفور کی پریس کانفرنس خوشی اور امید کا ایک جھونکا محسوس ہوئی۔ دراصل ہمارے آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ہم سے ماضی میں غلطیاں ہوئی ہیں اور ہمیں اُن سے سبق سیکھنا چاہیے۔ غلطی کا اعتراف بڑی عظمت کی بات ہے۔ میجر جنرل آصف غفور نے انہی کے وسعت فکر کی عکاسی کی ہے اور اپنی پریس کانفرنس میں اعلان کیا ہے کہ فوج کا سیاسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ سینٹ کے چیئرمین جناب رضا ربانی نے گرینڈ ڈائیلاگ کا جو نظریہ پیش کیا ہے' اس کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ فوج ریاست کا حصہ ہے اور حکومت جو فیصلہ کرے گی فوج اس میں اپنا کردار ضرور ادا کرے گی۔ اس کے بعد قوم نے خوشخبری سنی کہ قومی اسمبلی نے انتخابی اصلاحات کا بل بھاری اکثریت سے منظور کرلیا ہے جس میں الیکشن کمیشن کو آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرانے کے لیے پوری مالی اور انتظامی خودمختاری حاصل ہوگی۔ اس قانون کی رو سے سیاسی جماعتیں خاص نشستوں پر پانچ فیصد ٹکٹ خواتین کو دینے کی پابند ہوں گی۔ اس میں یہ بھی طے پایا ہے کہ پولنگ اسٹیشن ایک کلومیٹر کے اندر قائم کیا جائے گا۔ اس بل کی منظوری سے سیاسی جماعتوں کے اندر باہمی تعاون کا جذبہ عود کر آیا ہے۔ اسی طرح وزیرِمملکت محترمہ مریم اورنگ زیب کی شبانہ روز کوششوں سے اطلاعات تک رسائی کا بل بھی منظور ہوگیا ہے جس سے حکومت کا مؤثر اور قابلِ اعتماد احتساب کیا جاسکے گا اور عمدہ نظم ونسق کے ذریعے عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے پر خاطرخواہ توجہ دی جائے گی۔ یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ محترمہ کلثوم نواز کی بیماری کی خبر سن کر آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ' عمران خان نے نواز شریف سے اظہار ہمدردی کیا ہے۔ سماجی رابطے اسی طرح پروان چڑھتے رہے اور اتحاد واتفاق کے سلسلے گہرے ہوتے گئے تو ہم اپنے تنازعات حسن وخوبی سے طے بھی کرلیں گے اور حوادث وآلام سے بھی محفوظ رہیں گے۔ قومی حلقے یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ پاکستان کے فاضل چیف جسٹس اس فیصلے کی نظرثانی کے عمل کو اہمیت دیں گے جس نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہت بڑے تنازع کو جنم دیا ہے۔ مسائل وسعتِ قلبی ہی سے حل ہوتے ہیں۔

سیاستدانوں نے ملک تباہ کردیا

بھارتی سپریم کورٹ کے جسٹس کی کھری کھری باتیں

ہادی احمد

پاکستان سمیت تیسری دنیا کے اکثر ممالک کا شاید سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کو اہل اور دیانتدار قیادت میسر نہیں آسکی۔ جن ملکوں مثلاً چین، ملائیشیا، سنگاپور کو باصلاحیت اور قابل حکمران ملے، ان کا شمار آج ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ بھارت اور پاکستان بھی درج بالا تینوں ممالک کے ساتھ آزاد ہوئے تھے مگر مخصوص طبقے کو چھوڑ کر دونوں ملکوں کی بیشتر آبادی غربت اور جہالت کے پنجوں میں پھنسی ہوئی ہے۔

ستر سالہ جسٹس (ر) مرنڈے کاٹجو بھارتی سپریم کورٹ کے جج رہ چکے۔ سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر بے لاگ اور دوٹوک گفتگو کرنے کی وجہ سے پورے بھارت میں مشہور ہیں۔ پاکستان کے مخالف ہیں۔ چاہتے ہیں کہ یہ ملک دوبارہ بھارت میں ضم ہو جائے۔ تاہم اکثر معاملات میں بھارتی مسلمانوں کی حمایت کرتے نیز بھارتی حکمرانوں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

پچھلے دنوں جسٹس (ر) کاٹجو نے بھارتی ریاست کیرالہ کی ممتاز نیوز ایجنسی، منورما کو ایک مختصر انٹرویو دیا۔ اس میں انہوں نے بھارتی حکومت اور ملکی سیاست دانوں کے بخیے ادھیڑ ڈالے۔ کاٹجو صاحب نے شاید بجا طور پر بھارت میں پائی جانے والی خرابیوں کا ذمے دار حکمرانوں اور سیاست دانوں کو قرار دیا۔

پاکستان میں بھی سیاست دانوں نے قوم کے سامنے عجیب و غریب تماشا لگا رکھا ہے۔ اس تماشے نے یہ کرب ناک سچ اُجاگر کر دیا کہ کرپشن کے حمام میں سبھی سیاسی راہنما برہنہ ہیں۔

جسٹس (ر) کاٹجو نے بھارتی سیاست دانوں کو جن ''القابات'' سے نوازا، وہ خاصی حد تک پاکستا سیاسی راہنماؤں پر بھی موزوں بیٹھتے ہیں۔ سیاست کسی زما میں خدمت انسانیت سمجھی جاتی تھی مگر برصغیر کے سیا راہنماؤں نے اپنی نارواحرکتوں سے اُسے انتہائی حقارت پیشہ بنادیا ہے۔ لیجیے انٹرویو ملاحظہ فرمائیے۔

☆☆☆

سوال: بھارت میں سیاست دانوں کے کردار کو آپ کر نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: میرے بھائی، تمام سیاست داں غنڈ بدمعاش ہیں۔ انہوں نے ملک کو لوٹا اور عوام کو مذہبی، نسلی، ذات پات کے لحاظ سے تقسیم کر دیا۔ مقصد یہ ہے کہ انہیں ووٹ مل سکیں اور وہ اقتدار پا کر خوب مزے کریں۔ سمجھتا ہوں کہ انہیں گولی مار دینی چاہیے۔ پھانسی پر لٹکا چاہیے۔

جسٹس (ر) مرنڈے کاٹجو

سوال: بی جے پی کی موجودہ حکومت بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

جواب: بی جے پی بھارتی عوام کو ں لحاظ سے تقسیم کرنے کی ذمے دار ۔ دوسری جماعتیں ذات پات کی بنیاد گوں کو تقسیم کرتی ہیں۔ یہ تمام سیاسی تیں ایک جیسی ہیں جن میں غنڈے والی بھرے پڑے ہیں۔ یہ بہت بڑا ہے کہ ہمارا عظیم ملک غنڈوں کے ں میں چلا گیا۔ یہ ہمارے سیاست داں غنڈے ہیں۔ ان کی اصل جگہ پھانسی کا پھندا ہے۔ اب صرف انقلاب ہی بھارت کو بچا سکتا ہے۔ آپ ہے کہ مہنگائی روزانہ کی بنیاد پر بڑھ رہی ہے۔ دال کی قیمت روپے پہنچ چکی۔ بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سچ ہے کہ ملک تباہی کی جانب جا رہا ہے۔ دوسری صورت میں ں انقلاب آجائے گا۔

سوال: آپ کو امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی؟

جواب: میرے نزدیک انقلاب ہی اُمید کی کرن ہے۔ عمارت پرانی ہو جائے، تو تزئین و آرائش سے اُسے نیا بنانا ہے مگر بعض اوقات عمارت اتنی سال خوردہ ہو جاتی ہے سے ہر حال میں منہدم کرنا پڑتا ہے۔ بھارت کا یہی حال کا۔

تباہی کے بعد ہی تعمیر کی کوئی صورت نکلتی ہے لہٰذا ہمیں دہ کرپٹ نظام تباہ کرنا ہوگا۔ ہمارا آئین فرسودہ ہو چکا۔ سرکاری ادارے آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ نٹ بھی ناکارہ ہو چکی۔ سیاست دان وہاں صرف ایک ے پر چیخنے چلانے اور الزامات لگانے آتے ہیں۔ جب پارلیمنٹ میں اجلاس ہو، تو وہ جگہ شور شرابے کے باعث منڈی زیادہ لگتی ہے۔ سیاست دان ایک بھی ٹھوس کام انجام نہیں دیتے۔

جو پارٹی حزب اختلاف میں ہو، وہ حکمران جماعت کو کام نہیں کرنے دیتی۔ جب کانگریس اقتدار میں تھی، تو بی جے پی پارلیمنٹ میں اس کے خلاف صف آرا رہتی۔ اب بی جے پی کی حکومت ہے تو کانگریس آئے دن اس کے کاموں میں کیڑے نکالتی ہے اور نظام کو چلنے نہیں دیتی۔

اسی طرح عدلیہ کو لے لیجیے۔ ایک مقدمہ پچیس سال تک چلتا ہے پھر بھی کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ یہ ہماری عدلیہ ہے یا کوئی مذاق! میں عدلیہ میں رہا ہوں، اسی لیے جانتا ہوں کہ آدھے سے زیادہ جج کرپٹ ہو چکے۔ افسر شاہی کا بڑا حصہ بھی بے ایمان ہو چکا۔

غرض اس ملک میں سارا حکومتی نظام گل سڑ چکا۔ ہمارے سامنے محض خالی خولی ڈھانچہ کھڑا ہے۔ انقلاب اس ڈھانچے کو معمولی دھکے سے گرا دے گا۔

سوال: انقلاب سے آپ کی کیا مراد ہے؟ حقیقی انقلاب یا نظام میں کسی قسم کی تبدیلی؟

جواب: ارے بھائی حقیقی انقلاب جو سارے گلتے سڑتے نظام کا خاتمہ کر دے۔ اس ملک میں قانون و انصاف کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ ایسے حکمران اقتدار سنبھالیں جو عوام کے معیار زندگی میں اضافہ کر سکیں۔ آپ کسی بھی ملک میں

چلے جائیے، وہاں مروج نظام کی جانچ کا صرف ایک طریق کار ہے...... وہ یہ کہ کیا عوام کے معیار زندگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر لوگ خوشحال ہو رہے ہیں اور اپنے حکمرانوں سے مطمئن ہیں، تو حکومتی نظام معیاری ہے ورنہ نہیں۔

ملک میں سرمایہ دارانہ نظام ہے یا سوشل ازم اور کمیونزم، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہو رہا، تو حکومتی نظام کرپٹ اور دقیانوسی ہے۔ بھارت میں بھی ایسے حکومتی نظام کی ضرورت ہے جو عوام الناس کو غربت و جہالت سے نجات دلا سکے مگر ایسا نظام صرف انقلاب کے ذریعے ہی رائج ہوگا۔ آج ہمارا ملک جن سنگین مصائب اور مشکلات میں گرفتار ہے، ان کا حل مروجہ نظام سے نہیں نکل سکتا۔ انہیں حل کرنے کی خاطر نیا نظام لانا پڑے گا۔ موجودہ نظام میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہو سکتی۔

نریندر مودی نے اقتدار سنبھال کر ''وکاس'' (ترقی) کا نعرہ لگایا تھا مگر یہ دھوکا اور ڈھکوسلا ثابت ہوا۔ کہاں ہے وہ ترقی جس کے خواب دکھائے تھے؟ یہ محض سبز باغ تھے جو اڑن چھو ہو چکے۔

سوال: آپ کی نگاہ میں کرپشن ملک کے لیے زیادہ خطرناک ہے یا مذہبی فرقہ واریت؟

جواب: دونوں خطرناک ہیں۔ اس ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ سیاست دانوں نے ان میں اتحاد پیدا کرنے کے بجائے انہیں تقسیم کر دیا۔ بھارت میں صرف وہی حکومتی نظام چل سکتا ہے جو مذہبی، نسلی، لسانی وغیرہ اختلافات کی آگ کو ہوا نہ دے۔ اُسے بس یہ غرض ہونی چاہیے کہ فرد کو انصاف میسّر آئے اور مملکت میں قانون کی حکمرانی ہو۔ میں تو ان لوگوں کو غدار کہتا ہوں جو مذہبی و نسلی اختلافات ابھارتے ہیں۔ وہ ملک و قوم کے دشمن ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ مروجہ حکومتی نظام عوام کے مابین موجودہ

پروپیگنڈا

الیکشن کا زمانہ تھا۔ ایک امیدوار کے بارے میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ وہ نہایت بدتمیز، منہ پھٹ اور بددماغ ہے۔ ایک انتخابی جلسے میں وہی امیدوار تقریر کرنے کھڑا ہوا تو لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ''خواتین و حضرات! میرے مخالفین نے میرے بارے میں مشہور کر دیا ہے کہ میں منہ پھٹ اور گھٹیا آدمی ہوں۔ آپ یقین کریں کہ یہ سب مخالفانہ پروپیگنڈا ہے۔ اگر ان کی بات سچ ہوتی تو میں آپ جیسے ٹکے ٹکے کے لوگوں سے ووٹ مانگنے کیوں آتا؟''

تنازعات ابھارتا ہے لہٰذا جب تک یہ ختم نہیں ہوتا، بہتری کی کوئی اُمید نہیں۔ جب فرانس میں انقلاب آیا تھا، تو باغیوں نے حکمران طبقے کے ہزارہا مرد و زن کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ بھارت میں بھی فرانس سے ملتا جلتا انقلاب آنا چاہیے۔ دراصل کرپشن ہمارے سیاست دانوں کے خمیر میں شامل ہو چکی۔ ان کا جو ذہن بن سکا ہے، اُسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا لہٰذا بھارت کی بقا اسی صورت ممکن ہے کہ ایک انقلاب آئے اور تمام سیاست دانوں کو گولی مار دی جائے یا پھر وہ پھانسی پر لٹک جائیں۔

یہ سیاست داں ملک و قوم سے کسی قسم کی محبت نہیں کرتے۔ انہیں بس اپنے مفادات عزیز ہیں جو ہر قیمت پر پورے ہونے چاہئیں۔ اقتدار میں آنے کے لیے یہ لوگ نفرت پھیلاتے اور لوگوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی...... یہ ناقابل اصلاح ہیں۔

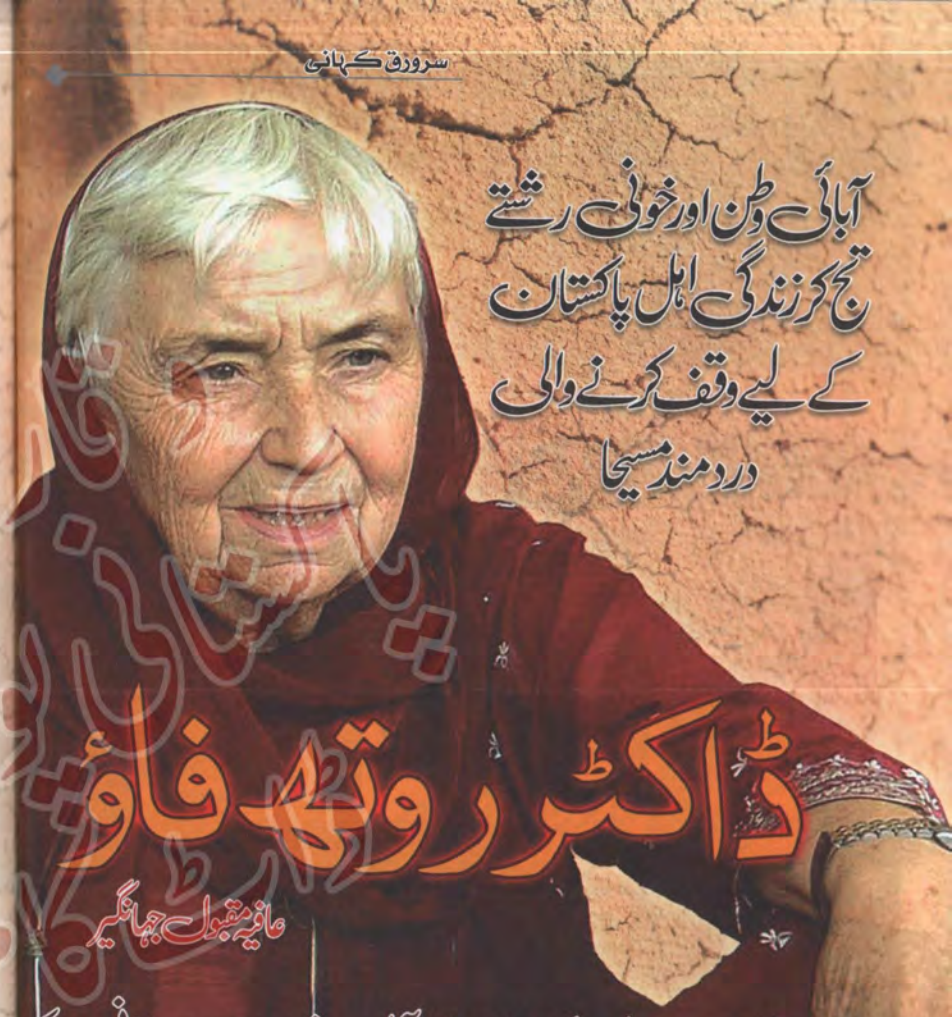

آبائی وطن اور خونی رشتے تج کر زندگی اہل پاکستان کے لیے وقف کرنے والی دردمند مسیحا

ڈاکٹر روتھ فاؤ

عافیہ مقبول جہانگیر

پاکستان میں جذام کے خلاف صف آرا ہونے اور بے سروسامانی کے عالم میں بھی انتھک کام کرتے ہوئے اس خوفناک مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے والی جرمن معالج کا ناقابلِ فراموش قصۂ حیات

ڈاکٹر روتھ فاؤ اپنی جرمن دوست ڈاکٹر کلاؤڈیا کے ہمراہ

’’مجھ سے شادی کرو گی؟‘‘ نوجوان نے بڑی آس اور محبت کی قندیلیں آنکھوں میں روشن کیے لڑکی سے پوچھا تھا۔ چمکتی چاندنی بھری رات میں وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ تھامے ماربرگ کے عالیشان لینڈ گریوز کاسل کی دیوار پر خاموشی سے بیٹھے نیچے اندھیری وادی کو تک رہے تھے۔ اُن دونوں کی محبت اور دوستی کے چرچے پورے ٹاؤن میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اکثر پہاڑوں پر واقع دلکش مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور گھوما کرتے۔ ایک دوسرے کے سنگ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے راستوں سے ڈیزی کے پھول چننا اور ڈھیر گفتگو کرنا۔ گونتھر روتھ سے شادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف روتھ کو بھی بے چینی سے اُس لمحے کا انتظار تھا جب گونتھر اُس سے شادی کی بات کرتا اور وہ بے تابی سے ’’ہاں‘‘ کرتی۔ آخر کار ایک دن وہ لمحہ آن پہنچا جب گونتھر نے اُسے شادی کی پیشکش کی، مگر روتھ حیران رہ گئی جب اُس نے خود کو ’ہاں‘ کی جگہ معذرت کرتے ہوئے پایا۔ وہ کہہ رہی تھی ’’مجھے افسوس ہے گونتھر، میں ہاں نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کسی اور مقصد کے لیے وقف ہے‘‘۔

گونتھر صدمے سے گنگ رہ گیا لیکن روتھ کے دل جیسے یک دم کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ کے اندر کئی مہینوں سے جاری کشمکش اور بے چینی کو قرار آ گیا

گویا اسے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا تھا جو ا جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے دوران اور جنگ ختم ہونے

بعد بھی اُس کے دماغ میں ہلچل مچائے رکھتا تھا ’’میں آخر زندہ کیوں بچ گئی؟‘‘ اس کی بے معنی زندگی کو گویا پر لگ گئے سارتر کے اس نظریے ’’ہر شے بے معنی ہے‘‘ کو درست سمجھ والی روتھ کو انجان صدائیں سنائی دینے لگی تھیں، اُس منزل جو اسے بلا رہی تھی۔ اُسے اب بھٹکنا نہیں تھا بلکہ اپنے ا

ڈاکٹر روتھ فاؤ اپنی مریضہ کو پیار کرتے ہوئے

سوال کی کھوج کرنی تھی کہ آخر اتنی ہولناک جنگ کا سامنا کرنے والی بدحالی اور بدامنی کی فضاؤں میں دبک کر سہمی سہمی وہ دس سالہ روتھ اتنی تباہ کاریوں کے باوجود زندہ کیوں بچ گئی تھی۔

ننھی روتھ فاؤ نے ۹ ستمبر ۱۹۲۹ء کو جب اس دنیا میں آنکھ کھولی تو بیسویں صدی کے بدترین معاشی ابتلا کی شروعات ہو چکی تھی۔ نیویارک کے اسٹاک ایکسچینج کریش نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جرمنی میں تمام صنعتی سرگرمیاں تھم سی گئی تھیں لیکن پریوں کا حسن رکھنے والی ننھی روتھ ان تمام معاملات سے بے خبر اپنے وسیع خاندانی باغات میں سیبوں کے درختوں پر چڑھتے، تازہ چیریوں کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے، ننھے پالتو خرگوشوں کے ساتھ کھیلنے اور اپنے لاڈلے طوطے کے ناز نخرے اُٹھانے میں مصروف اپنی بڑی بہنوں کے ساتھ نہایت پیار بھرے ماحول میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس کے والدین بھی جان چکے تھے کہ ان کی یہ گہرے گھنگھریالے بالوں اور چمکیلی نیلی آنکھوں والی بیٹی ایک خاص اور پُرعزم دماغ کی مالک ہے۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بنی نوع انسان کی تاریخ کی عظیم ترین جنگ، ہر رات فضائی حملے ہوتے اور ڈری سہمی روتھ خوف سے کانپتے ہوئے اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ تہ خانے میں پناہ لیا کرتی۔ ہر رات انہیں لگتا کہ یہ زندگی کی آخری رات ہے اور ہر صبح انہیں ایک دوسرے کو زندہ دیکھ کر تعجب ہوتا۔ جنگ کے کربناک سال ختم ہوئے تو کھانے پینے اور دوسری اشیاء کی شدید قلت ہوگئی۔ روزمرّہ کا راشن اور ادویہ اتنی ناپید ہوئیں کہ حالات نے روتھ سے ان کا نومولود بھائی بھی چھین لیا اور روتھ زندگی بھر اس صدمے کو نہ بھول پائیں۔ طب کے شعبے کا چُناؤ بھی انہوں نے اپنے کمسن بھائی کی موت، زخمی سپاہیوں اور بے گھر پناہ گزینوں کی مدد کے تجربے میں دلچسپی کی بنا پر کیا۔ ایک نوعمر لڑکی کے طور پر وہ لائپزگ میں جنگ کے دوران اور بعد میں، بوڑھے اور بیمار شہریوں کی دیکھ بھال کر چکی تھیں۔ ذہین ہونے کی وجہ سے انہیں مینز یونیورسٹی کے شعبۂ طب میں داخلہ بآسانی مل گیا۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ جذام کے ایک مریض کے ساتھ

مگر......! یہ سوال اب بھی باقی تھا کہ اتنی بے اعتبار زندگی، تباہی، ہلاکت خیز حالات کے باوجود وہ کیسے اور کیوں بچ گئیں۔ اس سوال کا جواب پانے کے لیے انہوں نے ادبی محافل میں شرکت شروع کر دی۔ دانشوروں سے بحث و مباحث میں حصہ لیا، مگر کوئی بھی راستہ انہیں مطمئن نہ کر سکا۔ آخر کار وہ کیتھولک آرڈر میں بطور نن شامل ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگیں۔ والدان کے اس فیصلے پر معترض ہوئے مگر والدہ نے ان کا ساتھ دیتے ہوئے کہا کہ اگر اس کی طلب یہی ہے تو اسے اِس پر عمل کرنا چاہیے۔ آخر کار روتھ پیرس میں ''ڈاٹرز آف دی ہارٹ آف میری'' کی کمیونٹی میں شامل ہوگئیں۔ اس تنظیم کی بنیاد میری ایڈیلیڈ نے رکھی تھی اور اس کا مشن دنیا میں کسی بھی جگہ انسانی مصائب کے خلاف کام کرنا تھا۔ تنہائی کی زندگی گزارنا یا روایتی ننوں والا لباس پہننا شرائط وضوابط میں شامل نہ تھا۔

میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہیں بھارت کی طرف سے پیشکش ہوئی کہ وہ وہاں جا کر دکھی انسانیت کی خدمت کریں۔ روتھ فاؤ ایشیا کے عوام کی غربت، کسمپرسی اور بے چارگی سے واقف تھیں، لہٰذا انہوں نے بھارت جانے کا ارادہ باندھا اور درخواست دے دی۔ اسی دوران ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو وہ اپنی والدہ کے ساتھ وقت گزارنے لگیں۔ انہیں بھارت کا ویزہ نہ مل سکا۔ طے یہ پایا کہ اب وہ بذریعہ پاکستان، بھارت جائیں گی کیونکہ اُن دنوں پاکستان سے بھارت جانا نسبتاً آسان تھا اور ویزہ نرم شرائط پر مل جایا کرتا تھا۔ بھارت جانے کے خواب دیکھتی روتھ فاؤ اسی اُمید پر کراچی آئیں اور یہاں فارماسسٹ برنیس وارگس کی مہمان بنیں۔ برنیس وارگس پہلے ہی اپنی تنظیم کے تحت یہاں

جب کسی انسان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے تو مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے

خدمتِ خلق میں جتی ہوئی تھیں۔

نوزائیدہ پاکستان اُن دنوں بہت سے مسائل سے نبرد آزما تھا۔ غربت، افلاس کے مارے پناہ گزین متعدد بیماریوں کا شکار تھے۔ انڈیا کا ویزہ لگنے کے دن گنتی روتھ فاؤ ایک دن برنیس کے ساتھ کراچی کی میکلوڈ روڈ پر واقع ایک بستی میں گئیں جہاں جذام کے مریضوں کی مرہم پٹی اور ان کے علاج کے لیے ایک عارضی ڈسپنسری قائم تھی جو پیکنگ کے ڈبوں سے بنی ہوئی تھی۔ یہی وہ تاریخی دن تھا جب پاکستان کو ان کی مدر ٹریسا ملی اور جذام کے مریضوں نے اپنی ماں کو پایا۔ ہندوستان جانے کی منصوبہ بندی کرتی، مدر ٹریسا کے ساتھ کام کرنے کی خواہش رکھنے والی روتھ فاؤ نے جو قدم بستی کی طرف بڑھائے تو پھر یہ باہمت قدم بڑھتے ہی چلے گئے اور ۵۹ سال بغیر تھکے، رُکے یا دَم لیے، ان قدموں نے پاکستان کے ہر صوبے، شہر کو تسخیر کیا اور پاکستان کے غریب و نادار، مفلس و بے حال مریضوں کو اپنی ماں تا کی چادر میں سموتی چلی گئیں۔

ڈسپنسری کی شروعات

ڈاکٹر روتھ فاؤ کو اس بستی سے متعارف کروانے والی میکسیکو کی نوجوان فارماسسٹ برنیس نے اس وقت کے آرچ بشپ آف کراچی، موں سینیور فان ملٹن برگ کی درخواست پر ۱۶/اگست ۱۹۵۵ء کو پہلی بار اس بستی کا دورہ کیا تھا۔ جس وقت برنیس نے اس بستی میں قدم رکھا تو سڑاند و تعفن سے برنیس کا سر چکرا گیا۔ اس ٹوٹی پھوٹی بستی میں بے یارومددگار، جانوروں سے بدتر کیڑوں کی مانند رینگتے جذام کے مریض کسی ایسے مسیحا کے انتظار میں تھے جو انہیں اس جہنم نما زندگی سے چھٹکارا دلا سکے۔ ''کوڑھ'' ایک ایسی بیماری تھی جس کا کوئی باقاعدہ علاج تب دریافت نہ ہوا تھا۔ یہ بیماری مریض کو ہلاک نہیں کرتی تھی مگر اسے موت سے بھی بدتر زندگی جینے پر مجبور کر دیتی۔ یہ ایسا بھیانک مرض تھا جس میں مریض ہاتھوں پیروں کے بدہیئت ہو جانے اور ٹوٹ پھوٹ جانے کے باعث بھیانک ترین شکل اختیار کر لیتے تھے۔ چھوت کی بیماری ہونے کے باعث انہیں شہر کے باہر پھینکوا دیا جاتا جہاں کوئی ان کا پرسانِ حال نہ ہوتا۔ ان کے پاس دو ہی راستے ہوتے، یا تو سسک سسک تڑپ تڑپ کر موت کا انتظار کریں، اپنے جسم کو گلتا سڑتا اور جانوروں کی خوراک بنتا دیکھیں، یا خودکشی کر لیں۔

لوگ انہیں رہائشی علاقوں سے دور غاروں یا جنگلوں میں چھپا دیتے اور دور سے ہی ان کو کھانا وغیرہ پھینک دیا جاتا۔ یہ مریض جانوروں کی طرح مٹی سے لتھڑے اس کھانے کو کھانے پر مجبور تھے۔ ان کے بدہیئت جسموں سے اُٹھتی ناقابلِ برداشت سڑاند، زخموں پر رینگتے کیڑے، ٹوٹتے لٹکتے گوشت کو چوہوں کی خوراک بنتے دیکھنا عام انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ برنیس بھی ایسی ہی کیفیت کا شکار رہیں اور انہوں نے اس بستی میں جانے سے انکار کرتے ہوئے کہا ''یہ میرے بس کی بات نہیں''، لیکن پھر مریضوں کے دیے ہوئے واسطوں اور آہ وگریہ نے برنیس کو اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا اور انہوں نے اُن کی مدد کرنے کا تہیہ کر لیا۔

اس مقصد کے لیے سب سے پہلی امداد بھیجنے والے برنیس کے والدین ہی تھے جنہوں نے دوائیاں اور پٹیاں بھیج کر اس عظیم کارخیر میں پہلا حصہ ڈالا۔ اس کے بعد دوستوں، گداگروں اور خود جذام کے مریضوں سے تین سو کی رقم اکٹھی کی گئی۔ یونیسف، ریڈ کراس اور کچھ سفارت خانوں کی مدد سے جنم لینے والی یہ پہلی باقاعدہ ڈسپنسری لکڑی کے کھوکھوں، کارڈبورڈ اور خالی ٹن کے ڈبوں کی دیواروں پر مشتمل تھی۔ برنیس وارگاس، مدر فیبر اور سسٹر براؤن پیدل یا کراچی کی کھٹارا بسوں پر سوار ہو کر جذام کے مریضوں کے پاس پہنچتیں

ڈاکٹر روتھ فاؤ آزاد کشمیر میں

جو ڈسپنسری کے باہر بے تابی سے انتظار کر رہے ہوتے۔ اس ڈسپنسری کا نام ان کے کیتھولک آرڈر کی فرانسیسی بانی میری ایڈیلیڈ کے نام پر رکھا گیا۔

۱۹۵۸ء میں جلدی امراض کی ایک پاکستانی نوجوان ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی نے بھی اس ڈسپنسری میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس دوران مدر میری ڈائل اور ہیلن لیوٹ نے مدر فیبر اور سسٹر براؤن کی جگہ لے لی تھی۔ جس وقت روتھ فاؤ کراچی ایئر پورٹ سے گرومندر والے ہاسٹل جا رہی تھیں تب وہ پہلی بار مدر ڈائل، ہیلن اور برنیس سے ملیں۔ برنیس نے انہیں جذامیوں کی بستی میں چلنے کی دعوت دی اور ڈاکٹر روتھ فاؤ نے اس مصیبت زدہ بستی میں قدم رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

پاکستان میں بسنے کا تقدیر ساز لمحہ

ڈاکٹر روتھ فاؤ نے اپنی طبی زندگی میں کبھی کوئی جذام کا مریض نہیں دیکھا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ کسی بیکٹیریا کا پیدا کردہ انفیکشن، اتنے ہیبت ناک اثرات بھی رکھتا ہوگا۔ وہ تو صرف جنگِ عظیم دوم میں زخمی سپاہیوں کے جسموں سے بہتے خون اور مسخ شدہ لاشوں سے ہی واقف تھیں لیکن پاکستان کے سب سے بڑے شہر اور دارالحکومت کراچی کے مرکز کے عقب میں واقع جذامیوں کی اس بستی میں انہیں ناقابلِ یقین مناظر دیکھنے کو ملے۔

مرد و عورتوں کی مسخ شدہ شکلیں، گلے ہوئے ہاتھ پاؤں، پیپ اور سڑاند سے بھرے زخم اور ان پر بھنبھناتی مکھیاں، جسموں پر چلتے کیڑے اور سڑے ہوئے گوشت کو بھنبھوڑتے چوہے۔ تیس سالہ ڈاکٹر روتھ فاؤ اپنی زندگی کے مقصد تک پہنچ چکی تھی۔ کانونٹ کی وہ شاگردہ، جس نے ناداری، پاکیزگی اور اطاعت کی قسم کھائی تھی اور اپنی زندگی انسانی مصائب کے خلاف جدوجہد کے لیے وقف کرنے کا عہد کیا تھا، اپنی اس منزل تک آ چکی تھی جس کی بازگشت جرمنی میں دورانِ تعلیم، گوئٹھر کے ساتھ محبت کے عہد و پیماں باندھتے اور جنگِ عظیم دوم کے دوران اور بعد میں بارہا اُس کے کانوں میں گونجی تھی کہ وہ کیوں زندہ ہے اور اس کی زندگی کا کیا مقصد ہے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خود کو گوئٹھر سے ہاں کی بجائے معذرت کرتے پایا تھا۔ تقدیر نے ان سے وہ تاریخ ساز فیصلہ لمحوں میں کروا لیا جس کو پھر انہوں نے اپنی آخری سانس تک کچھ اس طرح نبھایا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔

یہ پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ ایک ایسی نوجوان ڈاکٹر جو ہندوستان میں مدر ٹریسا کے ساتھ کام کرنے کا سوچ کر پاکستان آئی تھی، اسے قسمت نے پاکستان کے غریب و لاچار مریضوں کی مسیحا اور ماں کے روپ میں بھیج دیا اور وہ دن رات کا فرق مٹا کر پورے دل و جان سے پاکستان کو اس موذی مرض سے پاک کرنے میں ایسی جُتی کہ پھر اپنا ملک اور سگے رشتوں کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا۔

ایک نئے سفر کا آغاز اور مصائب و آلام

پاکستان میں ان کی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ برنیس نے ڈسپنسری قائم کرنے کے لیے بلاشبہ سخت محنت

مجھے خُدا اگر ایک اور زندگی دے تو وہ بھی میں خدمت میں صرف کروں گی

کی مگر وہ ڈاکٹر نہیں تھیں۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ نے جذام کے موضوع پر لکھی جانے والی ہر مستند کتاب کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے امریکی معالجِ جذام ڈاکٹر پال برانڈ کو خط لکھا جو بھارت کے شہر ویلور میں ایک کرسچین میڈیکل کالج کے پرنسپل تھے۔ ڈاکٹر برانڈ نے انہیں ویلور آ کر تربیتی کورس کرنے کی دعوت دی۔ وہاں ڈاکٹر روتھ نے جذام کی تشخیص اور علاج کے بارے میں نئی معلومات اور مہارت حاصل کی۔ چھ مہینے کی سخت تربیت مکمل

ڈاکٹر روتھ فاؤ کچی بستی میں سستانے کی غرض سے بیٹھی ہیں

کرنے کے بعد وہ واپس پاکستان چلی آئیں اور ایک نئے ولولے اور جوش کے ساتھ دوبارہ سے تنظیم مرتب کی۔ وہ گھنٹوں جھونپڑی نما میری ایڈیلیڈ لیپروسی سینٹر میں گندے فرش پر گھٹنوں کے بل جھکی مریضوں کے آپریشن کیا کرتیں۔ نازونعم میں پلی روتھ فاؤ، جرمنی کی جدید یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ڈاکٹر، پاکستان کے گلے سڑے ناقابلِ برداشت اور معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے مریضوں کو گلے لگاتی، ان کے بدبودار جسموں پر رینگتے کیڑے ہاتھوں سے اتارتی، ان کے علاج کے لیے جگہ جگہ بھاگ دوڑ کرتی۔ اکتیس بتیس سالہ روتھ فاؤ انسانیت کے درجے کی اعلیٰ ترین چوٹی پر جا پہنچی تھی۔

جذام کے مریضوں کو قابلِ نفرت سمجھا جاتا تھا۔ کوئی اسپتال یا ڈاکٹر انہیں جگہ دینے یا ان کا علاج کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر روتھ کی بے بسی انتہا پر ہوتی مگر وہ پھر بھی ہمت نہ ہارتیں اور انہوں نے میونسپل اسپتال کے مردہ خانے میں ہی مریضوں کا آپریشن کرنا شروع کر دیا۔ اتنے خراب حالات اور عدم تعاون کی بدولت یہ بھی غنیمت تھا۔ بارشوں کے موسم میں حالات اور بھی قابلِ رحم ہو جاتے۔ چھتوں سے پانی برستا اور پوری بستی میں کمر تک پانی کھڑا ہو جاتا۔ اس پانی میں شہر بھر کی غلاظت اور گٹروں کا پانی بھی شامل ہو جاتا مگر وہ ڈسپنسری کی میز پر کھڑے ہو کر یا گھٹنوں تک پانی میں ڈوبی ہونے کے باوجود علاج کرنے میں مصروف رہتیں۔ مریض بھی اپنے پیپ والے زخموں کے ساتھ اسی پانی میں سے گزرتے لیکن ڈاکٹر روتھ کبھی اس خوف میں مبتلا نہیں ہوئیں کہ کہیں یہ

مریضوں کے چہروں پر خوشی ہی میرا سب سے بڑا انعام ہے

چھوت کی بیماری انہیں نہ لگ جائے۔

۸ ضرب ۸ کی اس ڈسپنسری میں مریضوں کی تعداد ۱۹۶۲ء میں قریباً ۹۰۰ تک جا پہنچی تھی۔ تب ڈاکٹر روتھ نے ایک نئی جگہ حاصل کرنے کی تگ ودو شروع کر دی۔ اردو زبان سے کچھ کچھ واقفیت بھی ہو چلی تھی لہٰذا اب وہ اپنے مریضوں سے تبادلۂ خیال بہتر طور پر کر سکتی تھیں۔ ۱۹۶۳ء میں معجزاتی طور پر انہیں کراچی کے مرکز میں ایک جدید عمارت مل گئی۔ اس عمارت کی قیمت جرمنی نے ادا کی۔ مریضوں کو منتقل کرنے کا مرحلہ بہت دشوار گزار تھا کیونکہ عین رہائشی علاقے میں جذام کے مریضوں کا آنا جانا اور رہنا وہاں کے لوگوں کو ہرگز منظور نہ تھا۔ چناں چہ مریضوں کی منتقلی کا کام آدھی رات کو کیا گیا۔

حسبِ توقع لوگوں نے اسپتال کی عمارت پر پتھراؤ کیا اور کھڑکیوں پر پتھر، گندے انڈے، سڑے ہوئے ٹماٹر وغیرہ پھینکے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مخالفین نے مقدمے بھی دائر کر دیے۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ دلجمعی اور خندہ پیشانی سے ہر برے سلوک کو برداشت کرتی رہیں اور ان نامساعد حالات کو بھی اپنی لگن اور جذبے کے آڑے نہ آنے دیا۔ کوئی لالچ کوئی دھمکی انہیں اپنے مقصد سے ایک انچ نہ ہٹا سکی بلکہ ان کا جذبۂ خدمت روز بہ روز زور پکڑتا گیا اور وہ اپنی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو پُرخلوص ساتھیوں کے تعاون سے پار کرتی چلی گئیں۔

۱۹۶۵ء میں انہوں نے ڈاکٹر زرینہ فضل بھائی کے ساتھ مل کر پیرامیڈیکل ورکرز کے لیے تربیتی پروگرام شروع کیا اور نیشنل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ آف لیپروسی پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔ جذام کا مرض پاکستان کے بہت سے علاقوں میں موجود تھا اور مریضوں کی تعداد میں اضافے جبکہ طبی سہولیات کے فقدان کی وجہ سے حکومت نے اس انسٹیٹیوٹ کو تسلیم کر لیا اور اسی سال پہلے تربیتی گروپ نے ادارے سے نکل کر پاکستان کے دیہی علاقوں میں کام کا آغاز کیا۔

پاکستان کے شمالی علاقہ جات کا دورہ

ٹریننگ سینٹر کے قیام کے بعد جب مریضوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جانے لگا تب یہ بات خاص طور پر سامنے آئی کہ زیادہ تر مریض ایک ہی طرح کے علاقوں سے آتے ہیں۔ ان میں بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ، آزاد کشمیر اور شمالی

اگر دِل میں پختہ یقین ہو تو پھر کوئی مشکل آڑے نہیں آتی

علاقہ جات شامل تھے۔ ۱۹۶۵ء میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر روتھ فاؤ شمالی علاقوں کے دورے پر نکلیں۔ وہاں جا کر ان پر یہ حقیقت کھلی کہ جو مریض ان علاقوں سے بغرض علاج ان کے پاس آیا کرتے تھے، ان مردوں کی خواتین اور بچے بھی اسے مرض میں مبتلا ہیں مگر غربت و افلاس اور حالات کے مارے یہ لوگ گھروں سے نکل کر اپنا علاج کروانے نہیں آسکتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ خود ان تک پہنچا جائے۔

اسی ضرورت کے پیشِ نظر تربیتی پروگرام میں تیزی لائی گئی اور ڈاکٹر روتھ کی انتھک کوشش اور محنت کے نتیجے میں ۱۹۷۲ء میں پاکستان کے تقریباً سبھی علاقوں میں جذام کے علاج کے لیے مراکز قائم ہو چکے تھے۔

اپنے دورۂ دیر میں ڈاکٹر روتھ پیدل کئی کئی دن کا سفر کر کے مریض کے گھر جاتیں اور علاج کرتیں۔ وہاں کا حال یہ تھا کہ ایک ہی کمرے میں مویشی بھی ہوتے، ایک طرف مریض ہوتا اور اسی کمرے میں وہ بھی ہوتیں۔ بعض اوقات وہ اپنی ٹیم کے ساتھ مسجد میں بھی قیام کرتیں۔ جذام کے مریضوں کی تلاش میں انہوں نے پاکستان کا چپہ چپہ چھان مارا۔

۱۹۷۱ء میں انہیں پتا چلا کہ مکران کے صحرائی علاقے میں بھی جذام کا مرض پایا جاتا ہے۔ انہوں نے فوراً صحرا کے لیے رختِ سفر باندھا اور ٹیم کے ہمراہ نکل کھڑی ہوئیں۔ ان کے اور ان کی ٹیم کے لیے صحرا کا یہ پہلا سفر تھا۔ کوئی بھی راستوں سے واقف نہ تھا۔ جیوانی جاتے ہوئے سخت صحرائی طوفان نے انہیں گھیر لیا اور وہ بھٹک گئے۔ دور دور تک منزل کا نام ونشان تک نہ تھا۔ بالآخر ایک ٹرک نظر آیا اور اس کے ڈرائیور نے راہنمائی کی۔ یوں وہ جیوانی پہنچیں۔ وہاں انہیں جذام کے ۵۶ مریض ملے جن کا علاج شروع ہوا اور وہاں کے مقامی افراد کو بھی تربیت دی گئی۔

ایک ایسی خاتون جو پاکستان کے پس ماندہ علاقوں کے دورے پر ہو، راستوں سے، ان کی زبان سے ناواقف ہو، سہولیات کا فقدان ہو، زمانے کے سرد گرم سے انجان ہو، وہ یوں بے خوف وخطر انجانی منزلوں کی طرف بغیر رکے بڑھتی چلی گئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوتی چلی گئی تو یقیناً وہ غیب سے فیض پا رہی تھی۔

جیوانی میں جذام کے مریضوں کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ انہیں صحرا میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا اور وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے تھے۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ نے انہیں نئی زندگی سے روشناس کروایا اور انہیں معاشرے میں پھر سے رہنے کے قابل بنایا۔ کوئی رکاوٹ کوئی پریشانی ڈاکٹر روتھ کے حوصلے پست نہ کر سکی پھر چاہے وہ گلگت کی تنگ و پُرپیچ پگڈنڈیاں ہوں یا پری شینگ وادی کی خوفناک راتوں میں پہاڑی پر چڑھنے کا سفر ہو۔ خانگرول کا سفر چھ گھنٹے مسلسل تاریکی میں چل کر ہو یا پھر موسلا دھار بارش میں تین میل چل کر مشکن میں جذام کا مریض ڈھونڈنا ہو، ان کے لیے کوئی راہ کٹھن ہو کر بھی نہ تھی۔

وزارتِ صحت کی وفاقی مشیر کا عہدہ

۱۹۷۹ء میں صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق نے انہیں وزارتِ صحت کا وفاقی مشیر برائے لیپروسی مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے لیپروسی کا رکنان کے سر کامیابی کا سہرا باندھتے ہوئے ان کی ترقی کے لیے مزید اقدامات کیے اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اسی سال افغانستان پر سوویت یونین کے حملے کے بعد پناہ گزینوں کی بڑی تعداد نے پاکستان کا رُخ کیا۔ ان میں بہت سے لوگ جذام کے مریض تھے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ افغانستان میں جذام بُری طرح پھیلا ہوا تھا لہٰذا صدر پاکستان ضیاء الحق کی اجازت سے انہوں نے سرحد پار کی اور وسطی افغانستان میں داخل ہو

گئیں۔ وہاں انہوں نے جنرل ہیلتھ سروس قائم کی اور بہت سے مردوخواتین کو اس موذی مرض سے چھٹکارا دلوا کر معاشرے میں نیا مقام دلوایا۔ افغانستان میں انہوں نے دس سال تک خدمات سرانجام دیں۔

ٹی بی اور اندھے پن کے علاج کا اجراء

۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر روتھ فاؤ نے جب دیکھا کہ اب جذام کے مریض نئے طریقہ علاج ایم ڈی ٹی (MDT) کے ذریعے زیادہ تیزی سے صحتیاب ہو رہے ہیں تو انہوں نے اپنے دائرہ کار کو مزید وسعت دیتے ہوئے اپنی خدمت کو ایک نیا موڑ دیا اور ٹی بی اور آنکھوں کی بیماریوں و اندھے پن کو روکنے کے لیے پروگرام کا اجراء کیا۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ اور مشہور ماہر امراضِ چشم پروفیسر ڈاکٹر محمد داؤد خاں کی مشترکہ کوششوں سے ملک میں جذام اور امراضِ چشم کا پروگرام متعارف کروایا گیا اور جذام سے صحت یاب ہو کر تربیتی کورس کرنے والے کارکنان کو آنکھوں کی بیماریوں سے متعلق بھی تربیت دی جانے لگی۔

ڈاکٹر فاؤ نے پاکستان کے دور دراز علاقوں میں آئی سرجیکل کیمپوں کے انعقاد کے لیے مالی اخراجات کا انتظام کیا اور تکنیکی معاونت پروفیسر محمد داؤد خان اور پروفیسر شاد محمد نے فراہم کی۔ اس کیمپ میں وہ غریب عوام جو علاج کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتے، مستفید ہوتے اور یہاں ڈیڑھ سے دو سو تک مفت آپریشن کیے جاتے۔ اب تک ہزاروں آپریشن کیے جا چکے ہیں جو یقیناً مستحق افراد کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

پاکستان جذام پر قابو پانے والا پہلا ملک

ڈاکٹر روتھ فاؤ کی انتھک اور بے مثال کوششوں کی بدولت ۱۹۹۶ء میں پاکستان میں جذام کے مرض پر قابو پا لیا گیا۔ عالمی ادارہ صحت WHO نے پاکستان میں اس مرض کو کنٹرول کرنے کے لیے ۲۰۰۰ء تک کا ہدف دیا تھا لیکن ڈاکٹر روتھ فاؤ کی دن رات کی لگن و جذبے کے ساتھ ساتھ بے انتہا محبت نے مطلوبہ ہدف کو مقررہ مدت سے بھی چار سال پہلے حاصل کر لیا۔ پاکستان خطے کا پہلا ملک تھا جس نے یہ ہدف حاصل کیا اور یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ نے پورے ملک میں تقریباً ۱۵۷ مراکز قائم کیے جن میں ۵۰ ہزار سے زائد جذام کے مریضوں کا اندراج ہوا۔

اس عظیم و شاندار کامیابی کے بعد بھی ڈاکٹر روتھ مطمئن نہ تھیں۔ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں ٹی بی پر قابو پانے اور سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں نابینا پن کو روکنے کے پروگراموں کی ابتدا کرنے کے بعد بھی انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔

۲۰۰۵ء کا زلزلہ اور ڈاکٹر روتھ کی خدمات

۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو جب قیامت خیز زلزلے نے اسلام آباد، آزاد کشمیر اور دوسرے علاقوں میں تباہی مچائی تو ڈاکٹر روتھ اپنی ٹیم کے ہمراہ فوراً متاثرہ علاقوں کی طرف روانہ ہو گئیں اور تباہ حال لوگوں کو فوری امداد مہیا کی۔ ان کے لیے خوراک، ادویات، بستر اور خیموں وغیرہ کا انتظام کیا اور پھر دوسرے مرحلے میں ان کی بحالی اور آبادکاری کے امور انجام دیے۔ زلزلے کی وجہ سے ان علاقوں میں قائم کردہ جذام، ٹی بی اور آنکھوں کی بیماریوں کے لیے قائم کردہ مراکز بھی تباہ ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر روتھ وہاں رہائش کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی ہی میں آرام کرتیں۔ جو ملتا وہ کھا لیتیں اور بعض اوقات تو اپنے حصے کا کھانا بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتیں۔ خود بھوکی رہ کر امدادی کاموں میں مصروف رہتیں۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ کے آخری ایام اور مریضوں کے تاثرات

ڈاکٹر روتھ فاؤ نے ۸۶ سال کی عمر پائی۔ اپنے آخری دنوں میں بھی علالت کے باوجود ان کا سارا دھیان اپنے مریضوں اور اپنے سینٹر MALC میں ہی رہتا تھا۔ وہ وہیل چیئر پر بھی سینٹر آتیں اور اپنے مریضوں کے ساتھ وقت گزارا کرتی تھیں۔ اُن کے مریض انہیں اپنی ماں کہتے تھے۔ سینٹر میں علاج کروانے کی غرض سے آنے والے تمام مریضوں کے

جب سب ختم ہو جائے گا تو دنیا میں صرف ایک محبت رہ جائے گی۔ خدا کی اپنے بندوں سے

لیے وہ سینٹر ایک گھر کی حیثیت رکھتا تھا اور اس گھر کو چلانے والی، ان کا خیال رکھنے والی، اپنی آغوش میں سلانے والی ان کی ماں ڈاکٹر روتھ فاؤ کے بغیر ان کے مریض اپنے آپ کو یتیم کہنے اور خود کو بے سہارا سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ سینٹر میں موجود ہر ڈاکٹر اور کارکن، ان کی ٹیم کا ہر ممبر ڈاکٹر روتھ فاؤ کے زیر سایہ رہنے کے باعث انہی کے جیسے دردمند دل اور خیالات کا مالک ہے۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ نے نہ صرف اپنی ٹیم کو باقاعدہ ٹریننگ دی بلکہ ان کو اپنا ہی پرتو بنا دیا۔ آپ MALC سینٹر جائیں اور وہاں کے کسی بھی ممبر سے مل لیں۔ آپ کو یہی لگے گا کہ آپ ڈاکٹر روتھ فاؤ کے عکس سے مل رہے ہیں۔ وہ ایک ایسی شمع تھیں جس نے اپنی روشنی سے ڈھیروں چراغ جلائے اور پاکستان کے چپے چپے میں اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ دیے۔

MALC کی خدمات کا ایک مختصر جائزہ

میری ایڈیلیڈ لیپروسی سینٹر (MALC) جذام، ٹی بی اور آنکھوں کی بیماریوں کے خلاف جدوجہد کرنے والا واحد ادارہ ہے جہاں علاج کے ساتھ ساتھ ٹریننگ بھی دی جاتی ہے۔ اس ادارے کی کوششوں کی بدولت جذام کا مرض خاتمے کے قریب ہے۔ یہاں ٹی بی، آنکھوں کی بیماریوں کے خلاف بھی کام ہو رہا ہے۔ MALC کی منصوبہ بندیوں میں HIV ایڈز پر کنٹرول، خاندان کی صحت، نشے کے عادی افراد کا علاج، ماں اور بچے کی صحت اور ہیپاٹائٹس جیسے امراض کی روک تھام شامل ہیں۔ ان تمام خدمات کے علاوہ MALC نے اپنی کوششوں کو نیا رنگ دیتے ہوئے ان خاندانوں، کسانوں، مزدوروں کے مصائب و آلام دور کرنے کی جدوجہد بھی شروع کی جو ظالم جاگیرداروں کی قید سے بھاگ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو محنت سے جی چراتے اور بھیک مانگنے کو آسان کام سمجھتے ہیں، انہیں روزگار، تعلیم اور صحت کی ضروریات کو پورا کرنے جیسے پروگرام بھی اس ادارے کی خدمات میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ کے روز و شب کی ایک جھلک ارکان کی نظر میں

۱۵ / اگست کی صبح میں لاہور سے کراچی پہنچی اور ائیر پورٹ سے سیدھی میری ایڈیلیڈ لیپروسی سینٹر کا سفر بہت بے صبری سے طے کیا۔ نفسیاتی طور پر میں ہوائی سفر کرنے سے ہمیشہ ہی خوفزدہ رہی ہوں اور کچھ عرصہ قبل میں بچوں کے ساتھ دبئی ٹور صرف اسی وجہ سے منسوخ کر چکی تھی کہ مجھے ہوائی سفر کا فوبیا تھا اور جب میں بھارت کی سیاحت پر گئی تب بھی میں نے بذریعہ بس ہی سفر کو ترجیح دی تھی۔ خود کو ذہنی طور پر تیار کرتی میں سوچ رہی تھی کہ ایک تو اکیلی دوسرے پہلی بار کراچی جیسے انجان شہر کا ''ہوائی'' سفر، حیرت انگیز طور پر میرے اندر اس خیال نے طاقت سے بھر دی جو بار بار دماغ میں کوند رہا تھا کہ وہ عورت جو انجان دیس میں، انجان لوگوں کے بیچ، اُن کی زبان سے ناواقف مسلسل کٹھنائیوں سے پُر، سفر در سفر رہی، کیا وہ کبھی کسی مقام پر خوفزدہ ہوئی؟ کیا کسی مجبوری نے اُس کے قدم روکے؟ اور اسی خیال کی طاقت نے مجھے اُس عظیم عورت کی عظمت کو سلام کرنے اُس کے ''گھر'' جانے پر مجبور کر دیا۔ اب میں اُس ماں کے گھر کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھی جس نے اپنی تمام زندگی وہاں وقف کر دی اور جسے وہ اپنا گھر کہتی تھیں۔

سینٹر کے باہر کھڑے گارڈ نے جھک کر نہایت خوش اخلاقی سے مجھے سلام کیا اور اندر جانے کے لیے راستہ دیا۔ یہ گارڈ بھی اُن کا مریض رہ چکا تھا اور اب مکمل صحت یاب ہونے کے بعد اسی سینٹر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے وہاں اپنی خدمات پیش کر رہا تھا۔ سینٹر کے اندر MALC کے میڈیا منیجر

ڈاکٹر روتھ فاؤ اور ڈاکٹر بوٹا سنگھ مریض کے ساتھ

جناب نثار ملک اور منیجر ریسورس موبلائزیشن سلویٰ زینب میرے منتظر تھے اور میں ڈاکٹر روتھ فاؤ کے بارے میں مزید سے مزید تر جاننے کو بے تاب تھی۔ نثار صاحب نے گفتگو شروع کرتے ہوئے بتایا کہ اس سینٹر میں نہ صرف مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے بلکہ مریضوں کو دواؤں کے ساتھ ساتھ خوراک بھی فراہم کی جاتی ہے، ان کے آپریشن مفت کیے جاتے ہیں نیز یہ ادارہ ان مریضوں کی سماجی اور معاشرتی بحالی کے لیے انہیں امداد بھی مہیا کرتا ہے جس میں ان کے بچوں کے تعلیمی اخراجات، تربیتی پروگرام، کاروبار چلانے اور گھر بنانے کے لیے رقم کی فراہمی شامل ہیں۔ وہ مریض جنہیں صحتیاب ہوجانے کے بعد بھی معاشرہ قبول نہیں کرتا ان کے لیے منگھوپیر میں بلدیہ اسپتال کے ساتھ اتحاد منزل کے نام سے ایک گھر بھی قائم کیا گیا ہے جہاں انہیں رہائش، تعلیم، ہنر اور روزگار کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

کیا ڈاکٹر روتھ فاؤ کو کبھی یہ خوف لاحق نہیں ہوا کہ جذام جیسوت کی بیماری ہے اور کبھی بھی انہیں یا کسی ممبر کو لگ سکتی ہے؟ کیا وہ اس بارے میں کوئی احتیاطی تدابیر اختیار کرتی تھیں؟ اس سوال کے جواب میں سلویٰ زینب نے بتایا کہ ڈاکٹر روتھ فاؤ نے کبھی ڈاکٹرز کے مخصوص پروٹوکول کو اہمیت نہیں دی۔ وہ مریضوں کو دستانوں کے بغیر چھوتی کھلاتی پلاتی اور چیک کیا کرتی تھیں۔ یہ اُن پر اللہ کا خاص کرم تھا کہ آج تک کبھی ایک بھی ایسا کارکن نہیں جسے یہ بیماری لگی ہو۔ یہاں کے ماحول میں نا جانے ایسی کیا خاص بات ہے کہ سینٹر کے اندر آنے والا ہر انسان جیسے اللہ کی حفاظت میں آجاتا ہے اور اسے یہ بیماری لگنے کا کوئی خوف نہیں رہتا۔ یہاں جتنے بھی کارکن، ڈاکٹرز یا ممبرز ہیں وہ سب بے خوف و خطر مریضوں کے ساتھ گھلے ملے ہوئے ہیں اور یہاں کسی قسم کا طبقاتی فرق ڈاکٹر روتھ نے کبھی نہیں رکھا۔ چاہے صفائی کرنے والا عملہ ہو یا ڈاکٹر، کھانا پکانے والی ٹیم ہو یا گارڈز، سب ایک ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ڈاکٹر روتھ کی سختی سے ہدایت ہوتی تھی کہ کبھی اونچ یا نیچ طبقے کا فرق نہ رکھا جائے اور نہ ہی ذات پات یا مذہب کو وہ اہمیت دیتی تھیں۔ ان کا ایک ہی مذہب تھا اور وہ تھا انسانیت۔

MALC کے سی۔ ای۔ او مسٹر ماروین لوبو نے جو گزشتہ ۲۷ سال سے ڈاکٹر روتھ کے ساتھ ہیں، ڈاکٹر روتھ کی ذاتی زندگی اور شب و روز کے معمولات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ وہ روزانہ سینٹر سے صبح ۶ بجے پیدل

اندھیرے کو کوسنے کی بجائے ایک شمع جلانا زیادہ بہتر ہے

چرچ جایا کرتی تھیں جو تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ وہ کبھی سینٹر کی گاڑی استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ گاڑی میں موجود پیٹرول فنڈز کی بدولت ہے اور یہ فنڈز اور گاڑیاں مریضوں کے لیے ہیں، انہی کی امانت ہیں جبکہ چرچ جانا اور عبادت کرنا میری ذاتی زندگی کے معمولات میں سے ہے لہٰذا میں گاڑی کی بجائے پیدل جانا پسند کرتی ہوں۔ مسٹر لوبو نے بتایا کہ وہ جب بھی جرمنی جاتی تھیں اکثر میں اُن کے

ڈاکٹر روتھ فاؤ اور MALC کے سی ای او جناب ماروین لوبو

ہمراہ ہوتا تھا اور وہ وہاں جا کر پاکستان کو بہت یاد کرتی تھیں۔ اُن کی کوشش ہوتی تھی کہ جلد سے جلد واپس آجائیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ مجھے گھر جانا ہے۔ ''گھر'' سے ان کا مطلب پاکستان اور یہ سینٹر ہوتا تھا۔ وہ اپنے آبائی وطن جا کر بھی پاکستان کو مس کرتیں اور یہاں کے کھانے یاد کیا کرتی تھیں۔ انہیں غصہ آتا تھا اُن لوگوں پر جو پاکستان سے باہر جا کر اپنے وطن کی بُرائی کرتے تھے۔

ڈاکٹر روتھ مریضوں کے بارے میں اس قدر حساس دل رکھتی تھیں کہ سینٹر کے ہر ممبر کو ان کی خاص ہدایت تھی کہ جب بھی کوئی مریض آئے تو چاہے آپ کو کھڑے ہونا پڑے، مریض کو بٹھائیں۔ مریض انہیں ''اماں'' کہا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میری پیدائش جرمنی کی ہے لیکن میرے دل کا ملک پاکستان ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اکیلی یہاں کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی اگر یہاں کے لوگ میرا ساتھ نہ دیتے۔ سینٹر کے اسٹاف میں کئی ممبران وہ ہیں جن کے والدین میں سے کوئی جذام کا مریض تھا اور ان کے بچوں نے اسی سینٹر میں پرورش پائی اور بہترین تعلیم حاصل کر کے آج اسی سینٹر میں کوئی آئی ٹی کے شعبے سے منسلک ہے اور کوئی کسی شعبے سے۔ ڈاکٹر روتھ اپنی ٹیم کے ممبران سے خفا ہوجایا کرتی تھیں اگر کوئی ٹائی سوٹ پہن لیتا تھا۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ کا ماننا تھا کہ اگر ٹیم کے ارکان خوش لباس اور پروٹوکول پر اتنی توجہ دیں گے تو وہ ظاہری اور باطنی طور پر مریضوں سے دور ہوجائیں گے اور مریض کو ان میں اپنائیت محسوس نہیں ہوگی۔ وہ سادگی کو پسند کرتی تھیں تاکہ مریض کو حجاب

محسوس نہ ہو اور وہ خود کو سب کے برابر اور ماحول کا حصہ ہی سمجھے۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ نے ہمیشہ اپنی ٹیم کو یہی سکھایا کہ کبھی مریض کو شرمندہ نہ کرو۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ہمارے مذہب میں کسی کو شرمندہ کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ مسٹر لوبو نے مزید بتایا کہ ایک بار ہماری ٹیم کسی دورے پر گئی تو وہاں ہمارے ڈرائیورز کو کہا گیا کہ آپ باہر کھڑے رہیں۔ ڈاکٹر روتھ نے وہاں کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر میری ٹیم باہر کھڑی ہے تو میں بھی نہیں بیٹھوں گی کیونکہ جنرل ورکرز سے لے کر ڈائریکٹر کے لیول تک سبھی لوگ ایک ساتھ ایک میز پر کھانا کھایا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک واقعے کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ہم اکثر جی ٹی روڈ کے ذریعے بسوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ تب اُن دنوں بسوں میں انڈین فلمیں دکھائی جاتی تھیں یا گانے لگائے جاتے تھے۔ ڈاکٹر روتھ فاؤ بہت برا مانتیں اور کہتی تھیں کہ یہ ہمارے بچوں کو کیا سکھا رہے ہیں۔ وہ اسے بند کرنے پر اصرار کیا کرتیں۔

جرمنی سے ڈاکٹر روتھ فاؤ کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے آئی ہوئی اُن کی قریبی دوست اور ساتھی ڈاکٹر کلاؤڈیا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ایک مختصر واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ وہ ایک مریض کو دیکھ رہی تھیں، مریض کومہ میں تھا اور اس کے چیک اپ میں دن کا خاصا حصہ صرف ہو چکا تھا۔ شام کو جب ڈاکٹر روتھ فاؤ نے پوچھا کہ آج آپ نے کتنے مریضوں کا چیک اپ کیا تو میں نے کہا 'ایک'۔ جس پر وہ ناراض ہوتے ہوئے کہنے لگیں کہ پورے دن میں بس ایک مریض؟ تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ ڈاکٹر کلاؤڈیا نے پرانے دنوں کی یادوں میں کھوتے ہوئے کہا کہ وہ جب بھی ہمیں ملنے جرمنی آتی تھیں تو وہ جسمانی طور پر تو ہمارے ساتھ ہوتی تھیں لیکن اُن کا ذہن اور دل پاکستان میں ہی ہوتا تھا اور زیادہ سے زیادہ وہ تین یا چار دن آرام سے رہتی تھیں پھر ایک ہی رٹ لگا لیتی تھیں کہ مجھے واپس جانا ہے۔ میرا دل نہیں لگ رہا میرے بچے وہاں پاکستان میں ہیں جو بھوکے ہوں گے اور میرا انتظار کرتے ہوں گے۔

ڈاکٹر کلاؤڈیا اور مسٹر لوبو سے ملاقات کے بعد میں مریضوں کے وارڈ میں پہنچی جہاں مریض آرام کر رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ ایک خاتون مریضہ نے روتے

ڈاکٹر روتھ فاؤ علالت کے دنوں میں بھی مریضوں کا ریکارڈ چیک کرتے ہوئے

ہوئے کہا کہ ہم بے گھر اب ہوئے ہیں حالانکہ اس سینٹر میں ہمیں بے حد آرام مہیا کیا جاتا ہے مگر ہماری ماں کے جانے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم یتیم ہو گئے ہوں۔ وہاں کے بیشتر مریض اردو زبان سے ناواقف تھے۔ ڈاکٹر مظہر ضیا اور ڈاکٹر بوٹا سنگھ کے چہروں پر تمام دن نرم سی مسکراہٹ چھائی رہتی ہے اور وہ سارا دن بغیر تھکے مسلسل مریضوں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سینٹر میں آنے کا ٹائم تو فکس ہے مگر جانے کا کوئی وقت نہیں اور ذہن بھی ایسا محسوس ہوا کہ ہم تھک گئے ہیں اور اب ہمیں آرام کرنا چاہیے۔ ایک جوش، جذبہ اور محبت بھری لگن وہاں کے ہر ممبر کا خاصہ تھی اور یہ شاید ڈاکٹر روتھ فاؤ کی صحبت اور جذبے کی ہی دین تھی۔

پاکستان سے محبت کا اظہار

پاکستان سے محبت کا اظہار ڈاکٹر روتھ کچھ اس طرح سے کیا کرتی تھیں۔ ''مجھے اس ملک کے لوگوں سے محبت ہے۔ وہ، جن کے ساتھ میں کام کرتی ہوں۔ میری ٹیم، میرے کارکن اور وہ تمام لوگ جنہوں نے جذام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ مجھے اپنے مریضوں سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ انہیں میری ضرورت ہے اور مجھے اُن کی۔ پاکستان میرا ملک ہے، یہ متنوع سرزمین ہے۔ مجھے پاکستان سے محبت ہے۔ میں اپنے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ اس سے پیار کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ جب میں سماجی ناانصافی اور اس پر معاشرے کی بے حسی اور لاتعلقی دیکھتی ہوں تو اپنے اندر بے چارگی اور کڑھن بھی محسوس کرتی ہوں۔ اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ میں غیر ملکی ہوں اور غیر ملکی رہوں گی۔ اس کے باوجود یہاں میرا آنا اپنے گھر آنے کی طرح ہے کیونکہ یہ ملک ایک طویل عرصہ گزارنے کی وجہ سے اب میرا گھر بن چکا ہے''۔

وطنِ عزیز کو ترقی یافتہ دیکھنے کی خواہش

ڈاکٹر روتھ فاؤ پاکستان کو ایک ترقی یافتہ ملک دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان ترقی کی منازل اس تیزی سے طے نہیں کر رہا جس طرح کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ اُن کے نزدیک کچھ یہ تھی ''پاکستان میں ترقی کا عمل سست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام تاحال پاکستانی نہیں۔ وہ ابھی بھی سندھی، بلوچی، پٹھان اور دیگر قومیتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کی سوچ، فکر اور عمل پاکستان کے لیے نہیں بلکہ اپنی اپنی قومیتوں تک محدود ہے۔ جب وہ پاکستانی بن کر سوچیں گے اور کام کریں گے تو وہ ترقی کی منازل بھی تیزی سے طے کر لیں گے۔ دوسری وجہ تعلیم پر حکومت کی توجہ کم ہے۔ تیسری اور اہم وجہ حکومت کی ناقص پالیسیاں ہیں جو غربت ختم کرنے کی بجائے اس میں اضافے کا باعث بن رہی ہیں''۔

ڈاکٹر روتھ کی تصانیف

پاکستان میں کم ہی لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحبہ پانچ کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ سب جرمن زبان میں ہیں البتہ اُن کی ایک کتاب کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۷ء میں to light a candle کے عنوان سے ہو چکا ہے۔ اپنی اس کتاب میں انہوں نے ایک سوال اٹھایا ہے ''کیا دو ایسے مذاہب کے لیے جن میں سے ہر ایک کو ابدی سچائی پا لینے کا دعویٰ ہو، ایک دوسرے سے بامعنی مکالمہ کرنا ممکن ہے؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں صرف اپنی زندگی کے تجربات بیان کر سکتی ہوں''۔ اس کے بعد لاہور کی بادشاہی مسجد کے دورے کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں ''میں ایک مسلمان دوست کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ خاموش، خنک برآمدوں میں چپ چاپ چلتے اور دیواروں پر نازک نقاشی کی تحسین کرتے ہوئے میں اچانک مرکزی صحن میں آ نکلی۔ وسیع خالی صحن۔ لامحدودیت کا احساس اور تین گنبد، محراب کے اُوپر موتیوں کے ڈھیروں جیسے، بہت دور معلوم ہوتے ہوئے۔ اس ناقابلِ تصور، واحد ہستی نے، جس کی شان میں یہ مسجد بنوائی گئی تھی، اچانک

میرے وجود پر غلبہ پالیا، مجھے سحر زدہ کر دیا۔ وہ ناقابلِ فہم ہستی فانی انسان کو اسی صورت میں اپنا جلوہ دکھا سکتی تھی۔ میں نے اپنی مغربی پرورش سے پیدا ہونے والی تمام تر قوتِ ارادی سے کام لے کر خود کو گھٹنوں کے بل جھک کر رو پڑنے سے باز رکھا۔ یہ وہ روحانی واردات تھی جو مجھ پر اپنے مسلمان دوست کے سامنے طاری ہوئی اور جس نے میری روحانی زندگی پر گہرا نقش چھوڑا''۔

ڈاکٹر روتھ کا پیغام، نوجوانوں کے نام

''آپ لوگ اپنی زندگیوں کا آغاز کر رہے ہیں۔ یاد رکھیں کہ زندگی خدا کی ایک خوبصورت نعمت ہے۔ اس سے لطف اندوز ہوں۔ کسی کو یہ حق نہ دیں کہ وہ آپ کو بیوقوف بنائے۔ ہمیشہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ حلال کو حلال سمجھیں اور حرام کو حرام جانیں۔ یاد رکھیں کہ خوشی مادی چیزوں کے حصول کا نام نہیں، بلکہ حقیقی اور پائیدار خوشی تو رشتے نبھانے، دوستی کا حق ادا کرنے اور دوسروں سے محبت کرنے سے ملتی ہے۔ آپس میں تحائف کا لین دین کریں خواہ وہ ایک مسکراہٹ ہی کیوں نہ ہو۔ ایک دوسرے سے گرمجوشی سے ملیں۔ لوگوں کی خوشیوں اور غموں میں شرکت کریں۔ ان کے دکھ درد بانٹیں۔ یہ تمام چیزیں ہی آپ کو سچی خوشی فراہم کریں گی اور آپ کے پھلنے پھولنے میں مددگار ثابت ہوں گی''۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ کے ایک خط کا مختصر اقتباس

اپنی سترویں سالگرہ کے موقع پر انہوں نے منگھو پیر نیوز لیٹر میں لکھا ''اسٹاف کے نمائندوں نے سب سے پہلے آکر اپنا تحفہ دیا: شلوار قمیص، زرد رنگ کی، جو میرا پسندیدہ رنگ ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ میں اسے پہلی بار ۲۵ ستمبر کو پہنوں گی۔ وہ اپنے ساتھ سالگرہ کا کارڈ بھی لائے تھے۔ 'ماں، تمہارے لیے، محبت کے ساتھ۔ ماں وہ ہے جو مانگنے سے پہلے مدد کو پہنچتی ہے، جو کسی صلے کی توقع کے بغیر اپنی محبت دیتی ہے، اور سب سے بڑھ کر، ماں وہ ہے جس کی محبت کی کوئی انتہا نہیں'۔

''یوحنا کی انجیل کا یہ جملہ مجھے ہمیشہ مسحور کرتا ہے،'' اور جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان سے محبت کرے گا، تو اس نے آخر تک ان سے محبت کی...... آخر تک''۔

''میں نے جو زندگی گزاری ہے، اس سے بہتر زندگی کا میں خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتی تھی''۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ کا سفر آخرت

۱۰ راگست ۲۰۱۷ء کو ڈاکٹر روتھ فاؤ اپنے ''دل کے ملک'' کو سوگوار چھوڑ کر ایک نئے سفر پر گامزن ہوگئیں۔ اُن کی تین آخری خواہشات تھیں جن کا اظہار انہوں نے اپنے علالت کے دنوں میں کیا تھا۔ پہلی یہ کہ انہیں وینٹی لیٹر پر نہ رکھا جائے، دوسری اُن کا جسدِ خاکی اسپتال (MALC) لایا جائے اور تیسری خواہش لال جوڑے میں دفن ہونے کی تھی۔ اُن کے آخری سفر کی تیاریاں کرتے ہوئے تینوں خواہشوں کا احترام کیا گیا۔ ۱۹ راگست ۲۰۱۷ء کو انہیں آرمی چیف، ائیر چیف، گورنر سندھ سمیت دیگر کئی اہم سیاسی و عسکری حکام کی طرف سے سلامی پیش کی گئی اور پورے اعزاز کے ساتھ پاکستانی پرچم میں لپیٹ کر انہیں اُن کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا گیا۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ نے انسانیت کی خدمت کا جو عہد کیا اسے آخری دم تک خوب نبھایا۔ معاشرے کے دھتکارے ہوئے غریب و بے کس مریضوں کا نہ صرف علاج بلکہ انہیں سماج کا صحت مند اور کارآمد فرد بھی بنایا۔ اُن کا وجود انسانیت کے لیے سراپا امن تھا۔ ڈاکٹر فاؤ نے یہ خدمت خلق کسی صلے، انعام یا ستائش کے لالچ میں نہیں کی بلکہ اُن کا مقصد صرف اور صرف اپنے خدا کی رضا تھی۔ ان کا خلوص، جذبہ، لگن، انتھک محنت اور عزم و ہمت ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اُن کی جلائی ہوئی شمع ہمیشہ روشن رہے گی۔ جو زادِ راہ وہ اپنے اس سفر کے آغاز میں ساتھ لائی تھیں وہی وقتِ رخصت بھی ان کے ہمراہ تھا۔ ''ناداری، پاکیزگی اور اطاعت''۔

پسماندہ گاؤں کے سپوت فخر زمان کی ڈرامائی داستان

سید عاصم محمود

پاک بحریہ سے کرکٹ کے میدان تک

آج لندن کی ہارلے فورڈ روڈ مردوزن سے کھچا کھچ بھری ہے۔ اسی سڑک پر برطانیہ کا مشہور زمانہ اوول کرکٹ گراؤنڈ واقع ہے۔ گراؤنڈ کے دو دروازے ہیں اور دونوں مشہور بلے بازوں...... سر جیک ہابس اور سر ایلک سٹیورٹ سے منسوب ہیں لیکن آج گراؤنڈ میں انگریز خال خال ہی نظر آ رہے ہیں۔ نشستوں پر بھارتی اور پاکستانی شائقین کرکٹ جابجا بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت سے اپنے اپنے ملک کے پرچموں سے بنے رنگ برنگ لباس میں ملبوس ہیں۔ وہ ڈھول تاشے بجا اور گانے گا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ آج اوول گراؤنڈ میں کوئی میچ نہیں ہو رہا میلا لگا ہے۔

اس میلے کی ہیرو بجا طور پر پاکستانی ٹیم ہے جو وسط مئی ۲۰۱۷ء میں چیمپئنز ٹرافی میں حصہ لینے برطانیہ پہنچی تھی۔ دنیائے کرکٹ کی اس ایلیٹ چیمپئن شپ میں آٹھ ٹیموں کے مابین مقابلہ تھا اور پاکستانی ٹیم سب سے آخر میں تھی۔ تب کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ کمزور ترین ٹیم دنیا کی مایہ ناز ٹیموں کو چاروں شانے چت کر کے ٹرافی جیت جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی ٹیم نے بمشکل ویسٹ انڈین ٹیم کو ہرایا تبھی چیمپئنز ٹرافی میں اس کی جگہ پکی ہوگئی تھی۔ ٹیم میں تجربے کار کھلاڑی شامل تھے مگر یہ یقینی نہیں تھا کہ وہ برطانیہ کی تیز پچوں پر عمدہ کارکردگی دکھا پائیں گے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ان کا پہلا جوڑ ہی ایک روزہ کرکٹ کی چیمپئن بھارتی ٹیم سے پڑ گیا۔ اس میں کئی مایہ ناز کھلاڑی مثلاً ویرات کوہلی، روہیت شرما، شنکر دھاون، یوراج سنگھ، مہیندر سنگھ دھونی، ایشون وغیرہ شامل تھے۔

بھارت نے پہلے باری کھیلی۔ حسب توقع بھارتی کھلاڑیوں نے پاکستانی باؤلروں کی خوب پٹائی کی اور اسکور ۳۱۹ رن تک پہنچا دیا۔ پاکستانی ٹیم دباؤ میں آئی اور صرف ۱۶۴ رن بنا کر آؤٹ ہوگئی۔ گو نتیجہ توقع کے مطابق تھا مگر دنیا بھر میں پھیلے پاکستانیوں کے دل ٹوٹ گئے۔ ان کے من میں بس یہی تمنا بسی ہوتی ہے کہ پاکستانی ٹیم بے شک گوروں یا کالوں

سے ہار جائے مگر بھارتیوں سے شکست کھا کر اپنی بے عزتی نہ کروائے۔ بھارت سے ہارنے پر پاکستان بھر میں ماتمی فضا جنم لے لیتی ہے۔

مایوسی سے ہمت پائی

انسان جب زندگی کے کسی موڑ پر ناکام ہوجائے' تو ردعمل کے طور پر اس میں دو مختلف جذبات جنم لیتے ہیں۔ وہ مایوسی اور پژمردگی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ یا پھر ہمت وعزم پکڑ کر جیت کے لیے سر توڑ کوشش کرنے لگتا ہے۔

بھارت سے عبرت ناک شکست کے بعد پاکستانی ٹیم کے سبھی چھوٹے بڑے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس محفل میں بلے باز شعیب ملک نے بہترین تقریر کی اور اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھایا۔ اس نے ساتھی کرکٹروں پر زور دیا کہ وہ بھارت سے شکست بھول کر اگلے میچ میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں اور سب سے بڑھ کر دلیری و بے خوفی سے کھیلیں۔ دیگر کرکٹروں کی تقریروں نے بھی پاکستانی ٹیم میں نیا جوش و ولولہ پیدا کردیا۔

اب سات جون کو ایک اور مضبوط ٹیم' جنوبی افریقا سے مقابلہ ہوا۔ اس میچ میں پاکستانی باؤلروں نے عمدہ باؤلنگ کی اور جنوبی افریقن صرف ۲۱۹ رن بنا سکے۔ پاکستانی بلے بازوں نے باری کا آغاز کیا' تو وہ تیزی سے کھیلے۔ چنانچہ جب بارش حملہ آور ہوئی' تو پاکستان بہتر رن ریٹ کے باعث مقابلہ جیت گیا۔

اسی میچ میں فخر زمان نامی ایک پاکستانی کھلاڑی کو پہلا بین الاقوامی ایک روزہ مقابلہ کھیلنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ بہت سے پاکستانیوں نے پہلی بار اس کھلاڑی کا نام سنا مگر کرکٹ کے حلقوں میں یہ جانا پہچانا نام تھا۔ پہلے میچ میں فخر نے ۳۰ رن بنائے۔ اس نے چھ چوکے مارے اور اس کا اسٹرائیک ریٹ (۱۳۴ فیصد) سبھی پاکستانی کرکٹروں میں سب سے زیادہ تھا۔

۱۲ جون کو سری لنکا اور پاکستان کے مابین کانٹے کا مقابلہ ہوا۔ جو بھی اس میچ کا فاتح ٹھہرتا وہ سیمی فائنل میں پہنچ جاتا۔ فخر زمان نے اس مقابلے میں بھی نصف سینچری بنا کر عمدہ کارکردگی دکھائی اور پاکستانی قوم کے دل موہ لیے۔ اس کے قیمتی رنز نے پاکستان کی جیت میں اہم کردار ادا کیا۔ یوں آٹھویں نمبر کی پاکستانی ٹیم تمام پیشن گوئیوں کو غلط ثابت کرتی سیمی فائنل میں پہنچ گئی۔

سیمی فائنل میں انگلینڈ کے خلاف بھی نصف سینچری بنا کر فخر زمان نے سبھی ہم وطنوں سے داد سمیٹی۔ برطانوی اخبارات دھڑلے سے پیشن گوئی کررہے تھے کہ گوروں کی ٹیم ہی فاتح ٹھہرے گی، لیکن پاکستانی ٹیم نے گوروں کو ایسی عبرت ناک شکست دی کہ وہ صم بکم کی تصویر بن گئے۔ اس بار بھی فخر کے ۵۷ رنز فتح میں مدد ومعاون بنے اور یوں پاکستانی ٹیم طاقتور حریفوں کو ملیامیٹ کرتی فائنل میں جا پہنچی جہاں ایک بار پھر اس کا روایتی حریف بھارت سے ٹکراؤ ہوا۔ ۱۸ جون کی صبح اوول کرکٹ گراؤنڈ میں ہزاروں پاکستانیوں اور بھارتیوں نے میلا سجا دیا اور بے چینی سے مقابلے کا انتظار کرنے لگے۔

ویرات کوہلی نے ٹاس جیتا اور پاکستانی ٹیم کو کھیلنے کی دعوت دی۔ فخر زمان اور اظہر علی کی جوڑی پچ پر پہنچی۔ چوتھا اوور بھارتی فاسٹ باؤلر جسپریت بومرا نے کروایا۔ اس کی ایک گیند پر فخر زمان آؤٹ ہوگیا۔ وہ مایوس ہوکر پویلین کی جانب بڑھنے والا تھا کہ ایمپائر نے اُسے روک لیا۔ اُسے پتا چلا کہ بومرا نے نوبال کروائی تھی۔

یوں فخر زمان کو نئی زندگی مل گئی۔ اس نے حیات نو پا کر پھر بھارتی باؤلروں کو نہیں بخشا اور وکٹ کے چاروں طرف ان کی دھنائی کرنے لگا۔ بھارتی کھلاڑی اور تماشائی سب دم بخود بیٹھے اس پاکستانی نوجوان کا سحر انگیز کھیل دیکھتے رہے۔ فخر نے جب سکّہ بند بھارتی باؤلروں کو چوکے چھکے مارے تو پاکستانی خوشی و جوش کے مارے اچھلنے لگے جبکہ بھارتی تماشائیوں کے ہجوم میں سناٹا چھا گیا۔

اس میچ میں فخر زمان نے شاندار سینچری بنائی۔ اس کے عمدہ کھیل نے بڑے بڑے غیر ملکی کھلاڑیوں کو دم بخود کردیا۔ سابق برطانوی کپتان' مائیکل وان نے دوران کھیل ٹویٹ کیا: ''ارے بھئی' فخر کہاں چھپا ہوا تھا۔ وہ تو شاٹیں کھیلنے کا بہترین ماسٹر ہے۔''

اس طرح نیوزی لینڈ کے سابق کپتان اور مشہور کھلاڑی' سٹیفن فلیمنگ نے بھی ٹویٹ کیا: ''ہمیں سوال پوچھنا چاہیے کہ فخر زمان کہاں چھپا تھا۔ پاکستان..... زبردست آغاز۔ وہ آیا، دیکھا اور فتح کرلیا۔''

فخر زمان اور اظہر علی کے زبردست کھیل نے دیگر پاکستانی کھلاڑیوں میں بھی جوش و ولولہ بھر دیا۔ چنانچہ آنے والے کھلاڑی بھی بڑا اسکور کرنے میں کامیاب رہے۔ جب بھارتی بلے باز بیٹنگ کرنے آئے تو عام خیال یہ تھا کہ وہ تگ و دو کے بعد بہرحال مطلوبہ اسکور بنا لیں گے مگر پاکستانی باؤلروں کی جارحانہ بالنگ نے چوٹی کے بھارتی بیٹسمینوں کا بھرکس نکال دیا۔ یوں پاکستانی ٹیم طاقتور مدمقابل کو ہرا کر چیمپئنز ٹرافی جیتنے میں کامیاب رہی۔ ٹیم نے گویا اپنی قوم کو عید کا بہترین تحفہ دیا اور اُسے خوشیوں سے نہال کردیا۔

چیمپئنز ٹرافی کی جیت میں پاکستانی ٹیم کے نوجوان اور نووارد کھلاڑیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں فخر زمان ہی سب سے نمایاں رہا۔ ممتاز رومی سپہ سالار' جولیس سیزر کا قول ہے: ''وہ آیا' دیکھا اور فتح کرلیا۔'' یہ قول فخر پر موزوں ٹھہرتا ہے۔ اس کی شکل میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کو نہ صرف نہایت کارگر بلے باز مل گیا بلکہ وہ ایک بہترین اوپنر بھی ثابت ہوا۔

جب چیمپئنز ٹرافی کھیلی جارہی تھی' تو کم ہی لوگ جانتے تھے کہ فخر زمان نے بڑی محنت اور مستقل مزاجی سے اپنا بلند مقام پایا ہے۔ خاص بات یہ کہ اُسے ایک بہترین کرکٹ کھلاڑی بنانے میں پاک بحریہ کے تجربہ کار کوچوں کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ فخر ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ پاک بحریہ کے کوچوں نے اُسے پہچانا، تراشا پھر بنایا اور یوں عالمی سطح پر ملک وقوم کا نام روشن کرنے والا ایک نہایت چمکدار ستارہ افق پر ابھار دیا۔

یہ شاندار مثال اس حقیقت کو عیاں کرتی ہے کہ افواج پاکستان تن من دھن سے دفاع وطن پر ہی مامور نہیں بلکہ ان کی سعی ہے کہ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاکر سبھی قومی شعبوں کو بھی بنایا سنوارا جائے۔

پچھلے سال ماہ مئی میں قومی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی پاک فوج کے آرمی اسکول آف فزیکل ٹریننگ میں زیر تربیت رہے تھے۔ وہاں کھلاڑیوں سے ایسی کٹھن ورزشیں کروائی گئیں جنھوں نے ان کو جسمانی و ذہنی طور پر پہلے سے زیادہ مضبوط اور طاقتور بنا دیا۔ اسی سخت تربیت کا نتیجہ تھا کہ چند ماہ بعد ہی پاکستانی کرکٹ ٹیم دنیائے ٹیسٹ میں نمبر ون ٹیم بن گئی۔ اس کامیابی میں پاک فوج کے تربیت کاروں کا اہم کردار تھا۔ اُمید واثق ہے کہ افواج پاکستان کی توجہ و دلچسپی سے دیگر کھیلوں خصوصاً ٹینس اور ہاکی میں قومی ٹیمیں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرلیں گی۔ پاک فوج زندہ باد!

کٹلانگ کا باسی

پاکستان کو فخر مند کرنے والا فخر زمان ۱۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو ضلع مردان کی تحصیل کٹلانگ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے ہے۔ والد فقیر گل تحفظ حیوانیات میں محو ایک ادارے میں ملازمت کرتے تھے۔ تنخواہ بس اتنی تھی کہ زندگی کی بنیادی ضروریات پوری ہوجائیں۔ بھرے پرے خاندان کی وجہ سے اخراجات بھی زیادہ تھے۔

فخر زمان بچپن سے تمام بچوں کی طرح کھیل کود میں دلچسپی لینے لگا۔ چھوٹا ہی تھا' تو گلی میں جا کر دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ رفتہ رفتہ اُسے کرکٹ کا کھیل بھا گیا۔ جب وہ شام کو کرکٹ کھیل کر گھر واپس آتا' تو اس کے کپڑے مٹی سے لتھڑے ہوتے۔ اکثر اُسے ماں کی جھڑکیاں سننا پڑتیں۔

جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اُسے اسکول داخل کروادیا گیا۔

فخر اسکول سے واپس آ کر آرام کرتا اور پھر کرکٹ کھیلنے چلا جاتا۔ پڑھائی میں کم ہی دلچسپی لیتا۔ یہ دیکھ کر فخر کے والد اور بڑے بھائی متوحش ہوگئے۔ وہ اس مقولے پر یقین رکھتے تھے: پڑھو گے' لکھو گے' بنو گے نواب' کھیلو گے' کودو گے' ہو گے خراب۔ بڑوں نے فخر کو تنبیہ کی کہ وہ تعلیم کی جانب بھی توجہ دے۔ جب فخر بدستور کھیل کو زیادہ وقت دیتا رہا' تو چند بار والد اور بھائیوں کے ہاتھوں اس کی پٹائی بھی ہوگئی۔

انسان نہیں جانتا کہ اس کی قسمت میں کیا بننا لکھا ہے۔ بچپن میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی کھیلوں کے بہت شوقین تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی قسمت میں لکھ دیا تھا کہ انھیں اعلیٰ پائے کا انجینئر و سائنس داں بننا ہے۔ اسی طرح رب کائنات نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ فخر زمان کو ایک عمدہ بلے باز بننا ہے۔

مانسہرہ کے نیوی کیڈٹ کیمپ میں دوست کے ساتھ

۲۰۰۶ء میں فخر نے میٹرک پاس کر لیا۔ تب تک گھریلو اخراجات بہت بڑھ چکے تھے۔ حتیٰ کہ فقیر گل کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ بیٹے کی کالج کی تعلیم کا خرچ برداشت کر لیتے۔ فخر کو بھی دگرگوں گھریلو حالات کا بخوبی علم تھا۔ وہ مزید پڑھنے کے بجائے والد کا سہارا بننا چاہتا تھا۔ اسی لیے جب پاک بحریہ نے نیوی سیلر بھرتی کرنے کا اعلان کیا' تو فخر نے بھی درخواست دے ڈالی۔

والد اور بھائیوں کی پٹائی اور گھر کیاں بھی فخر کو کرکٹ کھیلنے سے باز نہیں رکھ سکی تھیں۔ وہ روزانہ تین چار گھنٹے اپنا من پسند کھیل کھیلنے میں ضرور گزارتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک عمدہ کھلاڑی بن گیا۔ وہ جارحانہ مزاج رکھتا تھا اور پچ پر آتے ہی باؤلروں پر حملہ کر دیتا۔ پھر چوکوں چھکوں کی ایسی برسات شروع ہوتی کہ باؤلر اس میں نہا کر سرتا پا شرمندگی کے پسینے میں بھیگ جاتے۔

پاک بحریہ کی آغوش میں

اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ مسلسل کرکٹ کھیلنے کے باعث فخر زمان بہت چست و چالاک تھا۔ متواتر کھیل نے اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کو ابھار دیا تھا لہٰذا اس نے تمام امتحان بآسانی پاس کیے اور پاک بحریہ سے بطور سیلر منتخب ہوگیا۔ ابتداً اسے ضلع مردان ہی میں ایک سالہ تربیت دی گئی۔ پھر فخر کو مزید تربیت کے لیے پاک بحریہ کے سب سے بڑے تربیتی ادارے' پی این ایس کارساز' کراچی بھجوادیا گیا۔

اواخر ۲۰۰۷ء میں جب فخر کراچی روانہ ہوا' تو سترہ سالہ نوجوان کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ شہر قائد اس کی تقدیر بدلنے والا ہے۔ پی این ایس کارساز میں مردان کے دیہی نوجوان کو نیوی سیلر بنانے کی خاطر مطلوبہ تربیت دی جانے لگی۔

(بقیہ صفحہ 227 پر)

سچا واقعہ

راوی: محمد ریحان

تحریر: رفیق سجاد

قرآن کا معجزہ

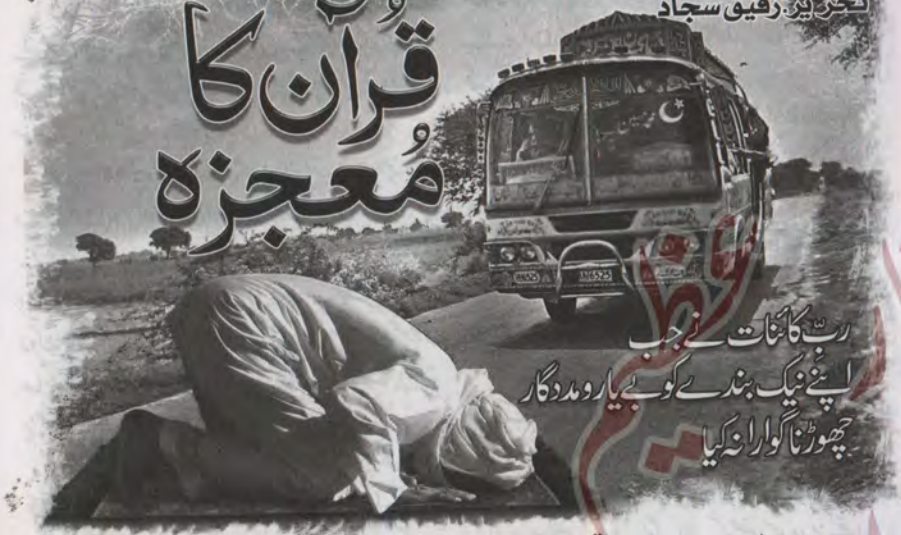

اڈے پر

بس چلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ صرف چند سواریوں کی گنجائش تھی اور کنڈیکٹر باہر کھڑا مسلسل آوازیں لگا رہا تھا۔ ڈرائیور بھی بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سب چاہتے تھے کہ مسافر آ جائیں اور بس چلے۔ اتنے میں دور سے کنڈیکٹر کو ایک جوڑا آتا نظر آیا۔ خاتون سرتا پا پرانی وضع کے ٹوپی والے برقع میں ملبوس تھی۔ مرد نے کلیوں والی موتیے رنگ کی قمیص اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ چہرے پر خوش نما ڈاڑھی، سر پہ ٹوپی اور کاندھے پہ رومال رکھے، خاتون کے ہمراہ جو غالباً ان کی اہلیہ تھیں' خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

بس کے قریب پہنچے تو کنڈیکٹر نے کہا ''مولوی صاحب! بیٹھو، بس چلنے والی ہے۔''

انہوں نے کنڈیکٹر سے کہا ''بھائی! بات یہ ہے کہ ہم سوار تو ہو جائیں لیکن ایک شرط ہے.....''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔ کنڈیکٹر حیران کہ یہ عجیب سواری ہے جو شرطیں عائد کر رہی ہے، حالانکہ لوگ تو چاہتے ہیں کہ جیسے تیسے انہیں بس میں جگہ مل جائے، سوار ہوں، گاڑی چلے اور منزل مقصود پر جلد پہنچا دے۔ کنڈیکٹر نے پوچھا ''مولوی صاحب! آپ کیا چاہتے ہو؟''

انہوں نے کہا ''بھائی! ہم یہ چاہتے ہیں کہ راستے میں جہاں نماز کا وقت ہو' وہاں تمہیں بس رکوانا ہوگی تاکہ ہم نماز پڑھ لیں۔''

کنڈیکٹر نے پھر حیرانی سے اس جوڑے کی طرف دیکھا جو ابھی تک نیچے کھڑا تھا۔ میاں بیوی کے تیور بتا رہے تھے کہ اپنی بات منوائے بغیر وہ بس میں سوار نہیں ہوں گے۔ اس نے بس چلانے کی خاطر وعدہ کر لیا ''ہاں..... ہاں مولوی صاحب! آپ کو راستے میں نماز پڑھا دیں گے۔''

ڈرائیور کو بھی جو یہ ساری باتیں سن رہا تھا، اس نے آنکھ مار دی۔ وہ بھی بولا ''مولوی صاحب! جب نماز کا وقت ہوگا بس روک دیں گے.....'' پھر کلائی پہ بندھی گھڑی میں وقت

دیکھتے ہوئے کہا ”آپ لوگ بیٹھو۔“

وعدہ تو کنڈیکٹر اور ڈرائیور دونوں نے کر لیا کہ نماز کے لیے بس روکی جائے گی مگر دل میں ان کے یہی تھا کہ کسی بھی طرح بس بھرو اور چل پڑو۔ خیر وہ جوڑا بیٹھ گیا تو دو تین سواریاں اور آئیں اور بس چل پڑی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ راستے میں مسافر اترتے اور چڑھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد عصر کی اذانیں شروع ہوگئیں۔ بس تیزی کے ساتھ رواں دواں تھی۔ مولوی صاحب نے کنڈیکٹر کو اشارہ کیا کہ نماز کا وقت ہو چکا، کہیں مناسب جگہ دیکھ کر بس روک لے لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ دس منٹ بعد مولوی صاحب نے کنڈیکٹر کو پاس بلا کر کہا ”بھائی! بس روک دو، نماز پڑھنی ہے اور یہ بات طے بھی ہوئی تھی..... دیر نہ کرو۔“

کنڈیکٹر بولا ”مولوی صاحب! ہم تھوڑی دیر میں ملتان پہنچنے والے ہیں، وہیں جا کر نماز پڑھ لینا..... ہم راستے میں بس نہیں رکوا سکتے۔“

مولوی صاحب بولے ”لیکن بھائی! تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اب اس وعدے سے پھر رہے ہو..... یہ بات غلط ہے۔“

کنڈیکٹر بحث کرنے لگا ”مولوی صاحب! دو بندوں کی خاطر ہم پھر بس کی باتیں نہیں سن سکتے، آپ تھوڑا صبر کر لیں۔“

ڈرائیور نے بھی بس روکنے سے انکار کر دیا۔ مولوی صاحب نے کنڈیکٹر سے کہا ”اچھا بھائی! جیسے تمہاری مرضی..... تم نے جھوٹا وعدہ کر کے ہمیں بس میں بٹھا لیا اور ہم بیٹھ گئے لیکن اب ایک مہربانی کرو..... بس روک کر ہمیں اتار دو اور چلے جاؤ..... نماز کا وقت ہم نہیں ٹال سکتے۔“

کنڈیکٹر بڑبڑایا اور بس رکوا دی۔ مولوی صاحب اپنی اہلیہ کو اور سامان کا تھیلا لے کر بس سے اتر گئے۔ کنڈیکٹر نے آواز لگائی ”چلو استاد جی.....“۔ ڈرائیور نے بریک پر سے پاؤں ہٹا دیا۔ بس چلی لیکن پھر یکا یک اس کا انجن غرا کر خاموش ہو گیا۔

ڈرائیور نے چابی گھمائی تاکہ انجن سٹارٹ ہو لیکن نہ ہوا۔ کنڈیکٹر کو قریب بلا کر کچھ ہدایات دیں۔ وہ ایک سیٹ کے نیچے سے اوزاروں والا تھیلا لے کر آیا اور دونوں اس کھوج میں لگ گئے کہ بس میں کیا خرابی ہوئی ہے۔

بس سڑک کنارے کھڑی تھی۔ کنڈیکٹر اور ڈرائیور کو بس ٹھیک کرنے میں مصروف دیکھ کر سواریاں ٹہلنے لگیں۔ کچھ رفع حاجت کے لیے اتر گئیں۔ کافی دیر گزر گئی۔ سواریاں واپس آ کر سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر حیران بلکہ پریشان تھے کہ بظاہر بس کی ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن انجن چالو نہیں ہو رہا۔ نتیجتاً ساری سواریاں پریشان تھیں۔

اب آپ مولوی صاحب اور ان کی اہلیہ کا حال سنیں۔ بس سے تھوڑی دور ایک نہر بہہ رہی تھی۔ بس سے اتر کر دونوں میاں بیوی نہر پر گئے اور وضو کیا۔ مولوی صاحب پھر رومال بچھا کر نماز ادا کرنے لگے۔ اہلیہ قریبی جھاڑیوں کی اوٹ میں نماز پڑھنے لگیں۔ ادھر یہ لوگ اللہ کے حضور سجدہ ریز تھے، ادھر بس کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر پریشان بیٹھے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بس کیوں نہیں چل رہی!

مولوی صاحب اور ان کی اہلیہ بس کی طرف سے مکمل بے نیاز تھے۔ جب نماز ختم کر لی تو انہوں نے دیکھا کہ بس ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔ دونوں بہت حیران ہوئے کیوں کہ وہ بس کی خرابی سے قطعی بے خبر تھے۔ مولوی صاحب نے سامان کا تھیلا اٹھایا اور اہلیہ کے ساتھ دوبارہ بس کے قریب چلے آئے۔

کنڈیکٹر سے کہا ”کیوں بھائی! ابھی تک یہیں کھڑے ہو، خیریت ہے..... پھر بس میں ایک نظر ڈالی۔ اپنی سیٹ خالی دیکھ کر بولے ”اجازت ہو تو بیٹھ جائیں اندر.....“

کنڈیکٹر جس کے چہرے سے پریشانی کے آثار صاف ہویدا تھے، نگاہیں جھکا کر بولا ”بس تو اسی وقت سے خراب ہے، جب آپ اترے تھے..... خیر بیٹھ جاؤ۔“

مولوی صاحب اور ان کی اہلیہ بیٹھ گئے۔ اسی وقت کنڈیکٹر نے ڈرائیور سے کہا جو سٹیرنگ پر ماتھا ٹکائے بیٹھا تھا، ”استاد جی! ایک واری ہور ٹرائی مارو (انجن سٹارٹ کرنے کی پھر کوشش کرو)۔“

اب جو ڈرائیور نے چابی گھمائی، انجن ایک زوردار آواز کے ساتھ غرایا اور سٹارٹ ہو گیا۔ انجن کو ہوش آیا تو سارے مسافروں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مولوی صاحب زیر لب کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ بس نے تین کلو میٹر فاصلہ طے کیا ہو گا کہ ڈرائیور نے اسے پھر روک دیا۔ اپنی نشست سے اٹھ کر مولوی صاحب کے قریب آیا، ان کے پاؤں میں بیٹھ، ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر عقیدت سے چوما اور نماز کے لیے بس نہ روکنے پر معافی مانگی۔

مولوی صاحب نے کہا ”بھائی! یہ تم میرا ہاتھ کیوں چوم رہے ہو..... میں اللہ کا عاجز اور گناہ گار بندہ ہوں..... ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔“

لیکن ڈرائیور مصر تھا کہ وہ بس نہ روکنے پر باقاعدہ دل سے اُسے معاف کر دیں۔ اس نے کہا ”مولوی صاحب! سچ سچ بتائیے، آپ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، اتنا تو میں جان گیا ہوں کہ آپ نیک بزرگ ہیں۔ ہم نے نماز کے لیے بس نہیں روکی تو آپ سفر ختم کر کے اتر گئے۔ ادھر آپ اترے ادھر بس رک گئی..... کسی خرابی کے بغیر.....“

اتنے میں کنڈیکٹر بھی قریب آ چکا تھا۔ اس نے بھی مولوی صاحب سے اپنے رویے کی معافی مانگی۔ مولوی صاحب اب اس صورتحال سے پریشان ہونے لگے۔ بس رُکنے سے اب دیگر مسافروں کے چہروں پہ ناگواری کے آثار تھے۔ انہوں نے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے کہا ”بس بھائیو! جو ہونا تھا ہو چکا..... میں تمہیں معاف کرتا ہوں، میرا اللہ بھی تمہیں معاف کرے اور ہدایت دے..... بس اب چل پڑو۔“

ڈرائیور گویا ہوا ”نہیں مولوی صاحب! جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، اس وقت تک بس نہیں چلے گی۔“

مولوی صاحب بولے ”بھائی! میں ملتان میں رہتا ہوں۔ خیر المدارس نامی مدرسے میں بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتا ہوں اور بس..... میرا نام رحیم بخش ہے۔“

ڈرائیور نے یہ سن کر کہا ”مولوی صاحب! مجھے آپ سے عقیدت ہو گئی ہے۔ اب تو ملتان پہنچ کر پہلے بس آپ کے گھر کے دروازے پر لے جا کر آپ کو اتاروں گا..... پھر دوسری سواریوں کو اڈے لے جاؤں گا۔“

اس نے مدرسہ خیر المدارس کا محل وقوع مولوی صاحب سے معلوم کیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب جن کا پورا نام قاری رحیم بخش تھا، کہتے رہ گئے کہ بھئی ایسا نہ کرنا، اس سے دوسرے مسافروں کو پریشانی ہو گی لیکن ڈرائیور بھی دھن کا پکا تھا۔

ملتان پہنچ کر اس نے بس اڈے کی طرف لے جانے کے بجائے دور کھیتوں میں سے کچے راستوں پر گزار کر مدرسہ خیر المدارس کے دروازے پر جا روکی۔ قاری صاحب اور ان کی اہلیہ کو عقیدت کے ساتھ اتار کر رخصت کیا اور ڈرائیور نے ان سے کہا کہ وہ اس کے لیے دعا کریں۔

قارئین! یہ قاری رحیم بخش ملک کی معروف دینی درس گاہ جامعہ خیر المدارس ملتان میں شعبہ تجوید و قرأت کے سربراہ تھے۔ آپ کا شمار جامعہ کے بانی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ زندگی بھر قرآن مجید پڑھتے پڑھاتے رہے۔ پانی پتی طرز قرأت کے ماہر اور تجوید کے مایہ ناز عالم تھے۔ آپ کے ہزاروں شاگرد آج بھی خصوصاً عرب ممالک میں قرآن مجید کی تدریس میں مصروف ہیں۔ آپ جامعہ خیر المدارس ملتان کے اندر ایک احاطے میں بانی جامعہ حضرت مولانا خیر محمدؒ کے مزار مبارک کے قریب آسودہ خاک ہیں۔

●●●

شیر شاہ سوری کا انصاف

تاریخ اسلام سے سبق آموز واقعات کا بیش قیمت انتخاب

پروفیسر خالد پرویز

جونہی کوئی مظلوم، کمزور اور بے بسی سے فریاد کرتا تو وہ ہر کام چھوڑ کر اس کی فریاد سنتا۔ اس نے اپنے پہرے داروں کو یہ مستقل حکم دے رکھا تھا کہ جب بھی کوئی مظلوم دروازے پر آئے اور ہمیں پکارے خواہ کوئی بھی وقت ہو اور ہم کیسے ہی مصروف ہوں، اسے فوراً ہمارے پاس لے آؤ۔ ایک دن اس کے سامنے قتل کا مقدمہ پیش ہوا جس میں قاتل کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اس نے مقدمے کی سماعت کے بعد علاقے کے عملدار کو حکم بھیجا کہ جس جگہ قتل ہوا ہے، اس کے آس پاس واقع کسی درخت کو دو آدمی بھیج کر کٹوایا جائے اور جو کوئی بھی اس درخت کے کٹنے کی اطلاع پا کر سب سے پہلے وہاں پہنچے، اسے پکڑ کر ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔

عملدار نے شاہی فرمان کے مطابق دو آدمی درخت کاٹنے کے لیے موقع واردات پر بھیجے۔ وہ ابھی درخت کاٹ ہی رہے تھے کہ علاقے کے معتبروں نے انہیں آ پکڑا۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس اشخاص نے درخت کاٹنا چھوڑا اور ان معتبروں کو شاہی حکم کے مطابق پکڑ کر بادشاہ کے دربار میں لے جا کر پیش کر دیا۔

بادشاہ نے ان سے دریافت کیا کہ تمہیں درخت کٹنے کی خبر تو ہو گئی لیکن ایک انسان کی گردن ناحق کٹ گئی اور تم اس سے بے خبر رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تین دن کے اندر اندر قاتل کو پیش کرو ورنہ سزا میں تم قتل کر دیے جاؤ گے۔

معتبروں کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور تاریخ گواہ ہے کہ تیسرے دن کا سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ قاتل کو بادشاہ وقت شیر شاہ سوری کے دربار میں حاضر کر دیا گیا۔

شیر شاہ سوری کہا کرتا تھا کہ بادشاہ رعایا کا نگہبان ہوتا ہے اور اس پر اپنی رعایا کے ہر فرد کی حفاظت لازم ہے اگر میں یہ ذمہ داری نہ نباہوں گا تو اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں

گا! لمحۂ موجود بھی کسی ایسے حکمران کا منتظر ہے کہ جس کے دروازے پر کوئی بھی فریادی فوری دادرسی کے لیے کسی بھی لمحے دستک دے سکے!!

جو ایک ہی رات میں امیر بن گیا

وہ حج کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ایک منزل سے دوسری منزل، ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک بستی سے دوسری بستی سے گزرتے ہوئے کچھ وقت کے لیے ٹھہرتے، تازہ دم ہوتے اور پھر چل پڑتے۔ ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا اور عقیدت مند بھی کثیر تعداد میں ان کے ہمراہ تھے۔ سواری چونکہ اونٹوں کی تھی، اس لیے سفر بھی سست رفتار سے جاری تھا۔

چلتے چلتے بغداد کی حدود میں واقع ایک بستی میں پہنچے تو سب نے کہا ''آؤ کچھ دیر کے لیے یہاں رکتے ہیں۔ نماز کا وقت بھی ہو چلا ہے اور کھانے کی طلب بھی سب کو ہو رہی ہے۔ اس لیے پہلے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دیں گے پھر دعا ہو گی۔ اس کے بعد سب مل کر کھانا کھائیں گے۔'' ان کے منہ سے بات نکلنے کی دیر تھی کہ سب نے اس پر عمل کیا۔

جب سب لوگ ٹھہر گئے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ وہ دوڑا ہوا قریب آیا تو انہوں نے اُس سے کہا ''جاؤ اور اس بستی میں جا کر یہ معلوم کر کے آؤ کہ اس بستی میں سب سے غریب اور مسکین شخص کون ہے؟''

بیٹا تیز قدموں کے ساتھ بستی میں گیا اور وہاں کے لوگوں سے ملا۔ اُس نے ان سے پوچھا ''بھائیو یہ بتاؤ کہ تمہاری بستی میں سب سے غریب اور مسکین کون ہے؟''

سب نے یک زبان ہو کر ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کی طرف اشارہ کیا تو بیٹا واپس ان کے پاس آیا اور بتایا ''جس شخص کی تلاش آپ کو ہے، اُس کا گھر میں دیکھ آیا ہوں۔''

انہوں نے تمام ارادت مندوں سے کہا ''آؤ۔ اُس غریب ترین شخص کے گھر چلتے اور اُس کے ہاں ہی ٹھہرتے ہیں۔'' سب لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک ایسا مکان تھا کہ جس کے کمروں کی چھتیں غائب تھیں۔ دیواریں بھی آدھی گر چکی تھیں۔ وہ ایک بوڑھے شخص کا گھر تھا جو اپنی بیوی کے ساتھ مکان کے صحن میں ایک پھٹے پرانے خیمے میں رہ رہا تھا۔

انہوں نے اُس شخص کو سلام کیا اور پوچھا ''اگر اجازت ہو تو ہم سب لوگ آپ کے گھر میں آج کی رات قیام کرنا چاہتے ہیں۔''

بوڑھے غریب شخص نے کہا ''آپ لوگ یہاں ضرور قیام فرمائیے مگر مجھے اس بات سے شرم آ رہی ہے کہ میں اپنے مہمانوں کی خدمت نہیں کر سکوں گا۔''

انہوں نے کہا ''آپ اس بات کی بالکل فکر نہ کیجیے۔ رزق دینے والی صرف اور صرف رب تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہم کھانے پینے کا سامان ساتھ لائے ہیں۔''

قصبے اور بستی کے لوگوں کو جب پتا چلا کہ اللہ کے ولی ادھر پہنچے ہوئے ہیں تو سب دوڑے ہوئے آئے۔ سب نے باری باری اس خواہش کا اظہار کیا کہ اُن کے ہاں ٹھہریں مگر انہوں نے کہا ''اب تو یہاں ٹھہر چکے، یہاں ہی قیام ہو گا''، چنانچہ ان سے ملاقات کے لیے بہت لوگ آئے اور اپنے ساتھ اونٹ، بکریاں اور کئی قسم کے دوسرے تحفے لائے اور ان کو پیش کیے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں تحفوں کا انبار لگ گیا۔ لوگ دُور دُور سے آ کر چیزیں لا لا کر ڈھیر کر رہے تھے۔

اگلے روز سحری کے وقت روزہ رکھنے کے بعد جب اگلی منزل کی جانب چلنے کا ارادہ ہوا تو وقت کے سکندر، مرد قلندر، غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بستی کے سب سے غریب بوڑھے میزبان سے کہا ''اب ہمیں اجازت دیجیے۔ ہم نے ابھی بہت سفر کرنا ہے مگر ہاں! یہ سب تحفے تم اپنے پاس رکھو۔ یہ تمہارے ہوئے۔''

یوں ایک غریب ترین شخص ایک ہی رات میں امیر ہو گیا۔

سب دکاندار رو رہے تھے

اچانک آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ تیز چلتی ہوا نے آگ پر تیل کا

کام کیا۔ یہ ایک پُر رونق بازار تھا جس کے چاروں جانب دکانیں واقع تھیں۔ شام ڈھل چکی تھی۔ اکثر دکاندار دکانیں بند کر کے اپنے اپنے گھر روانہ ہو چکے تھے۔ وہاں پر اگرچہ چند دکانیں ابھی تک کھلی تھیں مگر بازار میں خریدار نہ ہونے کے برابر تھے۔ موقع پر موجود چند راہ گیروں اور چند دکانداروں نے چیخ وپکار بھی کی اور حتی الوسیع آگ بجھانے کی کوشش بھی کی مگر اس کا غصہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ایک کے بعد دوسری اور تیسری دکان آگ کی لپیٹ میں آگئی اور پھر وہی ہوا کہ جس کا ڈر تھا۔ پورا بازار جل کر کوئلہ ہو گیا۔ دکانیں کیا جلیں اُن کا تمام تر سامان بھی جل کر راکھ ہو گیا۔

اسی اثنا میں دکانداروں کو گھروں پر اطلاع ہوئی تو وہ بھاگے دوڑے ہوئے آئے مگر اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ سب دکاندار ہاتھ مل کر رہ گئے۔ کچھ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے تو کچھ سینہ کوبی کر رہے تھے اور کچھ چیخ چلا رہے تھے۔ کچھ رب ذوالجلال سے شکوہ کر رہے تھے۔ ہر دکاندار پریشان، بے حال وبدحال تھا کہ اب اُس کے گھر کا چولہا کیسے جلے گا۔ نئی دکان تعمیر کرنا، پھر سے اس میں سامان ڈالنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ آنسوؤں کا ایک بے روک طوفان تھا جو ہر دکاندار کی آنکھوں سے امڈا چلا آ رہا تھا۔ کچھ دکاندار ایسے بھی تھے جنہوں نے چند روز پیشتر ہی نیا نیا کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ وہ سب سے زیادہ پریشان تھے۔ کچھ دکاندار مقروض بھی تھے۔ انہیں یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ان کا قرض کیسے اُترے گا؟ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا حل کیا ہے۔

ان دکانداروں میں ایک دکاندار ایسا بھی تھا جو ابھی تک جائے وقوعہ پر نہیں پہنچا تھا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ تاہم ایک شخص دوڑا ہوا گیا اور اُسے اطلاع دی کہ اس کی دکان جل گئی ہے۔ جیسے ہی اس نے دکان جلنے کی اطلاع پائی تو اُس نے انتہائی صبر وسکون کے ساتھ صرف اتنا کہا ''رب رحمٰن ورحیم کا شکر ہے کہ اب میں دکان اور مال کی قید سے آزاد ہو چکا۔''

اطلاع دینے والے نے اُسے کہا ''میرے ساتھ چلیے اور جا کر اپنی دکان کی حالت تو دیکھیے۔''

اُس نے کہا ''اس کی کیا ضرورت ہے۔ رب تعالیٰ کی چیز تھی، اُس نے لے لی۔ وہ بڑا رحیم وکریم ہے، چاہے تو پھر نواز دے گا۔'' مگر اطلاع دینے والے کی ضد پر وہ اُس کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد بازار میں پہنچے۔ لوگوں کا ایک جم غفیر ہو چکا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک دکاندار اب آ رہا ہے۔ وہ سب اُسے لے کر اُس کی دکان پر گئے تاکہ اُسے جلی ہوئی دکان دکھا سکیں مگر جیسے ہی وہ سب وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ اس کی دکان بالکل محفوظ تھی۔ نہ دکان جلی تھی اور نہ سامان جلا تھا حالانکہ سارا بازار جل کر راکھ ہو چکا تھا مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

دکان کے مالک نے رب تعالیٰ کا یہ فضل وکرم اور لطف و عنایت دیکھی تو اُسے اتنی خوشی ومسرت ہوئی کہ اُس نے اسی لمحے دکان اور اس کا سارا سامان فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا اور خود درویشی وفقر کا راستہ اپنا لیا۔ یہ وہی دکاندار تھے جو بعد میں مشہور ولی اللہ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کہلائے۔ یہ وہی مرد قلندر تھے جو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں تھے اور استاد بھی۔

تم نے مجھے امیر المومنین کیوں نہیں کہا؟

خلیفہ نے نبی رحمت ﷺ کے شہر ہجرت، مدینہ منورہ پہنچتے ہی حکم دیا ''صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی کو میرے پاس لاؤ۔''

شاہی خادموں نے عرض کی ''جناب عالی! تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنی اپنی زندگی گزار کر اللہ تبارک و تعالیٰ کو پیارے ہو چکے۔''

خلیفہ نے کہا ''اگر ایسا ہے تو پھر تابعینؒ میں سے کسی کو یہاں لاؤ۔ میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

شاہی ملازمین دوڑے ہوئے گئے اور ایک تابعی مرد قلندر کو خلیفہ کے دربار میں لا کر حاضر کیا۔ اس مرد باصفا نے دربار شاہی میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اُتارے اور کہا ''السلام علیکم! یا ہشام!''

خلیفہ نے اُس تابعیؒ کا یہ عمل دیکھا اور یہ انداز گفتگو سنا تو غضبناک ہوا۔ غصہ اس انتہا کو پہنچا کہ اُس نے اس تابعیؒ کا سر قلم کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اُس نے جلاد کو بلایا اور حکم دیا ''اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔''

اس سے پہلے کہ جلاد آگے بڑھتا دربار میں موجود افراد نے عرض کی ''اے خلیفۂ وقت! اے امیر المومنین! یہ حرم رسول ﷺ ہے اور یہ شخص کوئی عام شخص نہیں بلکہ بہت بڑے علما اور تابعین میں سے ہے۔ اسے قتل کرنا انتہائی نامناسب ہے۔ آپ اپنا ارادہ بدلیے۔ جلاد کو دیا ہوا حکم واپس لیجیے اور کم از کم اس کا قصور تو ضرور بتائیے۔''

خلیفہ نے جلاد کو روک دیا اور اس مرد قلندر سے مخاطب ہو کر کہا ''یہ تم نے کیا بے ادبی اور گستاخی کی ہے؟'' اس نے جواب دیا ''میں نے کیا کیا ہے؟''

یہ سن کر خلیفہ غصے سے اور زیادہ بھڑک اُٹھا۔ اُس نے گرجدار آواز میں کہا ''تم نے چار گستاخیاں کی ہیں''

مرد مومن نے پوچھا ''وہ چار گستاخیاں کون کون سی ہیں؟''

خلیفہ نے کہا ''اوّل یہ کہ تم نے میرے پاس آنے سے پہلے فرش پر جوتے اُتار دیے حالانکہ شاہی آداب میں یہ شامل ہے کہ میرے سامنے موزے اور جوتے پہن کر بیٹھنا چاہیے۔ دوم یہ کہ تم نے امیر المومنین نہیں کہا۔ سوم یہ کہ تم نے مجھے صرف میرا نام لے کر پکارا اور میری کنیت نہیں بولی جبکہ یہ شاہی آداب کے سراسر خلاف ہے اور اس بات کو عرب کے لوگ بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ چہارم یہ کہ تم میری اجازت کے بغیر ہی بیٹھ گئے حالانکہ تمہیں چاہیے تھا کہ تم مجھ سے اجازت طلب کرتے اور پھر بیٹھتے۔''

مرد مومن نے خلیفۂ وقت سے مخاطب ہو کر ان چار باتوں کے جوابات دیتے ہوئے کہا: ''پہلی بات یہ کہ تمہارے سامنے جوتے اُتارنے کا سبب یہ ہے کہ میں ہر روز پانچ دفعہ اُس رب العزت کے سامنے کہ جو تمام حاکموں کا حاکم ہے جوتے اُتار کر ہی جاتا ہوں اور میرا رب میری اس حرکت سے کبھی مجھ سے خفا نہیں ہوتا۔''

''دوسری بات یہ کہ میں نے تجھے امیر المومنین اس لیے نہیں کہا کہ تیری اس امارت اور حاکمیت پر سب لوگ راضی اور متفق نہیں۔ اس لیے میں نے جھوٹی بات کہنے سے پرہیز کیا۔ تیسری بات یہ کہ میں نے تجھے کنیت سے اس لیے نہیں پکارا کیونکہ رب تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنے دوستوں کو نام لے کر پکارا ہے مثلاً یا داؤدؑ، یا یحییٰؑ، یا عیسیٰؑ وغیرہ جبکہ دشمنوں کو کنیت سے پکارا ہے مثلاً تبت یدا ابی لہب۔ آخری بات یہ کہ تمہارے سامنے تمہاری اجازت کے بغیر بیٹھ گیا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ اگر کوئی کسی دوزخی کو دیکھنا چاہے تو وہ ایسے شخص کو دیکھے جو خود تو بیٹھا ہو اور لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔''

خلیفۂ وقت ہشام بن عبدالملک کو تابعی حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کی یہ باتیں بہت پسند آئیں۔ اُس نے آپؒ سے معافی طلب کی۔ حضرت طاؤسؒ اُٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے ہوئے فرمایا ''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ دوزخ میں پہاڑ کے برابر سانپ اور اونٹ کے برابر بچھو ہیں وہ سب ایسے حاکم اور امیر کی راہ دیکھتے ہیں جو رعایا پر عدل نہ کرے۔''

دھوئیں سے بھرا محل

ایک ایسا عالی شان، پُر شکوہ اور پُر جلال محل تعمیر کیا گیا اور اس کی تزئین وآرائش اس طور کی گئی کہ دنیا میں کسی نے دیکھی نہ سنی۔ محل مکمل ہوا تو بادشاہ کو اس امر کی اطلاع دی گئی۔ وہ مصاحبوں اور وزیروں کے ہمراہ محل پہنچا۔ وہ اس کے ایک ایک گوشے کو نگاہ حیرت اور احساس مسرت سے دیکھنے میں مگن

تھا کہ اچانک اس نے اپنے مقربین سے پوچھا ''آپ لوگوں کا کیا خیال ہے اس محل میں کوئی خامی تو باقی نہیں رہ گئی؟''

سب نے یک زبان ہو کر کہا ''بادشاہ سلامت! رب کائنات آپ کا اقبال بلند رکھے۔ یہ محل تو ایسا ہے کہ چشم فلک نے آج تک اس جیسا نہیں دیکھا ہوگا۔ اس کی رعنائی و زیبائی آنکھوں کو خیرہ اور دل و دماغ کو معطر کیے دیتی ہے مگر عالی پناہ! اس میں ایک نقص ضرور ہے وہ یہ کہ اس کے ایک کونے میں ایک جھونپڑی ہے جس کے روزن سے صبح و شام دھواں نکل کر محل کے ایوانوں کو گدلا کر رہا ہے۔ اس جھونپڑی کو یہاں سے ختم کر دیا جائے تو پھر یہ محل بالکل بے داغ اور بے نقص ہو جائے گا۔''

بادشاہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے مہر سکوت توڑا تو بولا ''صاحبو! یہ جھونپڑی ایک بڑھیا کی ہے جس نے اپنی تمام عمر اس ہی میں بسر کی ہے۔ اب وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ میں نے اس محل کی تعمیر کی ابتدا کے وقت اس بڑھیا کو کہلا بھیجا تھا کہ جھونپڑی کی یہ جگہ میرے ہاتھ بیچ دے اور منہ مانگی قیمت لے لے اگر یہ بات اسے منظور نہیں تو میری پوری سلطنت میں جہاں کہیں بھی وہ چاہے اور جس قسم کا بھی اعلیٰ مکان چاہے اس میں اپنا ڈیرہ جما لے۔''

بادشاہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''مگر میری اس پیش کش کا بڑھیا نے یہ جواب دیا ''اے حاکم وقت! یہ جگہ میری ملکیت ہے۔ میں یہیں پیدا ہوئی اور یہیں مروں گی۔ یہ جیسی بھی ہے لیکن میں اس سے مانوس ہو گئی ہوں۔ میں جب یہ دیکھ کر کہ تیرے پاس اتنا بڑا ملک ہے بُرا نہیں مناتی اور تجھے کسی اور جگہ جانے کو نہیں کہتی تو پھر اس غریب بڑھیا کی کٹیا کو دیکھنا گوارا کیوں نہیں کرتا؟'' بڑھیا کی اس بات نے مجھے از حد متاثر کیا اور میں خاموش ہو گیا حتیٰ کہ محل تعمیر کے مراحل سے ہوتا ہوا تکمیل تک پہنچ گیا۔''

بادشاہ نے مزید بتایا ''اب جو اس بڑھیا کی کٹیا سے دھواں نکل کر محل کو داغدار کرنے لگا تو میں نے پھر اسے پیغام بھیجا کہ اے بڑھیا! دھواں کیوں نکالتی ہے؟ کہنے لگی کہ کھانے پکاتی ہوں۔ میں نے اس کے لیے بھنے ہوئے مرغ اور اعلیٰ پکوان بھیجے اور کہلا بھیجا کہ اے اماں! میں روزانہ تجھے قسم قسم کے کھانے بھیجتا رہوں گا۔ تو اپنی جھونپڑی میں آگ جلانا چھوڑ دے۔''

میرے ان کھانوں کو بڑھیا نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اے بادشاہ ملک میں کتنے لوگ فاقہ زدہ ہیں اور سوکھی روٹی کے ایک نوالے کو ترس رہے ہیں اور میں بھنے ہوئے مرغ کھاؤں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ رب ذوالجلال سے ڈرتی ہوں کہ ستر سال تک تو جو کی روٹی کھائی اور اب آخری عمر میں بھنے ہوئے مرغ کھاؤں۔

بڑھیا نے مزید کہا ''اے بادشاہ! میری کٹیا کو قائم رہنے دے کیونکہ یہ تیرے عدل کی گواہی دے گی۔ امرا اور حاکم جب یہ دیکھیں گے کہ تو نے ایک غریب بڑھیا کی جھونپڑی پر ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کیا تو وہ بھی رعایا کی املاک پر قبضے سے باز رہے ہیں۔ تیرا محل اس ناپائیدار دنیا میں ایک عرصہ کے بعد ویران ہو جائے گا مگر میری کٹیا کی کہانی تیرے عدل کی شہادت قیامت تک دیتی رہے گی۔''

بادشاہ نے اپنے مصاحبین کو مزید بتایا ''مجھے بڑھیا کی یہ بات بہت پسند آئی اور یوں میں نے بڑھیا کی کٹیا کو یہیں رہنے دیا ہے تا کہ تاریخ میں یاد رکھا جائے کہ نوشیرواں بادشاہ اور ایک غریب بڑھیا آپس میں قریبی ہمسائے تھے۔'' ◆◆◆

کرن کرن سورج

ایک انسان کو زندگی میں بااعتماد ہونے کے لیے یہ حقیقت ہی کافی ہے کہ اس سے پہلے نہ تو کوئی اس جیسا انسان دنیا میں آیا نہ اس کے بعد ہی کوئی اس جیسا آئے گا۔ یہ عظیم انفرادیت ہی بہت بڑا نصیب ہے۔

سب سے پیارا انسان وہ ہوتا ہے جس کو پہلی ہی بار دیکھنے سے دل یہ کہے ''میں نے اسے پہلی بار سے پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔''

۵۸۔ ویسٹ اسٹریٹ
ٹورنٹو۔ کینیڈا

آنٹی الیزا! اپنے بھانجے کا سلام قبول کیجیے۔

میں نے آپ کی تازہ ترین فلم ''قلوپطرہ اور جولیس سیزر'' دیکھی۔ آپ کی اداکاری، رقص اور فنی مہارت دیکھ کر میں اش اش کر اٹھا۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب آپ یہاں کالج میں پڑھتی اور ٹی وی پر رقص کا پروگرام پیش کرتی تھیں۔ اب آپ ہالی ووڈ جا کر ایک مشہور و معروف ہیروئن بن گئی ہیں۔ آج سے دس سال قبل کس کو آپ کے ستارہ اقبال طلوع کی خبر تھی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ بڑے سے بڑا ماہر نجوم بھی فلمی ستاروں کے بارے میں صحیح پیش گوئی نہیں کر سکتا۔

آنٹی! میں اپنی موجودہ ملازمت سے سخت بیزار ہوں۔ دن بھر کمپنی کا نامۂ اعمال لکھنا، شکایات نمٹانا، میٹنگ ڈائریکٹر کے لیے خورونوش کا انتظام کرنا اور روزانہ شام کے وقت میم صاحب کو شاپنگ کرنے لے جانا۔ خاص طور پر آخری کام تو نہایت ہی پریشان کن ہے۔ قصہ مختصر، میری پیاری آنٹی! اب آپ مجھے اپنے پاس بلا کر اداکار بنا دیں۔ میرے چھ تازہ ترین فوٹو منسلک ہیں۔

جلد عنایت کا امیدوار
آپ کا دور افتادہ بھانجا
سی۔ سی۔ الفریڈ

ویسٹ گرین
ہالی ووڈ

میں یہ خط آپ کے جواب میں مس لارین الیزا کی جانب سے لکھ رہی ہوں۔ خط پڑھ کر وہ بے حد مسرور ہوئیں۔ لیکن انہیں افسوس ہے کہ وہ فلم لائن میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ اداکاری کے لیے پاٹ دار آواز، رونا، ہنسنا یا جوڈو کراٹے ہی کافی نہیں۔ یہاں لومڑی کی عقل، گرگٹ کی رنگارنگی، مگرمچھ کے آنسو، عقاب کی نگاہیں، چیتے کی پھرتی اور کروڑ پتی کی قسمت چاہیے۔

ان کا مشورہ ہے کہ آپ اپنے موجودہ کام پر ہی قناعت

کریں۔

نیک خواہشات کے ساتھ
آپ کی مخلص
مس ٹی ٹی شاٹرلی
پرائیویٹ سیکرٹری

۵۸۔ ویسٹ اسٹریٹ
ٹورنٹو۔ کینیڈا

میری پیاری پیاری خوبصورت آنٹی!

آپ کی پرائیویٹ سیکرٹری کا خط ملا۔ آج کل تمام عورتوں کو کمپلکس ہے، کسی کو حسن و جمال کا اور کسی کو عقل و کمال کا۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ کی پرائیویٹ سیکرٹری کو تمام جانوروں کے نام، کام اور شاید دام تک یاد ہیں۔ کیا وہ پہلے کسی چڑیا گھر میں ملازم تھی؟

آنٹی! میں پرائیویٹ سیکرٹریوں کے خطوط کو اہمیت نہیں دیتا۔ کیا آپ اتنی عدیم الفرصت ہیں کہ دو چار سطریں نہیں لکھ سکتیں؟ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ خود لکھتیں تو یہ انگریزی ادب اور مجھ بے ادب پر بڑا احسان ہوتا۔ میں آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کیے بیٹھا ہوں۔ اب آپ اتنی کامیاب اور مقبول ہیروئن بن گئی ہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

آپ کے پاس لومڑی کی عقل، عقاب کی نگاہیں اور مگرمچھ کے آنسو، سب ہی کچھ موجود ہیں۔ کیا آپ انہیں میرے لیے استعمال نہیں کر سکتیں؟ رات میں نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں، تمہاری خالہ تم سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ تم فوراً ان کے پاس جاؤ۔ وہ تمہیں مایوس نہیں کریں گی۔

آپ کا سعادت مند بھانجا
سی۔ سی الفریڈ

۲۷۔ ویسٹ گرین
ہالی ووڈ

مائی ڈیئر الفریڈ!

تمہارا دوسرا خط ملا۔ تم نے اپنی مرحومہ ماں یعنی میری بہن کا حوالہ دے کر مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے پاس بلالوں۔ فوراً یہاں آجاؤ۔ میں تمہیں فلم لائن میں موقع دلانے کی کوشش کروں گی۔

تم نے میری پرائیویٹ سیکرٹری کے بارے میں بے ہودہ باتیں لکھ کر اچھا نہیں کیا۔ یہ دنیا ہی ایک جانور خانہ ہے، خصوصاً فلمی دنیا۔ وہ ایک مشہور ڈائریکٹر کی تیسری بیوی کی فرسٹ کزن ہے۔ اور ایک فلم پروڈیوسر کی سابقہ محبوبہ۔ اس کی سفارش تمہارے لیے بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر تم ہالی ووڈ آنا چاہتے ہو تو فوراً ایک خط لکھ کر اس سے معافی مانگو۔

اپنی آمد کے بارے میں بذریعہ فون یا فیکس مطلع کر دینا۔ میں ہوائی اڈے پر نہ آسکوں گی۔ میرے بنگلے کا نمبر اوپر لکھا ہوا ہے اور ہاں، ایک بات اور یاد دلا دوں۔ فی الحال تنہا ہی آنا۔ جب تم یہاں اپنے پاؤں جما لو، تب بیگم کو بھی بلا لینا۔

اگلے اتوار کو "ایکسکیوزمی ڈارلنگ" کی شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ "ٹیکسی اینڈ لیڈی" مکمل ہونے والی ہے۔ "مریخ میں ایک رات" کا کنٹریکٹ سائن ہونے والا ہے۔ مسٹر ڈی سلور کنگ اس فلم کے پروڈیوسر بھی ہیں اور ڈائریکٹر بھی۔ انہیں چند نئے چہروں کی تلاش ہے اگر تم جلدی آجاؤ تو شاید اس فلم میں موقع مل جائے۔

تمہاری خیر خواہ آنٹی
مس لارین الیزا

۵۸۔ ویسٹ اسٹریٹ
ٹورنٹو۔ کینیڈا

ڈیئر مس ٹی ٹی شاٹرلی!

میں اپنے اس خط کے لیے معذرت خواہ ہوں جس میں آپ کے متعلق چند نازیبا باتیں درج کر دی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ابھی کمسن ہیں اور بے انتہا خوبصورت بھی۔ آپ کا

تعلق ہرگز ہرگز چڑیا گھر سے کبھی نہیں رہا۔ کیا آپ مجھے اپنی ایک عدد حسین و دل نواز تصویر سے سرفراز فرمائیں گی؟ میں آپ سے ملاقات کا بے حد متمنی ہوں اور اس سے بھی زیادہ آپ کو دیکھنے اور باتیں کرنے کا۔ آخیر میں ایک بار پھر عرض کر دوں کہ میں آپ کی شان میں گستاخی کے الفاظ لکھنے پر بے حد نادم ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول فرمائیں گی۔

آپ کا نیاز مند
سی۔ سی۔ الفریڈ

ویسٹ گرین
ہالی ووڈ

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ آپ نے جس انداز میں مجھ سے معافی مانگی ہے اور جتنے خوبصورت الفاظ میں میرے حسن کی تعریف کی ہے۔ میں اس کے لیے آپ کی بے حد شکر گزار ہوں۔ میری نظر میں وہ شخص بے حد قابل قدر ہے جو اپنی غلطی کو فراخ دلی سے تسلیم کر لے۔ آپ کی آنٹی مس الیزا آپ کی آمد کی منتظر ہیں اور میں بھی۔ میں آپ کی کامیابی کے سلسلے میں چند قیمتی مشورے آپ کے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں لیکن اس کے لیے ملاقات اولین شرط ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی آپ سے ملاقات ہوگی۔

مس ٹی ٹی شاٹرلی
پرائیویٹ سیکرٹری

۵۸۔ ویسٹ اسٹریٹ
ٹورنٹو (کینیڈا)

ڈیئر مس شاٹرلی!

آپ کا پیارا پیارا خوبصورت خط دیکھ کر مجھ پر نشہ سا چھا گیا۔ اول تو مجھے کسی صورت یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسی معزز شخصیت جسے ہالی ووڈ کی فلمی دنیا میں بے پناہ اہمیت حاصل ہے، مجھ ناچیز کو ان الفاظ میں یاد کرے گی اور جب یقین آگیا کہ یہ الفاظ واقعی آپ ہی کے ہیں تو مجھے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔

آپ سے ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ اس قدر محبت بھرے الفاظ میرے لیے استعمال نہ کریں تو عین نوازش ہو گی۔ اگرچہ دل سے میں نہیں چاہتا کہ آپ کو اپنے حقیقی جذبات کے اظہار سے روک دوں۔

لیکن بے حد مجبور ہوں۔ آپ نے یقیناً میری بیوی کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ بے حد زبردست اور خونخوار عورت ہے۔ مجھ پر بڑی کڑی نگاہ رکھتی ہے۔ میرے خطوط اس کے ہاتھوں سے گزرتے ہیں۔ آپ کو یہ بات لکھنا ضروری تھا تاکہ آپ میری مشکل سمجھ سکیں۔ ہاں، اگر آپ خط لکھنا ضروری سمجھتی ہوں تو آئندہ کوئی مردانہ نام استعمال کریں۔ شکریہ۔

جہاں تک میری روانگی کا تعلق ہے میں جلد آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے خواب و خیال سے بھی بہت جلد۔

آپ کا نیاز مند
سی۔ سی الفریڈ

ویسٹ گرین
ہالی ووڈ

ڈیئر الفریڈ!

تمہارا تازہ ترین خط پاکر میں سخت الجھن میں مبتلا ہوگئی ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں اپنی دلی کیفیت سے تمہیں پوری طرح آگاہ کر دوں اور کبھی سوچتی ہوں کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ میں نے بہت غور کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ سب کچھ عیاں کر دوں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو۔

مجھے ایک شخص سے شدید محبت تھی اور وہ بھی مجھے بے پناہ چاہتا تھا۔ ستم ظریفی حالات کہ اچانک وہ ایک حادثے میں چل بسا۔ کچھ عرصے تک میں اس کی یاد میں پاگل رہی لیکن رفتہ رفتہ زندگی کے ہنگاموں میں گھل مل گئی۔ تمہاری تصویر نے

میرے دل کی دنیا میں ایک بار پھر ہلچل مچادی۔ عجیب اتفاق کہ تمہاری شکل وصورت میرے محبوب سے ہو بہو ملتی جلتی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا محبوب ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہے اور مجھے اپنے پاس بلا رہا ہے۔ جس قدر تمہارے آنے میں دیر ہو رہی ہے، میرا دل اتنا ہی بے چین ہوتا جا رہا ہے۔

میں اب تم سے ملنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ میرا دل اب کسی کام میں نہیں لگتا۔ کیونکہ ہر لمحہ تمہارا تصور میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ کئی بار میرا اپنی باس یعنی تمہاری آنٹی سے جھگڑا ہو چکا ہے۔ کل ہم دونوں میں شدید تلخ کلامی ہو گئی جس کے نتیجے میں میں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھی لہٰذا میرے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ جس کے لیے قربانی دی ہے، اس کے زیر سایہ پناہ لوں۔

بے شک تمہاری بیوی کسی بھی حالت میں یہ برداشت نہیں کرے گی لیکن یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے اور میں یہ دیکھنا چاہوں گی کہ تم میں قوت فیصلہ، ذہانت اور قوت عمل کی خداداد صلاحیتیں کس حد تک موجود ہیں۔ میں نے تمہاری ہدایت پر بالکل عمل نہیں کیا ہے یعنی بحیثیت مرد خط لکھنے پر۔ برخلاف اس کے میں نے سب کچھ صاف صاف لکھ دیا ہے۔ حالات بدل جانے کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہارا فلم لائن اختیار کرنا مناسب نہیں۔ میرے پاس بے شمار دولت ہے۔ ہم دونوں ایک عالیشان مکان خرید لیں گے اور تم کوئی کاروبار شروع کر دینا۔ مجھے امید ہے کہ تم میری اس تجویز سے اتفاق کرو گے۔

تمہاری مداح
مس ٹی ٹی شاٹرلی

ڈسٹرکٹ جیل
ٹورنٹو۔ کینیڈا

ڈیئر شاٹرلی!

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں تمہارے محبت نامے کا جواب اس قدر تاخیر سے دے رہا ہوں۔ دراصل میں سخت مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اس لیے وقت پر جواب نہ دے سکا۔

معاملہ یہ ہے کہ تمہارا پیارا پیارا خط میری بیوی کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ خط پڑھ کر چراغ پا ہو گئی اور غصے کے عالم میں میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ خط کو میرے قدموں میں پھینکتے ہوئے چلائی۔ ''یہ کس پاگل نے تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے؟''

''اب تک تو تم ہی مجھے پاگل اور بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی رہی ہو۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پر مذاق انداز میں کہا۔

''بکواس بند کرو۔ یہ کس چڑیل کا محبت نامہ ہے؟'' وہ گرجی۔

''میں تو فقط ایک ہی چڑیل سے واقف ہوں اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ اس کا خط نہیں ہو سکتا۔'' میں ابھی تک اصل معاملے سے لاعلم تھا۔

''تم مجھے چڑیل کہہ رہے ہو؟'' وہ حلق پھاڑ کر اتنی زور سے چلائی کہ میں سہم کر رہ گیا۔

''کیا آپ مجھے اس خط کے مندرجات سے آگاہ نہیں فرمائیں گی؟'' میں نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

''لو، خود ہی پڑھ لو! میں تمہیں اتنا گرا ہوا نہیں سمجھتی تھی۔ تم نے میری محبت کا اچھا صلہ دیا۔ یاد رکھو! میں بھی کوئی گری پڑی عورت نہیں کہ تم جو چاہو، سلوک کرو۔'' اور وہ پیر پٹختی، بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میں نے خاموشی سے خط اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ میری روح کیف و مسرت سے جھوم جھوم اٹھی۔ آہ۔ کیا خوبصورت الفاظ تھے اور کیا دل نشیں انداز بیان۔ ابھی میں اسی حسین تصور میں گم تھا اور دل میں خوش بھی کہ ''مصیبت'' اتنی آسانی سے ٹل گئی ہے کہ اچانک وہ ایک بار پھر نمودار ہوئی لیکن اب اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور رخ میری جانب۔

میں خوف و دہشت سے کانپنے لگا۔ اپنی تازہ محبت کا یہ انجام..... میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی اور تمہاری محبت کا ماتم کیا اور گڑگڑاتے ہوئے فریاد کی۔ ''میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ لڑکی خود ہی میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ خدارا مجھے معاف کر دو۔''

''تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔'' وہ دھاڑی۔ ''یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے۔ میں نے تمہارا وہ خط بھی پڑھ لیا تھا جس میں تم نے اس سے اظہار عشق کیا اور اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ آئندہ کسی مردانہ نام سے خط لکھے۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ تم اس سے جان چھڑانا چاہتے ہو لیکن میں بھی کوئی ترنوالہ نہیں ہوں۔ آج میں تمہیں دوسری دنیا میں پہنچا کر رہوں گی۔''

یہ کہتے ہی اس نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور قریب تھا کہ گولی چلا دیتی اچانک نہ جانے کیسے مجھے عقل آ گئی۔ یوں لگا جیسے میرے جسم میں کوئی برقی رو دوڑ گئی ہو۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور میرا ایک پیر اس کے سینے پر جا پڑا۔

وہ دیوار سے ٹکرائی اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا جسے میں نے جھپٹ کر اٹھا لیا۔ اپنی پوری شادی شدہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس کے مقابلے میں ایک بہتر پوزیشن میں تھا۔ میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا ''اگر تم نے اس سنہرے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ساری زندگی پچھتاتے رہو گے'' اور میں نے یہ موقع ضائع نہیں کیا۔ صرف دو گولیوں پر وہ ٹھنڈی ہو گئی۔

قصہ مختصر، اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں آج کل میں جیل میں ہوں۔ مقدمہ چل رہا ہے لیکن میرا وکیل بے حد گھاگ اور جہاں دیدہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد رہا ہو جاؤں گا۔ رہائی پاتے ہی دوڑ کر تمہارے پاس آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔

تمہارا اور صرف تمہارا
سی۔ سی۔ الفریڈ

سوچ کا سفر

☆ ہمیشہ اچھی بات سوچنا، کہنا اور سننا کیونکہ اچھی بات عمدہ سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ عمدہ سوچ اور اچھا ذہن صرف اچھے انسان کی ملکیت ہی ہو سکتا ہے۔

☆ ایسی بات کرو جس سے تم پہچانے جاؤ کیونکہ انسان اپنی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔ الفاظ کے پیچھے بھاگنے کے بجائے خیالات تلاش کرو۔

☆ اعتبار کسی دھمکی یا زبردستی سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو مقابل کی سوچ میں دھیرے دھیرے اُترتا ہے جیسے ڈھلتی رات کی مدھم تاریکی میں سورج کی نرم کرنیں دھیرے دھیرے اُتر کر تاریکی کا سینہ چیر دیتی ہیں۔

☆ خوبصورتی چہرے پر نہیں، ذہن میں ہوتی ہے جو انسان کو حسین بنا دیتی ہے۔

دیوارِ گریہ

یہود کا مقدس مقام جسے پانے کی خاطر وہ مسلمانوں کے قبلہ اوّل کو شہید کرنا چاہتے ہیں

حافظ نذر احمد

اِس کی عظمت نہ تو لمبائی چوڑائی کے سبب ہے، نہ غیر معمولی بلندی اور موٹائی کی وجہ سے! اس دیوار کی عالمگیر شہرت اس لیے بھی نہیں کہ یہ بہت مستحکم اور مضبوط ہے۔ یا اس کی تعمیر میں کسی خاص فن کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ دیوار گریہ کی شہرت اس کے نقش و نگار اور بیل بوٹوں کی وجہ سے بھی نہیں کیونکہ اس کے پتھروں اور تعمیری مسالے کے اندر بھی کوئی ایسی انفرادیت نہیں جن سے اسے کوئی خصوصیت حاصل ہوتی۔ اس کی عالمگیر شہرت کی وجہ دیوار کی مذہبی اور تاریخی حیثیت ہے۔ اس دیوار کے ساتھ طویل تاریخ وابستہ ہے جس میں عبرت کی ہزار داستانیں چھپی ہیں۔

دیوارِ گریہ کے نام

عربی زبان میں اس دیوار کا نام ''المبکٰی'' ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ ''دیوار گریہ'' ہے جس کے معنی ہیں آہ وزاری والی دیوار۔

دیوار گریہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہودی یہاں پہنچ کر آہ وبکا اور گریہ وزاری کرتے تھے۔ اگر کسی کو کسی وقت رونا نہ بھی آتا تو جھوٹ موٹ رسم پوری کرنے کے لیے کم از کم رونی شکل ضرور بنا لیتا۔ بے ساختہ اور بلا وجہ رونا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ ہنسی ہو یا گریہ، یہ تو قلبی اور وارداتی کیفیت ہے جو یونہی سرزد نہیں ہوتی۔

جب یہودی مصنوعی طور پر دیوار گریہ کے قریب پہنچ کر رونی شکل بناتے تو اُن کی اس مضحکہ خیز صورت سے دیکھنے والے کو بے ساختہ ہنسی آجاتی۔ خصوصاً جبکہ سامنے یہ سائن بورڈ بھی آویزاں ہو: ''یہاں ہنسا منع ہے۔''

نیرنگی گردش دوراں دیکھیے کہ کل تک جو یہودی روتے تھے اور دس بیس سال سے نہیں، صدیوں سے روتے چلے آرہے تھے، آج وہ ہنس رہے ہیں اور اس ارض پاک کے امین مسلمان عرب اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی ''بڑا'' ان مظلوم مہاجرین فلسطین کا داد گیر نہیں۔

دیوار گریہ کو ان ناموں کے علاوہ ''دیوار مغربی'' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں چونکہ یہ حرم کے مغربی حصّہ کی دیوار ہے۔ بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ مغربی دیوار کے بیرونی حصے کا

نام دیوار گریہ ہے۔

دیوار گریہ کا شہر

دیوار گریہ کی تفصیلات اور متعلقہ عمارت کے حالات سے بل شہر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جہاں یہ تاریخی دیوار واقع ہے۔

فلسطین کی ارض پاک انبیاءؑ کی سرزمین ہے۔ اس کے چپہ چپہ پر انبیاء و مرسلین (علیہم السلام) کے نشانات موجود ہیں۔ گزشتہ قوموں کے آثار یہاں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اس خطے کے کھنڈرات یہاں کی اُجڑی ہوئی بستیاں، وادیاں، پہاڑ اور دریا غرض ہر شے اپنے دامن میں ایک مکمل تاریخ چھپائے ہوئے ہے۔ ارض مقدس فلسطین کا مشہور اور قدیم ترین شہر ''بیت المقدس'' ہے جس کے حرم کی مغربی دیوار کے بیرونی حصے کا نام دیوار گریہ ہے۔ اس شہر کے لفظ ''مقدس'' کا تلفظ دو طرح سے ہے مُقَدّس (میم پر پیش قاف پر زبر۔ دال پر تشدید) اور دوم مَقْدِس (میم پر زبر، قاف پر جزم اور دال پر زیر)۔ دوسرا تلفظ زیادہ صحیح ہے۔ اختصار کے ساتھ اسے ''القُدس'' بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں ''یروشلم'' کہلاتا ہے۔

القدس شہر میں ایک مقدس تاریخی عمارت واقع ہے جو صدیوں سے مختلف قوموں کا قبلہ چلی آتی ہے۔ یہ مسجد اقصیٰ اور حرم شریف کے ناموں سے مشہور ہے۔ یہ یہود کا قبلہ تھا اور اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کا بھی قبلہ رہا۔ ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں اور پھر مدینہ میں آنے کے بعد سولہ ماہ تک رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے، اس لیے اسے قبلہ اوّل کہتے ہیں۔

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کیے ہوئے دوسرے سال کا چوتھا مہینا تھا کہ مسلمانوں کو قبلہ کی تبدیلی کا حکم ملا۔ عین نماز کے دوران وحی نازل ہوئی اور مسلمانوں نے اسی وقت حضور اکرم ﷺ کی اتباع میں مسجد اقصیٰ سے بیت اللہ کی طرف رخ کر لیا۔

دیوار گریہ کا حرم

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے نبی بن کر آئے۔ یہ قوم یہودیوں کے نام سے مشہور ہے۔ وہ برسوں اس قوم کو ساتھ لیے صحرائے سینا میں پھرتے رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے اپنی قوم کے لیے ایک خیمۂ عبادت بنایا۔ یہ خیمہ ۴۵ فٹ لمبا، ۵ فٹ چوڑا اور ۱۵ فٹ اونچا تھا۔ اس خیمہ کے قیام عبادت میں ''عودسوز'' اور ''تابوتِ سکینہ'' کی جگہ تھی۔ تابوت سکینہ ۴ء۵×۲ فٹ تھا۔ اس کی بلندی ۲ر فٹ تھی۔ اس میں صحائف الواح (تختیاں) اور من وسلویٰ رکھے ہوئے تھے۔ یہ یہود کی مقدس ترین یادگاریں تھیں۔

حضرت طالوتؑ کے وقت یہ خیمہ ایسے ہی رہا۔ اس زمانے میں یہود اس کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے تھے۔ گویا یہ خیمہ ان کا قبلہ تھا۔ ۹۴۸ قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام نے خیمۂ عبادت کو شہر بیت المقدس میں کوہ صیہون پر ایک جگہ مستقل طور پر نصب کر دیا۔ اس جگہ کا نام ''بیت ایل'' پڑ گیا۔ یعنی اللہ کا گھر۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ سے ہمکلامی فرمائی۔

۸۸۹ قبل مسیح (طوفان نوحؑ کے ۱۰۴۸ سال بعد)

حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس خیمۂ عبادت کی جگہ ہیکل کی مستقل عمارت بنوائی۔ کہتے ہیں ہیکل کی عمارت بیس سال میں مکمل ہوئی۔ توریت کا بیان ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کام پر ستر ہزار باربردار، اسی ہزار سنگ تراش اور تین ہزار چھ سو ان کے نگران مقرر کیے تھے۔ (ملاحظہ ہو کتاب ۲ تواریخ باب ۲) اس وقت دنیا کے بہترین کاریگر، معمار، بخار، لوہار، سنگ تراش اور نقاش اس کام پر لگا دیے گئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ ہیکل کا طول ۶۰ر ہاتھ تھا اور عرض ۲۰ر ہاتھ۔ اس کے سامنے والے علاقے کا عرض ۲۰ر ہاتھ اور بلندی ۱۲ر ہاتھ تھی (توریت مقدس

۲۔تواریخ ۳:۴)

حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے شان وشوکت والے تھے‘ انہوں نے ویسا ہی شاندار ہیکل تعمیر کیا۔ دور دور سے عمدہ قسم کے پتھر منگوائے۔ بہترین عماراتی لکڑی لبنان سے منگوائی۔ توریت مقدس کی دو مستقل کتابوں میں تعمیر ہیکل کی تفصیلات موجود ہیں (ملاحظہ ہو کتاب ۲ تواریخ باب اوّل سے باب ۸ نیز کتاب اسلاطین باب ششم از اوّل تا آخر)

حرم پر کیا گزری؟

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ۴۱۵ سال بعد پانچ صد سال قبل مسیح کا واقعہ ہے کہ بابل سے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر دیا۔ اس نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تبرکات کو لُوٹ لیا۔ کتب مقدسہ نذر آتش کر دیں اور ہیکل کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ بخت نصر کے اس حملے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یادگار‘ داؤد نبی علیہ السلام کی نشانی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بنا کردہ تعمیر صفحۂ ہستی سے یکسر نابود ہو گئی۔

سترہ سال بعد خسرو شاہ ایران بابل پر فتح یاب ہوا۔ اس کی فتح مندی سے یہودیوں کو آزادی نصیب ہوئی اور ہیکل کی عمارت ازسرِ نو تعمیر ہوئی۔ اس طرح یہود کے مردہ جسم میں پھر زندگی کی ایک حرارت آ گئی۔

لیکن اٹھانوے سال بعد (۱۸۶ق م) ایک بار پھر اس گھر پر تباہی آئی۔ انطاکیہ کے یونانی بادشاہ اینوٹینس نے شہر پر قبضہ کر لیا اور ہیکل کو بت کدہ میں بدل ڈالا۔ اس مرتبہ کتاب مقدس کا واحد نسخہ بھی نذر آتش ہو گیا اور یہودی بالکل لاوارث بن کر رہ گئے۔ اب نہ دنیا ان کے پاس رہی نہ دین۔

آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے۔ بیت المقدس سے چار میل کے فاصلے پر ناصریہ کے قصبے میں ان کی پیدائش ہوئی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس شہر کے اردگرد کے علاقے کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا۔ یوں ایک بار پھر یہاں رونق آ گئی اور رشد و ہدایت کے ترانے بلند ہونے لگے لیکن یہ خوش آئند بات بھی بہت جلد ختم ہو گئی۔

۷۰ء میں رومی سپہ سالار ططوس نے بیت المقدس پر شدید حملہ کر کے ہیکل کو بالکل مسمار کر دیا۔ لاکھوں یہودی تہ تیغ کر دیے اور جو زندہ بچے انہیں جلاوطن کر دیا۔ شہر کی تباہی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ططوس نے شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل پھروا دیے۔

تین صدی بعد کچھ عرصہ کے لیے حالات نے ایک بار پھر پلٹا کھایا یعنی ۳۱۲ء میں شہنشاہِ روم قسطنطین اعظم نے عیسائیت قبول کر لی۔ اس سے بنی اسرائیل کو کچھ تقویت حاصل ہوئی لیکن یہ دور بھی تادیر قائم نہ رہا۔ تین سو سال بعد رومۃ الکبریٰ کی سطوت پھر پارہ پارہ ہو گئی اور ارضِ مقدس پر شہنشاہ ایران کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ساتویں صدی عیسوی میں ظہور اسلام ہوا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مبارک عہد میں جنگ کے بغیر بیت المقدس مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا اور اس سرزمین پر اسلام کا نیّر تاباں جلوہ فگن ہوا۔

حرم اسلامی دور میں

ہجرت کے پندرہویں سال یعنی ہیکل کی آخری تباہی کے ۵۶۹ سال بعد ۶۳۶ء میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بیت المقدس فتح ہوا۔ تاریخ میں اسلام کی اس فتح کو دنیا کی ایک بے مثال فتح قرار دیا گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلامی افواج شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں اور شہر فتح نہیں ہو رہا تھا۔ محاصرہ طول پکڑ گیا۔ یہاں تک کہ قلعہ کے محصورین نے سپہ سالارِ افواج اسلامی کو پیغام بھیجا۔ ”ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ ہمارا قلعہ فتح ہو کر رہے گا لیکن کس کے ہاتھوں؟ اس میں تردّد ہے۔ اگر ہم تمہارے بادشاہ کو دیکھ لیں اور اس میں وہ نشانیاں پا لیں جو ہمارے مذہبی نوشتوں میں لکھی ہیں تو کسی جنگ کے بغیر شہر اس کے حوالے کر دیں گے۔“

محصور اہل کتاب کی یہ پیش کش مدینہ منورہ بھیج دی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ارضِ مقدس کی طرف چل پڑے۔ اس فاتحِ اعظم کی ہمرکابی میں نہ کوئی فوج تھی نہ کوئی محافظ دستہ۔ صرف ایک غلام ساتھ تھا اور دونوں کی سواری کے لیے فقط ایک اونٹ تھا۔ باری باری آقا و غلام اس پر سوار ہوتے اور منزل طے کرتے۔

شہر قریب آیا تو باری غلام کی تھی۔ اس نے ہر چند چاہا کہ آپ سوار ہو جائیں مگر عدلِ فاروقی نے گوارا نہ کیا‘ انھیں غلام کا حق چھیننا منظور نہ ہوا۔ غلام سوار تھا اور آقا اونٹ کی مہار پکڑے پیدل چل رہا تھا۔ جسم پر پھٹے پرانے وہی پیوند لگے کپڑے تھے۔ اللہ اکبر! اسلامی اخوت و مساوات اور سادگی کا یہ منظر کیسا روح پرور ہو گا۔

عظیم اسلامی خلافت کے سربراہ، فاتح اعظم امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر اہلِ قلعہ کی نظر پڑی تو انہوں نے بلا پس و پیش قلعہ کا پھاٹک کھول دیا۔ شہر کی چابیاں اُسقفِ اعظم سفرونیس نے اپنے ہاتھ سے خود پیش کیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز ادا کرنے کے لیے جگہ دریافت کی۔ پادریوں نے ہیکل کی اُجڑی ہوئی جگہ کا نشان دیا۔ یہاں اب کھنڈرات کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ نے وہاں نماز ادا کی۔ اسی جگہ حرم کے ڈیڑھ ہزار فٹ لمبے اور ایک ہزار فٹ چوڑے احاطہ کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اس کے اندر زیتون اور سرو کے درخت لگائے گئے۔ ایک حصہ پر چھت ڈال دی گئی۔ یہ جگہ نماز کے لیے مخصوص ہو گئی۔ اسے مسجد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

دیوار گریہ کا مقام

حرم کے وسط میں ایک چبوترہ پر ایک مخروطی گنبد ہے جسے ”صخرۃ اللہ“ کہتے ہیں۔ اختصار کے طور پر اسے ”الصخرہ“ کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے ڈوم آف دی راک کہا جاتا ہے۔

حرم کے چاروں طرف حجرے بنے ہوئے ہیں۔ شمالی دیوار کے حجروں میں قدیم عربی یونیورسٹی تھی۔ یہیں طلبہ رہتے تھے۔ مگر اب یہ عظیم اسلامی درسگاہ بند ہے۔ جنوبی حصے میں ایک مختصر سا عجائب خانہ ہے جس میں قدیم تاریخی نوادرات موجود ہیں۔ مغربی دیوار سے ملحقہ ایک حجرے میں شریف حسین شریف مکہ کی قبر ہے اور اسلامیانِ پاک و ہند کے بطلِ جلیل مولانا محمد علی جوہرؒ مرحوم آرام فرما ہیں۔

اس مغربی دیوار کے بیرونی حصّہ کا نام ”دیوار گریہ“ ہے جس کا طول تقریباً ساٹھ فٹ ہے۔ دیوار کے نچلے حصہ میں بادشاہ ہیروڈ کے زمانے کے بڑے بڑے پتھر نہایت خوبصورتی سے لگے ہوئے ہیں۔ اوپر والے حصّہ پر رومی طرز کے بڑے بڑے پتھر لگے ہیں۔ دیوار پر جدید طرز میں بھی نقش و نگاری کی گئی ہے۔ نہایت دلآویز پھول اور بیل بوٹے بنائے گئے ہیں لیکن دیوار گریہ کی عظمت نہ ان پتھروں سے ہے نہ حسین نقش و نگار سے بلکہ اس کی اہمیت یہود کی تاریخ اور دینی نسبت سے ہے۔

دیوار گریہ اور یہود

یہودی مرد و زن مذہبی تہواروں کے علاوہ ہر ”سبت“ کو (ہفتہ کے دن) دیوار گریہ کی زیارت کے لیے جاتے تھے۔ خاص طور پر اگست کی تاریخ کو سروں پر ”تابوت سکینہ“ اٹھائے جلوس کی صورت میں یہاں آتے‘ خاص عبادات بجا لاتے اور رو رو کر دعائیں مانگتے۔ رونا نہ آتا تو پھر بھی رونی شکل بنا لیتے۔

جس زمانے میں فلسطین برطانیہ کے زیر اقتدار تھا‘ اس وقت یہودیوں نے دیوار پر اپنا حق ملکیت قائم کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ دیوار حرم کی ہے اور حرم کی تعمیر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں خود مسلمانوں نے کی تھی۔ مزید برآں ساڑھے تیرہ سو سال سے مسجد سیّدنا عمر رضی اللہ، حرم اور اس کی تمام متعلقہ عمارات مسلمانوں کے قبضے میں چلی آ رہی ہیں۔

یہود نے ۱۹۲۹ء میں انجمن اقوام عالم میں ”دیوار گریہ“ پر اپنی ملکیت کا دعویٰ دائر کیا۔ مجلس اقوام عالم نے اس مسئلے کو

طے کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ فریقین نے کمیشن کے سامنے اپنے اپنے دلائل وشواہد پیش کیے۔ کمیشن نے پوری چھان بین کے بعد یہ فیصلہ دیا: ''قانونی اور تاریخی اعتبار سے دیوارِ گریہ حرم کا ہی ایک حصّہ ہے جس پر مسلمانوں کا جائز قبضہ ہے اور ان کے مالکانہ حقوق بالکل درست ہیں۔ یہودیوں کو صرف اس قدر حق حاصل ہے کہ وہ اس کی زیارت کو یہاں آجا سکتے اور خاص تقاریب کے مواقع پر تابوت سکینہ لا سکتے ہیں۔''

برطانیہ کی دسیسہ کاری اور اقوام مغرب کی سازش سے فلسطین میں ایک انتہائی الم ناک صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ ۱۴۔۱۵۔ جولائی ۱۹۴۸ء کی درمیانی شب فلسطین کے ایک علاقے میں ''ریاست اسرائیل'' کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ خود شہر بیت المقدس کے کچھ حصّہ پر بھی یہودی کی اس نام نہاد حکومت کو قبضہ دلایا گیا۔ غالباً دنیا کی تاریخ میں اس سے بڑی کوئی بین الاقوامی سازش کبھی نہیں ہوئی۔

ان تمام باتوں کے باوجود مسجد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، حرم اور اس کی متعلقہ اور ملحقہ تمام عمارات الحمد اللہ بدستور مسلمانوں کے قبضے میں ہیں۔ تمام تر کوششوں کے باوجود یہودی اس پر قابض نہیں ہو سکے۔ اپنے دور میں مسلمانوں نے یہود کی تمام تر شرارتوں کے باجود انتہائی رواداری اختیار کی۔ جنگ کید وران میں بھی انہیں دیوار گریہ کی زیارت کی اجازت دی اور ماہ اگست کے ان ایام میں یہودی زائرین کی خاطر عارضی طور پر جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ اپنے حفاظتی پہرے کے ساتھ دیوار گریہ تک ان کے آنے جانے کے انتظامات کیے اور عبادات ورسوم کی ادائیگی کے بعد یہود کو ان کے کیمپ تک پہنچا دیا۔

عظیم المیہ

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہی یہودی جو دو ہزار سال اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کے مورد رہے، ہر قوم نے انہیں ٹھوکریں ماریں۔ جس ملک میں پناہ لینے گئے، وہاں سے ذلیل کر کے نکالے گئے۔ صدیوں دیوارِ گریہ کے سایہ میں آکر روتے رہے اور مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ہمیشہ ان سے رواداری کا ثبوت دیا۔ جون ۱۹۶۷ء میں اسی قوم نے دنیا کی مسلم دشمن طاقتوں کی مدد لے کر عربوں پر قیامت ڈھا دی۔ بیت المقدس پر ناجائز قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کے سینوں میں ایک ناسور پیدا کر دیا۔

اس وقت سے یہودی حرم کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مارچ ۱۹۸۳ء میں ایک دن اچانک چند سر پھرے دہشت گرد جنونی یہودیوں نے حرم پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اُن کی برابر یہی سعی رہتی ہے کہ وہ حرم شریف کو نیست ونابود کر کے دیوار گریہ اور ہیکل سلیمانی کا احیا کر دیں۔

حرم جانے والے راستوں پر رکاوٹیں کھڑی کرنا اسرائیلی حکومت کا وتیرہ بن چکا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ مسلمانوں کو حرم شریف میں عبادت کرنے سے روکا جا سکے۔ افسوس کہ تفرقے اور عدم اتحاد کی وجہ سے اسلامی ممالک اسرائیل کی دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ نجانے مظلوم فلسطینیوں کی قسمت کب بدلے گی!

◆◆◆

دلوں کو میل

خلیل جبران کا گزر ایک دھوبی گھاٹ سے ہوا۔ وہاں ایک دھوبی کپڑے دھونے میں مصروف نظر آیا۔ خلیل جبران نے اس سے پوچھا ''تم کیا کرتے ہو؟''

دھوبی نے جواب دیا: ''میں کپڑوں سے میل کچیل نکالتا ہوں۔''

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' دھوبی نے جبران سے پوچھا۔

شوہر پر قابو پانے کے راز

نابید جعفر

ایک عاقل کے سنہری مشورے نے لڑائی جھگڑوں پر مٹی ڈال کر گھر کو مثل جنت بنا دیا

فوزیہ کا شوہر طاہر جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، وہ اس کے سلیپر اٹھا کر لپکی۔ نیچے بیٹھ کر اس کے جوتے موزے اتار کر چپلیں پہنا دیں پھر اسے شبینہ لباس اور تولیہ پکڑا کر کھانا لگانے چل دی۔ آج اس نے نرگسی کوفتے بنائے تھے۔ ساتھ میں سلیقے سے بنی ہوئی سلاد، رائتہ اور پودینے کی چٹنی تھی۔ نرگسی کوفتوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے دسترخوان مہک اٹھا..... فوزیہ کے ہاتھ سے بنے نرگسی کوفتے سارے خاندان میں مشہور تھے اور سب اس سے فرمائشیں کر کے پکوایا کرتے۔

طاہر اور تینوں بچے دسترخوان پر آکر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی طاہر نے ڈونگے میں چمچ ڈالا تو کوفتوں کو دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ ناک چڑھا کر بولا ''جب دیکھو کوفتے ہی پکے ہوتے ہیں، اس سے تو اچھا تھا قیمہ بھرے کر لیے پکا لیتی۔''

بھوک سے بے تاب فوزیہ نے ابھی پہلا نوالہ ہی منہ میں ڈالا تھا۔ وسیم کی بات سن کر منہ میں کڑواہٹ بھر گئی۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چیخ کر بولی:

''صبح میں نے آپ سے پوچھا تھا نا کہ آج کیا پکاؤں؟ اس وقت تو زبان ہلا کر نہ بولے، اب نادر شاہی حکم جاری کر رہے ہیں..... میرا کیا جاتا..... جتنی محنت کوفتوں پر ہوئی ہے اس سے کم محنت میں کریلے پک جاتے..... مگر آپ کو تو عادت ہوگئی ہے بے وقت کی راگنی الاپنے کی۔''

فوزیہ کی بلند آواز اور سخت لہجے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ طاہر نے غصے سے لال پیلا ہو کر سالن کی پلیٹ اٹھا کر دور پھینک ماری..... اور دھاڑ کر بولا ''خود ہی کھاؤ یہ کوفت کے

گولے، میرے لیے آملیٹ بنا کر لاؤ۔"

فوزیہ بمشکل غصے پر قابو پاتے ہوئے اٹھی اور جلتی بھنتی آملیٹ بنانے لگی۔ پھر آملیٹ کی پلیٹ اس کے آگے پٹخ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور بڑبڑانے لگی "سارا دن ہڈیاں رگڑو، ایک سے ایک چیز پکاؤ اور ایک یہ نواب صاحب ہیں کہ نخرے ہی نہیں ملتے..... رزق اٹھا کر پھینکتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا خوف بھی نہیں آتا۔"

تلخ کلامی کی وجہ سے سارے گھر کا ماحول تلخ ہو گیا۔ بچوں نے بے دلی سے کھانا کھایا اور ادھر ادھر ہو گئے۔ فوزیہ بستر میں لیٹ کر آنسو بہانے اور سوچنے لگی..... نہ جانے ہمارے ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے..... پہلے تو طاہر بڑے خوش مزاج ہوا کرتے تھے..... اب دن بدن زہر میں بجھتے جا رہے ہیں۔

ہر بات پر کاٹ کھانے کو دوڑنا..... مغلظات بکنا..... برتن توڑنا، کھانا اٹھا کر پھینکنا ان کی گھٹی میں پڑ گیا ہے۔ ہر وقت کی بک بک سے بچے بھی سہمے رہنے لگے ہیں اور میرے اعصاب بھی کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

"آخر اس کا سبب کیا ہے؟" فوزیہ نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ایک دم اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ "جادو....." کہیں کسی نے ان پر جادو تو نہیں کروا دیا۔ پھر اس کے ذہن کی سوئی ایک جگہ ہی جم گئی۔ ہو نہ ہو یہ جادو کا کمال ہے..... آج کل جگہ جگہ ایسے عامل بیٹھے ہوئے ہیں جو گندے عمل کے ذریعے کسی کا بھی جینا حرام کر دیتے ہیں۔

فوزیہ اپنے شوہر کی بہت خدمت کیا کرتی تھی۔ کبھی بے جا فرمائشوں سے اس کو پریشان نہ کرتی۔ زندگی میں جو کچھ ملتا صبر شکر سے گزارہ کیے جاتی اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

پہلے طاہر بڑا نرم خو ہوا کرتا تھا مگر اب بچوں کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتے اخراجات اور کمر توڑ مہنگائی نے مزاج میں برہمی پیدا کر دی تھی۔

فوزیہ ٹھنڈے مزاج کی عورت تھی۔ کبھی وہ اس کے غصے پر آنسو بہانے لگتی، کبھی خاموشی اختیار کر لیتی۔ طاہر خود ہی بک جھک کر چپ ہو جاتا۔ اس طرح بات دب جایا کرتی۔

مگر اب کچھ دنوں سے فوزیہ کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ بھی طاہر کے غصے کا برابر سے جواب دینے لگی تھی۔ وہ کہتی' حد ہوتی ہے ہر بات کی..... میں جتنا خاموشی سے سہتی ہوں یہ اتنا ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہر کام میں نقص نکالنا، بے ہودی بات پر چیخنا، چنگھاڑنا روز کا معمول بنتا جا رہا ہے۔ ہم سب کی زندگی میں زہر گھول کر رکھ دیا ہے۔

قدرتی بات ہے کہ جب ماں باپ آپس میں لڑیں تو بچوں پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ بچے اپنی ماں کے اوپر چیختے چلاتے باپ سے بددل ہوتے اور جب وہ طاہر کی بدسلوکی پر اسے برا بھلا کہہ کر اپنی بھڑاس نکالتی تو غیر محسوس طریقے سے ان کے دل میں بغاوت کا بیج بو دیا کرتی۔ یوں بچے باپ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے اور گھر کے ماحول میں تناؤ سا آ گیا۔

آخر اس جادو کا توڑ کیسے ہوگا..... سوچتے سوچتے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اچھا شازیہ باجی سے مشورہ کرتی ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی بہن کو فون ملا کر اپنی ساری پریشانی انہیں بتائی تو باجی نے کہا: "ایسا کرو کل تم میری طرف آ جاؤ۔ ہمارے گھر کے قریبی مدرسے میں ایک باعمل مفتی پردے کے پیچھے سے خواتین کے مسائل سنتے اور حل کے لیے کلام الٰہی پڑھنے کو بتاتے ہیں۔ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ ان شاء اللہ تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

اگلی صبح فوزیہ اپنی بہن کے ساتھ مفتی صاحب کے پاس جا پہنچی۔ انہیں شوہر کے غصے کی داستان سنا کر پوچھا "مفتی صاحب! پہلے تو وہ ایسے نہیں تھے۔ کیا ان پر کسی نے جادو کروا دیا ہے۔"

انہوں نے پوچھا "شوہر کے غصے کے وقت آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟"

فوزیہ بولی "ظاہر ہے میں بھی انسان ہوں..... کہاں تک برداشت کر سکتی ہوں۔"

مفتی صاحب بات کی تہ تک پہنچ چکے تھے۔ مسکرا کر بولے: "ان پر تو جادو کے اثرات ہیں لیکن میں آپ کو ایک جادوئی اثر جملہ بتاتا ہوں اور وہ ہے..... "معاف کر دیں' غلطی ہو گئی"۔ جب بھی آپ کے شوہر پر غصے کا دورہ پڑے، آپ یہ جملہ استعمال کریں، پھر دیکھیں اس جملے کا جادو....."

فوزیہ نے ان کی بات گرہ سے باندھ لی اور گھر آ گئی۔

ایک دن طاہر حسب عادت اس کی پکائی ہوئی روٹیوں پر آگ بگولہ ہونے لگا۔ "کیسی کچی پکی روٹیاں پکائی ہیں..... آٹا ڈھنگ سے گندھا ہو تو روٹی صحیح پکے گی ناں..... دھیان تو ٹیلی فون میں اٹکا ہوتا ہے..... دو الٹے سیدھے ہاتھ مارے اور آٹا رکھ دیا، جبھی تو اتنی سخت روٹی پکتی ہے کہ چبانا مشکل ہو رہا ہے۔"

فوزیہ نے چاہا کہ وہ بھی اپنا دکھڑا سنائے کہ گیس کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اتنی کم آنچ پر روٹی پکانی پڑتی ہے کہ لامحالہ اس نے پاپڑ ہی بننا تھا مگر دل پر جبر کر کے چپ بیٹھی رہی۔ اس کی طرف سے جوابی کارروائی نہ پا کر طاہر بکتا جھکتا کھانا کھاتا رہا اور کچھ پھینکنے، پٹخنے کی نوبت نہ آئی۔ یوں بات بڑھنے سے پہلے ہی دب گئی۔

کھانے کے بعد فوزیہ طاہر کی پسند کے مطابق گاڑھی چائے بنا کر اس کے پاس آئی اور مسمسی سی صورت بنا کر بولی۔ "غلطی ہو گئی' معاف کر دیں"۔

یہ الفاظ اس کے غصے کی بھڑکتی آگ پر ٹھنڈی، نرم پھوار کی طرح برس پڑے اور وہ جو چہرے پر چٹانوں جیسی سختی لیے بیٹھا تھا' ایک دم نرم پڑ گیا اور بولا:

"میں تو تہیہ کیے بیٹھا تھا کہ آج تمہاری خوب خبر لوں گا مگر اب تو بات ہی ختم ہو گئی..... جاؤ معاف کیا۔"

فوزیہ اس جملے کا جادو دیکھ کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اور پھر جب اس نے اپنے شوہر کے بھڑکنے پر یہ جملہ استعمال کیا..... معاملہ وہیں دب گیا اور رائی کا پہاڑ بننے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ یوں اس کے گھر کی فضا پرسکون ہو گئی اور رفتہ رفتہ طاہر کا غصہ ختم ہو گیا۔

اب فوزیہ کو سارے معاملے میں اپنی غلطی نظر آئی..... واقعی دانا لوگوں کا درست کہنا ہے کہ جب شوہر غصے میں آئے تو بیوی کو خاموش رہ کر برداشت کرنا چاہیے۔ بعد میں کسی وقت اس کا اچھا موڈ دیکھ کر اپنی صفائی پیش کر دے' اس طرح بات کبھی حد سے نہیں بڑھے گی۔

ویسے بھی بے چارے مردوں کو روزی کمانے کے لیے کیسے کیسے سخت حالات سے نمٹنا پڑتا ہے۔ مرد کہتے ہیں کہ باہر ہم اگر سو لوگوں سے ملتے ہیں تو ان میں سے ننانوے ہمارے مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ اتنی سختیاں، ٹینشن سہہ سہہ کر جب گھر پہنچتے ہیں تو کڑواہٹ اور جھنجھلاہٹ گھر والوں پر ہی نکال سکتے ہیں۔

بیوی اگر حکمت عملی سے کام لے کر معاملہ سلجھا دے تو کتنا اچھا ہے۔ ورنہ شیطان تو غصے میں انسان کو گیند کی طرح گھما کر فتنہ فساد برپا کروا دیتا ہے۔

فوزیہ جب اپنے شوہر کے غصے کا ترکی یہ ترکی جواب دیتی' معاملہ خراب سے خراب ہو جاتا تھا مگر اب تحمل اور جادوئی اثر جملے نے اس کی زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلا دیے۔ پیاری بہنو! آپ بھی اس جادوئی اثر جملے سے اپنے شوہر کا جادو اتار سکتی ہیں۔ آزما کر دیکھ لیجیے۔

سوا سیر

ایک لڑکے نے کالج میں پہلے دن ایک لڑکی سے پوچھا: "آپ کی تعریف؟"

"مجھے سب بہن کہتے ہیں۔" لڑکی نے شرارت سے کہا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" لڑکے نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "مجھے سب بہنوئی کہتے ہیں۔"

بدتہذیبیاں

عائشہ جہانگیر

معاشرے میں پھیلی تکلیف دہ عادات کا بیان جو بداخلاقی کے زمرے میں آتی ہیں

بے حسی اور خودغرضی کی حقیقت عیاں کرتی فکر انگیز تحریر

دروازے

پر نہ جانے کون بے صبرا تھا جو گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر اُٹھانا ہی بھول چُکا تھا۔ آج چھٹی کا دِن تھا اور میں انتہائی پُرسکون موڈ میں چائے کے جرعے لیتی دن بھر کیے جانے والے کاموں کی فہرست دِل ہی دِل میں ترتیب دے رہی تھی۔ ملازمت پیشہ خواتین بلاشبہ قابلِ تحسین خوبیوں کی مالک ہوتی ہیں۔ عورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھا ہے کہ وہ بیک وقت کئی ذمہ داریوں سے بہ خوبی سبکدوش ہوسکتی ہے۔ وہ کھانا پکاتی، گھر کے کام انجام دیتی، بچوں کی تربیت کرتی، شوہر پہ توجہ دیتی اور ضرورت پڑنے پر ملازمت کرکے معاشی طور پر بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔

اتوار کا دِن گھر کے مختلف امور نمٹانے اور اگلے پورے ہفتے کی منصوبہ بندی کرنے میں کیسے گزر جاتا ہے پتا ہی نہیں چلتا۔ اسی کے پیشِ نظر میں بھی محدود وقت میں ڈھیر سارے کام نپٹا لینا چاہتی تھی کہ گھنٹی کی مسلسل آواز نے میری سوچوں کا محور توڑ دیا۔ بیزاری سے چائے کا کپ میز پر رکھ کر میں دروازے کی طرف چل پڑی۔ گھنٹی بجنا اب بند ہوچکی تھی اور ساتھ ہی میرے موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی۔

چلتے چلتے موبائل کان سے لگایا تو دوسری طرف میری ایک سہیلی تھی جس نے تقریباً چیختے والے انداز میں مجھے سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ کب سے دروازے پر کھڑی ہوں اور تم بے ہوش بیٹھی ہو۔ جلدی سے دروازے تک پہنچی اور جونہی دروازہ کھولا میری وہ سہیلی اپنے چار عدد بچوں اور دو قریبی کزنز کے ہمراہ جھپٹ کر اندر کی طرف لپکی۔

میں بے بسی اور بے چارگی سے قطار میں اندر آتے ''مہمانانِ گرامی'' کی شکلیں تکتی مَرے مَرے لہجے میں اسلام وعلیکم کہتی تقریباً ڈھے جانے کو تھی۔ پتا چلا کہ وہ صاحبہ پورے دِن کی پلاننگ کرکے آئی تھیں کہ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گی۔ شام کو چائے پینے کے بعد کسی قریبی عزیز کے گھر فنکشن میں مدعو تھیں۔ اُن کے عزیز کا گھر چونکہ میرے مکان سے نزدیک ہی تھا تو انہوں نے اپنے تئیں یہ بہترین حل سوچا کہ دن آرام سے میرے گھر گزار شام کو تازہ دم ہو یہیں سے تیار ہوکر اُس فنکشن میں جایا جائے تاکہ سفر کی کوفت اور تھکن سے اُن کی تیاری ماند نہ پڑ جائے۔

مجھے افسوس ہوا کہ انہوں نے قطعاً یہ زحمت نہیں کی کہ اپنا کوئی پروگرام بنانے سے پہلے مجھ سے رابطہ کرتیں اور میری مصروفیات اور وقت کے بارے میں معلوم یا میری تکلیف کا خیال ہی کرلیتیں۔ بغیر کسی اطلاع اور اجازت کے انہوں نے صرف اپنی سہولت کے بارے میں سوچا۔ اب کہاں کی منصوبہ بندی اور گھر کے کام کاج' سب دھرے کا دھرا رہ گیا اور میں اُن کی خاطر داریوں ناز برداریوں میں جُت گئی۔ بچوں نے جو اودھم مچایا سو الگ۔

شام ہوتے ہوتے میرا گھر کسی چڑیا گھر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ مہمانوں کا ٹولہ بھرپور دِن گزار کر اب فنکشن میں جاچکا تھا۔ میں جلتی کڑھتی رات ڈیڑھ دو بجے تک بکھرے گھر کو سمیٹنے میں لگی رہی۔ نتیجتاً اگلے دن سر درد اور بخار نے دفتر میں بھی مجھے بے زار و لاچار کیے رکھا۔

یہ صرف ایک گھر کا قصہ نہیں' اب تو تقریباً ہر جگہ اسی قسم کی صورتحال سے واسطہ پڑتا ہے۔ لوگ دوسروں کے آرام و سکون کا خیال کیے بغیر صرف اپنی خوشی اور آسانی کے لیے نہ صرف دوسروں کا سکون برباد کردیتے ہیں۔ بلکہ ان غیر اخلاقی حرکتوں کی وجہ سے لوگ انہیں ناپسند کرتے اور ان سے گریز کرنے لگتے ہیں۔

ذرا سوچیے کہ ہمارا مذہب ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ اگر کسی کے گھر جاؤ تو دستک دو۔ دروازہ نہ کھلنے یا جواب نہ آنے پر خاموشی سے لوٹ جاؤ اور شکوہ نہ کرو لیکن کیا ہم ان تعلیمات پر عمل پیرا ہیں؟ شاید نہیں۔ بلکہ ہم تو تب تک دروازہ پیٹے جاتے ہیں جب تک ساتھ والے مکان سے کوئی نکل کر یہ نہ کہہ دے کہ گھر پر کوئی نہیں اور صرف دروازے بجانے اور گھنٹیاں کھڑکانے پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا۔ گھر کے بچوں کے نام اونچی آواز میں پکارنا یا موبائل پر فون کرکے پوچھنا کہ اب تک دروازہ کیوں نہیں کھلا، یہ سب ہمارے لیے عام بات ہو چکی۔ جب کہ حقیقتاً یہ بہت بڑی بدتہذیبی اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔

پُرانے زمانے میں اگر خدانخواستہ کوئی رشتہ دار بیمار پڑ جاتا یا ہسپتال میں داخل ہوتا، تو پورا خاندان اور عزیز دوست اُس کی تیمارداری کرنا نہ صرف اپنا فرض اور عبادت سمجھتے بلکہ ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس نیکی میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ قریبی رشتہ دار مریض کے لیے طرح طرح کے پھل اور کھانے وغیرہ بھجوایا کرتے کیونکہ اُنہیں احساس ہوتا تھا کہ گھر والے پہلے ہی بے چارے مصیبت زدہ اور پریشانی میں گھرے ہوں گے لہٰذا اُن پر اضافی بوجھ نہ پڑنے دیا جائے۔ جب کہ آج کل صورتحال بالکل مختلف ہوچکی۔

اب اوّل تو کسی کے پاس تیمارداری جیسے ''فضول کام'' کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا اگر بھولے بھٹکے خیال آ بھی جائے تو بجائے یہ کہ مریض اور اُس کے گھر والوں کا بوجھ ہلکا کریں یا بانٹیں، اُلٹا اپنی مہمانداری کروائی جاتی ہے۔ مثلاً اب جو لوگ مریض کی عیادت کرنے آتے ہیں، وہ نہ صرف بے جا گفتگو، مایوسی کی باتیں، دوسروں کی اور اپنی بیماریوں کے تذکرے، عجیب و غریب ڈراوے دیتے دکھائی دیتے بلکہ بے تکے مشورے دینا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف گھر والے مریض کی عیادت کو آنے والوں کے کھانے پینے کی فکر میں ہی ہلکان ہوئے رہتے ہیں۔ عام طور پر عیادت کے لیے آنے والے مہمان کھانا کھائے بغیر تو جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔

دوسرے یہ کہ اگر وہ کوئی پھل یا جوس مریض کے لیے لے ہی آئیں تو جیسے ہی وہ پھل کاٹ کر مریض کے آگے رکھا جاتا ہے، مہمان خود بھی اُس میں یوں شریک ہوتے ہیں کہ بے چارہ مریض تو شاید ایک آدھ ہی چکھ پاتا ہو۔ یوں اپنے لائے ہوئے پھل و جوس پر آدھے سے زیادہ تو خود لانے والا ہی ہاتھ صاف کرکے اُٹھتا ہے۔

دوسری بدتہذیبی یہ کہ اگر مریض سو رہا ہو، یا اُس کے آرام کا وقت ہو تو اُس کے سرہانے اونچی آواز میں گفتگو جاری رکھنا، جمگھٹے کی صورت اُس کے اردگرد بیٹھے رہنا انتہائی تکلیف دہ عمل ہے۔ نہ صرف مریض بلکہ اُس کے گھر والوں کے لیے بھی۔ اکثر تو بُرا مان جاتے ہیں کہ ہم اتنی دور سے ملنے اور حال پوچھنے کے لیے آئے اور ہمیں کہا جا رہا ہے کہ مریض سو رہا ہے۔ اُسے جگانے اور ملنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر

مریض کے سامنے اپنی ''حاضری'' نہ لگائی تو اُن کا آنا اور احسان جتانا سب بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

ایک اور قابلِ ذکر بدتہذیبی جو گھر گھر میں نظر آتی ہے، وہ ہے دوسرے کی پرائیویسی کا خیال نہ رکھتے ہوئے اُس کے انتہائی نجی معاملات میں دخل اندازی کرنا۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہماری ایسی حرکتوں سے سامنے والا کس قدر رنج اور اذیت میں مبتلا رہتا ہے۔ کہنے کو تو ہم ترقی کر رہے ہیں۔ جدید تعلیم و ٹیکنالوجی کے حامل معاشرے میں ہماری پرداخت جاری ہے لیکن نہ جانے یہ کیسی ترقی ہے جو ہمیں اخلاقیات اور قدر و احترام کے معیار سے نیچے ہی نیچے گراتی جا رہی ہے۔ بجائے ہم اُوپر جانے کے روزمرّہ کی معمولی روایات نبھانے میں بھی بالکل صفر ہوتے جا رہے۔ یہ کیسی تعلیم و شعور ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ نسل سے زیادہ تو ہمارے ناخواندہ بڑوں بزرگوں میں پایا جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ پُرانے زمانے میں بڑے بزرگ اس بات کو بہت اہمیت دیتے تھے کہ اگر کسی کے خط یا ڈاک کے لفافے پر ''ذاتی'' لکھا ہے، یا باقاعدہ کسی کا نام لکھا ہے تو اُسے ہرگز کھولنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ وہ خط یا لفافہ امانتاً رکھوا دیا جاتا تھا اور جس کے نام ہوتا اُسے پوری ایمانداری سے سونپ دیا جاتا۔ کسی کی ڈائری یا نوٹ بک پڑھنا انتہائی گری ہوئی اور غیر اخلاقی حرکت مانی جاتی تھی لیکن آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اب تو ایسا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ گھر کی خواتین جان بوجھ کر اپنی بہو، نند یا ساس وغیرہ کے نام آنے والے خطوط کھول کر پڑھنا اور جاننا چاہتی ہیں کہ اُن کے خلاف کسی نے کچھ لکھا تو نہیں؟ یعنی پرائیویسی نام کی چڑیا سے آج کے زمانے کے لوگ قطعاً ناواقف ہیں۔

کسی کے موبائل پر کوئی پیغام آئے، تو جو انسان بھی قریب بیٹھا ہو وہ جھانک کر پیغام پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ کسی کا فون بج رہا ہو یا میز پر دھرا ہو، تو اُس کی اجازت کے بغیر اُٹھا کر اُس کی ایپلی کیشنز میں چلے جانا یا پیغامات پڑھنے لگ جانا، گیلری کھول کر تصاویر دیکھنا، انتہائی معیوب حرکت ہے، لیکن اس بدتہذیبی کو ''بے تکلفی'' کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے۔ مذاق میں اُڑا دینے سے بدتہذیبی کے معنی نہیں بدل جاتے، یہ بدتمیزی ہی رہے گی۔ کسی کی کھوج میں رہنا نہ صرف اخلاقی گراوٹ بلکہ گناہ بھی ہے۔

کافی دنوں سے میرے ذاتی نمبر پر بے شمار دفتری کالز آنے لگی تھیں اور میں بے حد پریشان کہ آخر ان سب کے پاس میرا ذاتی نمبر کہاں سے آیا جب کہ میں نمبر دینے کے معاملے میں انتہائی محتاط واقع ہوئی ہوں۔ مرد حضرات تو ایک طرف، میں خواتین کو بھی بلاوجہ اپنا نمبر دینے سے گریز کرتی ہوں اور کجا یہ دفتری معاملات پر بے تحاشا فون کالز کا تانتا بندھ جانا۔ حتیٰ کہ چھٹی کے دن بھی صبح شام فون پر فون آنے لگے۔

آخر تنگ آ کر ایک دِن میں نے فون کرنے والی ایک خاتون سے پوچھا کہ اُنہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟ تو انہوں نے فخریہ لہجے میں بتایا کہ میرے ہی دفتر سے اُنہوں نے نمبر حاصل کیا۔ میں نے تو خیر جیسے تیسے اُن خاتون سے جان چھڑوالی، مگر دل میں یہ پھانس بری طرح چبھتی رہی کہ آخر کیوں اجازت کے بغیر ہم کسی کا ذاتی فون نمبر لوگوں میں بانٹتے پھرتے ہیں؟ اگر کوئی اپنا نمبر دینے سے گریز کرتا ہے یا بات نہیں کرنا چاہتا تو یہ اُس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں کہ اُس کا نمبر بلا اجازت لوگوں کو دیتے پھریں! ہماری اس بدتہذیبی سے فون کے مالک کو کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس کا ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ ہمیں احساس ہی نہیں کہ یہ غلط حرکت ہے۔

اصولاً ہونا تو یہ چاہیے کہ اگر کوئی ہم سے کسی کا نمبر مانگے تو پہلے شائستگی سے معذرت کریں اور پھر صاف بات کریں کہ ہم بلا اجازت نمبر دینے کے مجاز نہیں، لیکن ہمارے معاشرے میں اکثر و بیشتر اس ''فارمیلٹی'' کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اور جو کوئی بھی کسی کا نمبر پوچھے، ہم بنا کسی

لحاظ و احتیاط کے، بغیر اجازت کسی کا نمبر دے کر غیر اخلاقی اور بدتہذیبی کی تمام حدیں پار کر جاتے ہیں۔ ذرا سوچیے! کسی نے ہم پر اعتماد کرتے ہوئے ہمیں اپنا ذاتی نمبر دیا، اپنے گھر بُلایا یا ہمیں اپنا کوئی راز بتایا، اور ہم اُسے دنیا جہان میں نشر کر کے نہ صرف اپنی اخلاقی گراوٹ کا ثبوت دیتے بلکہ دوسرے کی نظر میں بھی اپنا اعتبار و کردار مشکوک بنا لیتے ہیں۔

بعض لوگ کسی شے کی تعریف اس انداز میں کرتے ہیں کہ اُن کی آنکھوں میں ستائش کے ساتھ ساتھ اُس چیز کو پا لینے کا لالچ بھی واضح نظر آتا ہے۔ ایک خاتون جہاں کہیں کسی کی کوئی اچھی خوبصورت جیولری یا ہینڈ بیگ دیکھتیں تو فوراً کہتیں ''ہائے اللہ! کتنا خوبصورت ہے، یہ میں لے لوں؟'' یہ انتہائی معیوب اور گری ہوئی حرکت لگتی ہے کہ اگر آپ کو کسی کی کوئی چیز بہت پسند آئی ہے تو آپ تعریف کرتے ساتھ ہی اُسے مانگ لیتے ہیں۔ ذرا نہیں سوچتے کہ جس کی چیز ہے اُس نے کتنے شوق سے اپنے لیے لی ہوگی۔

کسی سے کوئی چیز ضرورتاً یا مجبوراً مانگنا بُری بات نہیں، لیکن کچھ لوگ کسی کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اُن کا مطالبہ فوراً ہی ہوتا ہے کہ ہائے یہ میں رکھ لوں؟ اب سامنے والا اکثر مروتاً اپنی وہ دل پسند چیز دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک بدتہذیبی جو بہت زیادہ دیکھنے میں آتی ہے وہ ہے پڑھنے کے لیے کتابیں مانگ کر لے جانا اور پھر واپس نہ کرنا۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے اس جدید دور میں بھی کچھ باذوق لوگ ایسے اب بھی ہیں جو کتابوں سے محبت کرتے اور باقاعدہ انہیں اپنی گھریلو مختصر سی لائبریری میں سجا سنوار کر رکھتے ہیں۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ بے چاروں کو اپنا یہ خزانہ بھی چھپا چھپا کر یا ڈر ڈر کر رکھنا پڑتا ہے۔ میں خود اس اذیت ناک معیوب بدتہذیبی کا کئی بار سامنا کر چکی۔

شیلف میں، الماریوں میں سجا سجا کر رکھی کتابیں بڑے شوق سے دوست، رشتے دار، احباب وغیرہ مانگ کر لے گئے اور جلد ہی لوٹانے کا وعدہ بھی کیا۔ بار بار درخواست کی کہ اسے سنبھال کر رکھیے گا، ذرا دھیان سے کہیں کوئی ورق خراب نہ ہو جائے' بہت نایاب کتاب ہے لیکن جب بار بار کے تقاضے کے بعد آخر مہینوں بعد کتاب واپس لوٹائی گئی تو اُس کے اوراق پر جگہ جگہ بچوں نے کارٹون بنا رکھے تھے۔ ایک صفحے پر کسی نے کونے پر اپنے راشن کی تفصیل لکھ رکھی تھی اور تو اور سرورق کی تصویر پر بھی نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

میں نے احساس دلایا تو بڑی لاپروائی سے جواب آیا کہ جناب کیا کریں' گھر میں بچے ہی کوئی چیز نہیں چھوڑتے۔ یہ تو اچھا ہے کہ آپ نے اچھی خاصی لائبریری بنا رکھی ہے ورنہ ہمارا تو خواب ہی رہا کہ ہم بھی گھر میں کتابیں سجاتے۔ چلیں آپ اور ہم کوئی الگ تو نہیں۔ یہ اور بات کہ اُس کے بعد میں نے تمام الماریاں سٹور میں رکھوا کر ان کے شیشوں پر پینٹ کروا دیا، کیونکہ ایسے ناقدروں کے ہاتھوں کتابوں کی یہ درگت برداشت سے باہر تھی۔

نہ جانے کیوں ہمیں احساس ہی نہیں رہا کہ ہم آخر کس طرف جا رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اخلاق، عادات، تہذیب جیسے الفاظ ہماری زندگیوں سے کیوں نکلتے جا رہے ہیں۔ جس معاشرے و قوم میں تہذیب اور اخلاقیات نہ ہوں وہ معاشرہ بیمار اور قوم مردہ ہو جایا کرتی ہے۔ اخلاقی اقدار و روایات کے بغیر پلنے بڑھنے والا معاشرہ قوم کو مفلوج کر چھوڑتا ہے اور انسانی قدریں پامال ہونے سے نہ صرف بے شمار مسائل جنم لیتے بلکہ بیمار قوم کی تشکیل و بنیاد پڑتی ہے جس سے ملک کی بقا و سلامتی کو تو خطرہ ہوتا ہی ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی مجرم ٹھہرتے ہیں۔ بعض بداخلاقیاں اور بدتہذیبیاں کب گناہ اور جرم کا رخ اختیار کر لیں' اس کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب تک معاملہ ہاتھ، وقت اور عمر سے آگے گزر چکا ہوتا ہے۔

◆◆◆

مُستحق

اُس منافق عورت کی کتھا جو غریبوں کو خالی خولی اظہارِ ہمدردی پر ٹالنے کا گُر جانتی تھی

بینا صدیقی

احمر کے حادثے نے گھر بھر کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ گھر کا اکلوتا لڑکا، ماں باپ کا لاڈلا اور تین بہنوں کا چہیتا جو تھا۔

اس کی موٹر سائیکل کا جب سے حادثہ ہوا تھا، گھر میں کسی کو کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ احمر کی ماں' منیزہ مستقل ہسپتال کے نماز والے کمرے میں مصلے پہ بیٹھی بیٹے کی زندگی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ والد مشتاق بھی لمحے بھر کو بیٹے سے جدا نہ ہوئے۔ احمر کے کامیاب آپریشن نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔

منیزہ نے کہا ''میں نے پورے دس ہزار روپے کی منت مانی تھی۔ اگر احمر کا آپریشن کامیاب ہوجائے اور یہ دوبارہ چلنے پھرنے لگے تو دس ہزار روپے کا صدقہ کسی غریب کو دوں گی۔'' وہ آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے جوش سے بولی۔

مشتاق صاحب نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا ''اللہ نے ہمارے بیٹے کو نئی زندگی دی ہے۔ جب ٹانگ کا کامیاب آپریشن ہوگیا تو چلنے بھی لگے گا۔ تم نیک کام کے لیے اللہ سے شرطیں نہ لگاؤ۔ جا کے جلدی سے یہ صدقہ کردو۔''

ہسپتال کے اخراجات کے لیے نکلوائے ہوئے کرارے نوٹوں میں سے انہوں نے فوراً دس ہزار روپے گن کے بیوی کو تھمائے۔ اس نے جھٹ روپے اپنے پرس میں ڈال لیے اور کہا ''پہلے ایک نظر اپنے بچے کو تو دیکھ لوں۔ آپریشن تھیٹر سے تو نکل آئے بچہ میرا۔''

احمر تھیٹر سے کمرے اور پھر جلد ہی گھر منتقل ہوگیا۔ لیکن منیزہ کے پرس میں رکھے دس ہزار روپے کہیں نہ جاسکے' جوں کے توں پڑے رہے۔

بہنوں نے بھائی کو خوش آمدید کہا اور اس کے لیے من پسند ہوٹل سے کھانا منگایا۔ تھوڑے دنوں بعد احمر واکر کی مدد سے خود غسل خانے جانے لگا۔ اب اسے اس کام کے لیے ماں باپ کے سہارے کی ضرورت نہ پڑتی۔

منیزہ بیٹے کو روبہ صحت دیکھ کے خوشی سے نہال تھی۔ ایک دن احمر کے لیے بریانی کو دم دے رہی تھی کہ کسی فقیر نے صدا لگائی۔

''بیگم' بریانی کی ایک پلیٹ اسے بھی دے دو، ہمارے احمر کے لیے دعا کرے گا۔'' مشتاق صاحب نے باورچی خانے میں جھانکا۔

''لو بھئی۔ آج تو بریانی میں چکن کم ہے اور چاروں بچے ...اق سے کھاتے ہیں۔ کم ہی پڑے گی اور آپ ہیں کہ کہہ رہے ...فقیر کو دے دو۔ پانچ روپے کا سکہ ہوگا شوکیس کے پلاسٹک کے نیچے...... وہی دیے دیتی ہوں۔'' منیزہ بیگم چڑ کے بولی۔

جتنی دیر میں منیزہ بیگم نے باورچی خانے سے نکل کے ... روپے کا ننھا سا سکہ تلاش کیا، فقیر جا چکا تھا۔ منیزہ مطمئن ...کے باورچی خانے میں دوبارہ جا گھسی۔

''ارے یاد آیا' تم نے وہ دس ہزار روپے تو دے دیے ...کسی غریب کو۔ احمر کی صحت یابی کے صدقے کے؟'' مشتاق ...احب کو خیال آیا۔

''او ہو بھئی، کس کو دیتی؟ کوئی ضرورت مند بھی تو ملے۔ ...ی تک رکھے ہیں۔'' منیزہ نے سر جھٹک کے کہا۔

''لو یہاں ہزاروں ضرورت مند ہیں اور تمہیں ضرورت مند ...ہیں مل رہا۔ عجیب بات ہے۔'' مشتاق صاحب کو غصہ آگیا۔

''ماسی کو دے دیتیں امی، وہ بے چاری اپنے بچے کے ...ج کے لیے مانگ رہی تھی پرسوں۔'' ماہین کو خیال آیا۔

''ماسی؟ توبہ کرو، وہ تو ہمیں بیچ کھائے۔ موقع مل جائے ...و ہی پرس سے دس ہزار روپے کا صدقہ لے اڑے۔'' منیزہ ...نے چڑ کے کہا۔

''پھر دھوبی کو دے دیتیں، بے چارہ لنگڑا کے چلتا ہے اور ...کپڑے کندھوں پہ لاد کے گھر گھر لاتا لے جاتا ہے۔'' ...ن کو دھوبی سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

''اے بی کیوں، تم لوگوں نے دنیا دیکھی نہیں۔ یہ سب ...ٹے اور فریبی ہوتے ہیں، ہمدردی بٹورنے کو خوب تماشے ...تے ہیں۔ ان کے گھروں میں ضرورت کی ہر چیز ہوتی ...'' منیزہ جلی بیٹھی تھی۔

''سلائی والی فیروزہ خالہ بھی تو کہہ رہی تھیں کہ ان کی بیٹی ...شادی ہے۔ انہی کو دے دیں' وہ بھی تو ضرورت مند ...'' سبین نے کتاب سے سر اٹھا کر کہا۔

''اے بڑے گلے اور بے ڈھب سلائی والے کپڑے سینے والی درزن خوب مہنگے کپڑے سی کے محلے بھر کو لُوٹ رہی ہے اور میں اس کو دس ہزار تھما دوں، واہ۔'' منیزہ چڑ گئیں۔

''میرے خیال میں بھی فیروزہ خالہ ہی ان پیسوں کی مستحق ہیں۔'' فرحین دبی آواز میں بول اٹھی۔

''فیروزہ خالہ۔ قدرت نے اس کی شکل پہ بے وقوفی کا میک اپ کر کے بھیجا ہے۔ ورنہ ہے بڑی چالاک۔ ذرا ذرا سے کاج بٹن اور پیکو کے بھی سو پچاس دھر لیتی ہے۔ کپڑا چور کہیں کی۔ میرا نیلا لان کا سوٹ اور پیلے سوٹ کی قمیص کا دھاری دار کپڑا سب غائب۔ میں تو گھستی ہی مشکل سے ہوں اس پیلی قمیص میں اور گلابی والے کی آستینوں پہ ٹیکس کاٹ لیا۔ سارے ڈیزائنر کو جا کے بیچا ہوگا۔'' منیزہ نے دانت پیسے۔

''جی ہاں' ڈیزائنر آپ کی درزن کی لائی دھجیوں کے ہی منتظر بیٹھے ہوتے ہیں نا۔'' مشتاق صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔

''بھئی، میں کسی لالچی، فریبی اور مکار غریب کو یہ پیسے ہرگز نہیں دے سکتی۔'' منیزہ اٹل لہجے میں بولی۔

''بچیوں نے کئی نام بتائے ہیں مگر یہ مستحق تمہیں جچ نہیں رہے۔ آخر تمہارے نزدیک مستحق کی تعریف ہے کیا؟'' مشتاق صاحب جز بز ہوگئے۔

''بھئی، نکما نہ ہو، خود بھی کچھ ہاتھ پاؤں مارتا ہو۔'' منیزہ نے ذرا سوچا۔

''تو ماسی، دھوبی اور محلے کی درزن میں سے نکما نکھٹو کون ہے؟ ہاتھ پاؤں سر سب ہی مار رہے ہیں بے چارے اپنی روزی کے لیے۔'' مشتاق صاحب چڑ گئے۔

''بھئی یہی تو بات ہے۔ یہ لوگ خود کما رہے ہیں' ان پہ صدقہ کیسا؟'' منیزہ نے فوراً پینترہ بدلا۔

''تو پھر جس کو پانچ روپے کا سکہ دینے چلی تھیں اس فقیر کو دے ڈالتیں دس ہزار۔'' مشتاق صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔

اتنے میں احمر کی آواز آئی جو پانی مانگ رہا تھا۔ ماہین

فرحین اسے پانی دینے دوڑ گئیں۔ منیزہ اٹھتے ہوئے بولی ''دوں گی مگر کسی مستحق کو۔''

احمر کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں بڑی تقریب منعقد کی گئی جس میں منیزہ کے من پسند تمام مہمان بلائے گئے۔ وہ منیزہ کے سلیقے، ہمدردی اور مامتا کی تعریفیں کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جا رہے تھے۔ فرحین، ماہین اور سین بھی بنی سنوری مہمانوں کو شربت پیش کر رہی تھیں۔ احمر اپنے دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے میں مصروف تھا۔ ایسے میں کسی نے اچانک مشتاق صاحب کی کمی محسوس کی۔

''بھئی احمر کے ابا کو مدعو نہیں کیا تم نے اس کی صحت یابی کی دعوت میں؟'' منیزہ کے بھائی صفدر نے ہنس کے پوچھا۔

''بھئی نہ پوچھو، چڑے بیٹھے ہیں۔ باقی سب کے لیے سمجھو، بیمار ہیں۔'' منیزہ منہ بنا کے بولیں۔

''مگر ہوا کیا؟'' صفدر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کہتے ہیں جب تک احمر کی صحت یابی کے لیے مانا ہوا صدقہ نہیں اتار دیا جاتا یہ تقریب نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بھلا بتاؤ۔ اب اتنی سی بات پہ بچوں کی خوشی خراب کر کے اندر گھسے بیٹھے ہیں۔'' منیزہ جل بھن کے بولی۔

''تو اتار دیتیں نا سو پانچ سو کا صدقہ، میاؤں کو منانا تو آسان کام ہے۔'' صفدر ہنسے۔

''سو پانچ سو کا کیا؟ میرے پاس دس ہزار رکھے ہیں احمر پہ وار کے صدقہ کرنے کو، مگر کوئی ملے بھی تو اعتبار کا، جو سچ مچ حقدار ہو اتنی بڑی رقم کا۔'' منیزہ نے بے زاری سے کہا۔

''اتنی بڑی رقم؟ مگر پچھلے ہفتے تم شاپنگ کرتے ہوئے مجھ سے کہہ رہی تھیں، دس ہزار سے ہوتا ہی کیا ہے؟'' صفدر نے بہن کو چھیڑنے کو کہا۔

''صدقے کے لیے دس ہزار بڑی رقم ہوتی ہے۔ تم نے کبھی دیا ہو تو پتا چلے۔'' منیزہ فخر سے بولی۔

''تم بھی کبھی دے ہی دو تو تمہیں پتا چلے۔'' صفدر جل کر بولا اور آگے بڑھ گیا۔

''امی! آپ کے پاس دس ہزار ہیں؟ مجھے دوستوں کے ساتھ دو دن کے لیے مری جانا ہے؟ ابو سے مانگوں گا تو دس ہزار باتیں ملیں گی سننے کو۔'' احمر بدتمیزی سے بولا۔

''ہاں ہاں بیٹا یہ لو۔'' انہوں نے ہزار ہزار کے کڑک نوٹ لمحے بھر کو غور سے دیکھے اور پھر لاڈلے کے حوالے کر دیے۔

''چلو اسی کے تھے، اسی کے کام آ گئے۔ بستر پہ لیٹے لیٹے بور ہو گیا تھا' اس بہانے تازہ دم ہو جائے گا۔'' منیزہ نے دل کو تسلی دی۔ ''مشتاق نے بھی اب چڑ کے پوچھنا چھوڑ دیا ہے ان پیسوں کا، اچھا ہی ہوا۔ ان کا چڑنا میرے کام آیا۔''

☆☆☆

''امی امی! بھور بن میں بھائی کی جیپ کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ ان کے دوست انھیں پنڈی لے گئے ہیں۔ سی ایم ایچ ہسپتال میں۔'' فرحین روتی ہوئی ہاتھ میں موبائل پکڑے اندر آئی۔

جائے نماز پہ بیٹھی منیزہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے فوراً آنسو بہاتے ہوئے ہاتھ اٹھا لیے:

''اے اللہ! جانے میرے بچے پہ بار بار کیوں آفت رہی ہے؟ میرا بچہ ٹھیک ہو جائے، صحیح سلامت گھر آ جائے تو پچھلی بار کی طرح صدقہ دوں گی۔ اب کی بار پورے بیس ہزار روپے کا!''

اقوال زریں

☆ آسمان پر نگاہ ضرور رکھو لیکن یہ نہ بھولو کہ پاؤں زمین پر ہی رکھے جاتے ہیں۔

☆ دو انسانوں کے مابین ایسے الفاظ جو سننے والا سمجھے کہ سچ ہے اور کہنے والا جانتا ہو کہ جھوٹ ہے' خوشامد کہلاتے ہیں۔

☆ انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں صرف کرتا ہے' اتنی محنت اور کرے تو خامی دور کی جا سکتی ہے۔

قربانی کا گوشت ضائع مت کیجیے

عذرا شیروانی

عید قرباں کے پُرمسرت موقع پر گوشت کو محفوظ بنانے والے مفید ٹوٹکے کام میں لائیے

عید الاضحیٰ کی تیاری سبھی لوگ کرتے ہیں۔ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق قربانی کی جاتی ہے۔ گائے اور اونٹ میں حصہ ڈالا یا بکرا' دنبہ' مینڈھا خرید لیا۔ مقصد صرف اللہ تعالیٰ کے فرمان کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی کا گوشت اور خون نہیں بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے۔ قربانی کا مقصد یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں اچھی سے اچھی چیز دی جائے۔ مستحق لوگوں تک گوشت پہنچایا جائے۔ یہ ہمارا مذہبی تہوار ہے جو ہمارے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اللہ کی راہ میں پیش کی جو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جا سکے گی۔ خواتین کو چاہیے نمود و نمائش نہ کریں بلکہ خلوص نیت سے اس فریضہ کو ادا کریں۔ پچاس ہزار کا بکرا ہو یا چالیس ہزار کا دنبہ' پورا اونٹ ہو یا گائے' آپ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربانی کیجیے۔ عزیز و اقارب' دوستوں میں اس کا چرچا مت کیجیے۔

عید پر خواتین کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ پہلے سے سوچا جاتا ہے کہ کیا پکے گا؟ قصائی کا انتظام ہوتا ہے۔ اب ایسی جگہیں وجود میں آ چکیں جہاں قربانی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ پھر بھی لوگوں کی اکثریت گھروں میں قربانی کرنا پسند کرتی ہے۔ بڑی عید کی اکثر تیاریاں خاتون خانہ سلیقے سے کرے تو نہ وہ خود تھکتی ہے اور نہ ہی ملنے ملانے اور آنے جانے والوں کی خاطر مدارت میں کمی آتی ہے۔

آپ کے لیے ایسے گارآمد ٹوٹکے پیش ہیں جو آپ کی عید آسان بنا دیں گے۔ بازار سے آپ چھوٹے بڑے سفید شاپر خرید لیے۔ اسی طرح ہاتھوں کے لیے آپ سفید دستانے لیجیے۔ بہت سستے مل جاتے ہیں۔ پلاسٹک کے یہ دستانے آپ استعمال کے بعد ضائع کر دیجیے۔ اس طرح گوشت کی بدبو سے آپ کے ہاتھ محفوظ رہیں گے۔ سفید رنگ کی کاغذ والی چپکنے کی ٹیپ لیں اور ایک پٹرول مارکر' لیموں' سرکہ' گرم مسالہ ثابت پسا ہوا' ٹماٹر' ہری مرچ' ہرا دھنیا' ادرک' لہسن گھر میں ہونا چاہیے۔

ایک کلو پیاز چھیل کر آپ تین چار روز پہلے تل کر رکھیے۔ ایک کلو پیاز لے کر پیس رکھیے۔ لہسن ایک پاؤ چھلا ہوا ابھی پیس کر شیشے کی بوتل میں رکھیے۔ ادرک پسی ہوئی علیحدہ بوتل میں رکھیے۔ کچا پپیتا لے کر فریج میں رکھیں۔ دو چار دن پہلے آپ فریج اور ڈیپ فریزر کی صفائی کر کے جگہ بنائیں۔ مائیکرو ویو صاف کریں۔ ایک پیالی میں پانی ڈال کر آدھے لیموں کا رس

ڈالیے۔ اسے چلایئے پھر بند کر کے اندر سے اسی سے مائیکرو ویو صاف کر لیجیے۔ ساری چکنائی اور دھبے دور ہو جائیں گے۔ فریج اور فریزر میں آپ میٹھا سوڈا ایک پیالی میں ڈال کر رکھیے تاکہ گوشت کی بدبو نہ ہو۔ فالتو چیزیں نکال کر اس میں جگہ بنایئے۔

آپ دو تین دن پہلے اپنے اور بچوں کے ساتھ ساتھ مردانہ کپڑے استری کر کے لٹکا دیجیے۔ باورچی خانے میں استعمال کرنے کے لیے دو ایپرن ضرور رکھیے تاکہ کپڑے خراب نہ ہوں۔ اسی طرح تین چار کپڑے کے جھاڑن بھی علیحدہ رکھیے جو صفائی کے کام آئیں۔

اب ایک فہرست بنایئے۔ اس میں رشتے داروں' دوستوں اور پڑوسیوں کے نام لکھیے۔ سفید شاپر لے اس پر کاغذ کی ٹیپ چپکا مار کر سے نام لکھ کر لفافے باورچی خانے میں رکھیے۔ پھر اپنے لیے فہرست بنائیں۔ آدھا کلو سے زیادہ گوشت ایک لفافے میں نہ رکھیں۔ اور اس پر بھی ٹیپ لگا کر لکھ دیجیے: قیمہ بنانا ہے' کڑاہی کا گوشت ہے' پلاؤ کا ہے' قورمے کے لیے ہے۔ اس طرح بہت آسانی ہوگی۔

ایک بات یاد رکھیے۔ قربانی کے گوشت کے تین حصے کیجیے۔ ایک اپنے رشتے داروں اور ملنے والوں کا' دوسرا غریبوں کا اور تیسرا آپ کا اپنا حصہ ہے۔ اس میں غریبوں کی حق تلفی نہ کیجیے۔ قربانی کا اچھا گوشت ان تک بھی پہنچائیں۔ ہمارے ہاں پہلے سے حساب لگ جاتا ہے کہ بیٹیوں کے گھر دو رانیں جائیں گی۔ پٹھ کا گوشت دیور کو پسند ہے۔ فلاں رشتے دار نے چانپوں کی فرمائش کی ہے۔ اسی طرح دل ہی دل میں یہ خیال آتا ہے کہ فلاں کے ہاں سے دستی آئے گی اور بیٹے کی سسرال سے ران۔ اکثر خواتین دل ہی میں پورے بکرے کا حساب کتاب لگا لیتی ہیں۔

گوشت اصولی طور پر اکٹھا بنوانا چاہیے اور ان کے حصے بخرے بھی حساب لے کر کرنے چاہئیں تاکہ قربانی کے احکامات پورے ہو سکیں۔ کچھ لوگ گوشت مستحق لوگوں کو دیتے ہیں رشتے داروں کے ہاں نہیں۔ اگر گھر میں قربانی کرنی ہے تو پہلے سے پانی کا انتظام کریں تاکہ قربانی کے بعد خون وغیرہ بہا دیا جائے۔ اوجھڑی علیحدہ لفافے میں ڈالیں اور سری پائے علیحدہ بڑے لفافے میں۔ کلیجی بنوانے کے بعد اسے تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ گوشت ٹھنڈا ہو جائے تو پانی سے اچھی طرح دھوئیں۔

کھال کو سنبھال کر جہاں دینی ہے' بھجوا دیں۔ اسی طرح غلاظت' گندگی سے بچاؤ ہوگا اور مکھیاں بھی نہیں آئیں گی۔ فینائل سے قربانی کی جگہ دھلوایئے اور ایک دو اگربتیاں لگایئے تاکہ بالکل بدبو نہ رہے۔ باورچی خانے میں گوشت بانٹ کر آپ اپنے حصہ کا گوشت اچھی طرح دھو کر چھلنی میں رکھیے تاکہ پانی ٹپک جائے۔ پھر ان کے پیکٹ بنا کر منجمد کر دیں۔ عید کے دن پلاؤ یا بریانی ضرور بنتی ہے۔ آپ یخنی کے لیے گوشت چڑھا دیجیے۔ کلیجی دھو کر تھوڑا سا نمک لگا کر رکھیے تاکہ بالکل بدبو نہ رہے۔ اکثر خواتین آٹے کے چھان سے کلیجی دھوتی ہیں۔ بعد میں دھو کر استعمال کرتی ہیں۔

گوشت دھونے کے بعد آپ تھوڑے سے بیسن میں لیموں کا رس ملا کر ہاتھوں پر مل لیں۔ پھر ہاتھ دھو لیں۔ باورچی خانے میں سنک دھو کر تھوڑے سے سرکہ ملے پانی سے صاف کر لیں۔ گوشت کی بدبو نہیں رہے گی۔ اسی طرح گوشت پر بھی آپ پانی میں تھوڑا سا سرکہ ملا ململ کا کپڑا بھگو کر تھوڑی دیر رکھ سکتی ہیں۔ گوشت کی بو نہیں آئے گی۔ پسندے بنانے ہوں تو ایک کلو گوشت کا ٹکڑا دھو کر فریزر میں رکھیں۔ کسی پلیٹ یا ڈبے میں رکھنا ہے۔ جب وقت ملے نکال کر تیز چھری سے اس کے پتلے ٹکڑے حسب خواہش کاٹ لفافے میں رکھ کر دوبارہ فریز کریں۔ ڈبل روٹی کی طرح آپ گوشت کے سلائس آسانی سے بنا سکتی ہیں۔

فریزر میں اگر آپ باریک پلاسٹک کا ٹکڑا پہلے سے بچھا دیں تو گوشت کبھی نہیں چپکے گا۔ آپ آسانی سے اسے نکال سکتی

ہیں۔ بعض دفعہ قربانی کے گوشت میں ہلکی سی بو آ جاتی ہے جو پکنے پر نہیں جاتی۔ اس کے لیے آپ گوشت فریزر سے نکال کر باہر رکھیں۔ آدھے گھنٹے بعد اسے سرکہ ملے پانی میں بھگو دیجیے۔ بعد میں پکایئے۔ خواتین کلیجی بہت بھونتی ہیں۔ اس سے نہ صرف غذائیت میں کمی آتی ہے بلکہ وہ سخت ہو جاتی ہے۔ گوشت ہلکی آنچ پر پکایئے۔ اس سے جلدی گل جاتا ہے' ذائقہ بھی آتا ہے۔

پہلے فریج نہیں ہوتا تھا۔ خواتین نمک ڈال گوشت پکا کر پانی خشک کر لیتی تھیں۔ پھر اسے مرتبان میں ڈال کر تیل ڈال دیتیں۔ اس طرح گوشت خراب نہیں ہوتا تھا۔ گوشت کا اچار بھی اسی طرح ڈالا جاتا ہے' دو تین دن کے لیے گوشت رکھنا ہو تو پانی میں ابال کر ٹھنڈا کر کے رکھیے۔ اگلے دن پھر جوش دے ٹھنڈا کر کے پانی کے برتن میں دیگچی رکھ دیجیے۔ اس طرح گوشت دو دن بعد بھی کام آ جاتا تھا۔ سعودیہ میں پہاڑ پر ہرن کے گوشت کے پارچے اور گوشت سکھا کر رکھا جاتا ہے۔

آج کے دور میں بے شمار بیماریاں جنم لے رہی ہیں۔ زیادہ گوشت کھانا بھی نہیں چاہیے اور نہ ذخیرہ کر کے رکھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ دن میں ختم کر دیجیے۔ ہمارے ہاں دو مہینے بعد پائے بنانے کا خیال آتا ہے۔ محرم پر حلیم بنانے کے لیے بقرعید کا گوشت نکالا جاتا ہے۔ بجلی جانے پر گوشت خراب ہونے کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ احتیاط کرنی چاہیے۔ روسٹ بنانا ہو تو گوشت دھو کر اس پر مسالے' سرکہ' تیل وغیرہ لگا کر فریز کریں۔ اس طرح مسالہ اندر تک جذب ہو جاتا ہے۔ روسٹ خستہ اور مزیدار بنتا ہے۔

خون کے داغ کپڑے یا جھاڑن پر ہوں تو فوراً ہی دھو لینے چاہئیں۔ سرف اور پانی سے صاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح قربانی کے لیے آپ چھریاں وغیرہ جو استعمال کرواتی ہیں' ان کو دھو' کپڑے سے خشک کر کے ہلکا سا سرسوں کا تیل لگا رکھ دیجیے۔ قیمہ بنانے کی مشین کو بھی اچھی طرح صاف کریں بلکہ ڈبل روٹی کا ایک سلائس ڈال کر نکالیے تاکہ جما ہوا قیمہ اور چکنائی نکل جائے اور بدبو نہ رہے۔ مشین صاف ستھری کر کے اس پر بھی محتاط رہنا چاہیے۔ کھانا گرم ہو تو منجمد نہ کریں۔ کمرے کے درجہ حرارت میں رکھیے۔

منجمد کر کے آپ کھانے کے ڈبے میں ایک چٹ ضرور لگایئے کہ اس میں کیا ہے؟ اور دوسری اہم بات یہ کہ کھانا فریزر سے نکال کر فوراً گرم نہ کریں۔ خواتین کو شکایت ہوتی ہے کہ فریز کیے کھانوں میں ذائقہ نہیں رہتا۔ دیگچی میں پانی گرم کریں اور اس کے اندر فریز کیا ہوا کھانا رکھیں۔ ایسے ڈبے میں کھانا منجمد کریں جسے گرم کرنے میں دقت نہ ہو۔ ڈبہ رکھ کر دیگچی کا ڈھکنا بھی ڈھانپ دیں۔ کھانا گرم ہو جائے تو ڈش میں نکال کر تھوڑا سا ہرا دھنیا اور چٹکی بھر گرم مسالہ' تھوڑی سی ادرک کاٹ اوپر سے ڈال دیں۔ کھانے کی لذت برقرار رہے گی۔ براہ راست گرم کرنے سے کھانے کے ذائقے میں فرق آ جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ منجمد کیا ہوا کھانا استعمال کے بعد دوبارہ منجمد مت کریں۔ فوراً استعمال کر لیجیے۔

گوشت بے احتیاطی سے بعض دفعہ جل جاتا ہے اور ہانڈی میں بدبو ہو جاتی ہے۔ اوپر سے گوشت نکال لیں۔ مسالہ سارا جل گیا ہے تو دوبارہ تیل میں مسالہ بھون کر گوشت ڈالیں اور آدھا کپ دودھ شامل کریں۔ دودھ سے جلے ہوئے سالن کی بدبو دور ہو جاتی ہے۔ نمک زیادہ ہو جائے تو گندھے ہوئے آٹے کی دو تین ٹکیاں ڈال دیں۔ وہ نمک کو جذب کر لیں گی۔ بعد میں نکال لیں۔ مرچ زیادہ لگے تو آپ گھی نتھار لیں۔ آپ اس میں کوئی سبزی بھی ڈال سکتی ہیں۔

لیموں اور ٹماٹر بھی مرچ کی تیزی کم کرتے ہیں۔ گھر میں جو روسٹ یا ہنٹر بیف بنتا ہے' وہ جلد خشک ہونے لگتا ہے۔ کھانے میں مزا نہیں آتا۔ آپ موٹا کپڑا لے چار تہ کر پانی میں بھگو کے نچوڑ لیں۔ پھر اس میں روسٹ یا ہنٹر بیف رکھ لپیٹ کر فریج میں رکھیں۔ کئی دن تک نرم رہے گا۔ آج کل تو بہت

آسانیاں ہیں۔ بٹر پیپر، فوائل پیپر میں لپیٹ کر رکھ سکتے ہیں۔ کوفتے بنائیں تو اس میں آپ بھنے ہوئے چنے وغیرہ تو ڈالتی ہیں۔ اس میں ایک چمچہ چاول تھوڑے سے پانی میں بھگو کر بعد میں پیس کر ملانے سے کوفتے نرم بنیں گے۔ اب انڈہ اور کارن فلور کوفتوں میں ملاتے ہیں۔ پہلے بھنے چنے اور چاول پیس کر ملاتے تھے۔ کوفتے ملائم اور پھولے ہوئے بنتے تھے۔

پروٹین صحت کے لیے ضروری ہے۔ ہمارے ہاں پروٹین کا سب سے اچھا ذریعہ گوشت تصور کیا جاتا ہے۔ بڑی عید پر شاید اسی لیے کئی کھانے گوشت سے بنتے ہیں۔ لیکن گوشت کا زیادہ استعمال درست نہیں۔ یورک ایسڈ بڑھ جاتا ہے اور بلڈ پریشر وغیرہ بھی۔ اس سے صحت متاثر ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کھانے کے لیے جیتے ہیں، ان کو صحت کی ذرا بھر فکر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتوں سے ہمیں نوازا ہے مگر کھانے پینے میں اعتدال ضروری ہے۔ متناسب غذا ہو جبھی صحت بنتی ہے۔ سبزیاں، دالیں، پھل، دہی بھی صحت قائم رکھتے ہیں۔ گوشت ضرور کھایئے مگر زیادہ نہیں۔ تین چار بوٹیاں کافی ہیں۔

تکے اب دعوتوں میں ہوتے ہیں۔ پہلے عید پر کلیجی کا سالن، پلاؤ، قورمہ وغیرہ بنتا تھا۔ بکرے کی ران اچھی طرح چھری سے گود کر اس پر سرکہ اور مسالے لگائے جاتے۔ پھر اس کو تنور میں یا گھر میں پکانے کا اہتمام کیا جاتا۔ نہاری، پائے بنتے۔ گوشت بھون کر کھایا جاتا تھا۔ اپنے عزیز و اقارب کو ضرور بلایا جاتا۔ اس طرح سب مل جل کر کھاتے پیتے۔

ہر فرد میں گوشت ہضم کرنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ صحت کے لیے گوشت ضروری ہے مگر اپنے معدے پر فالتو بوجھ نہ ڈالیے۔ سبزی، سلاد، دہی ضرور گوشت کے ساتھ رکھیے۔ بلکہ بعد میں آپ سبز چائے میں لیموں ڈال کر پی سکتے ہیں۔ کچی ادرک کا باریک لچھا تراش کر رکھیں۔ گوشت کھانے کے بعد تھوڑی سی ادرک کھا لیجیے۔ پیٹ بھر کر نہ کھایئے بلکہ بھوک رکھ کر کھانا چھوڑ دیجیے اور شام کو پیدل ضرور چلیے۔

تھوڑی سی احتیاط آپ کی صحت کو محفوظ رکھے گی اور آپ عید سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ ڈاکٹروں اور ہسپتال کے چکر سے بچ جائیں گے۔ اسی طرح گوشت کھانے کے بعد دانتوں میں برش ضرور کریں۔ خلال کریں تاکہ پھنسا ہوا گوشت دانتوں سے نکل جائے اور کوئی مسئلہ نہ ہو۔ بچوں کو بھی کھانے کے بعد برش کرنے کی ہدایت کریں۔ اس طرح آپ دندان ساز کے ہاں جانے سے بچ سکتے ہیں۔ بقرعید کے بعد ڈاکٹروں کے ہاں اچھا خاصا رش لگ جاتا ہے۔

◆◆◆

میکے گئی ہوئی بیوی کا شوہر کو خط

سلام دل و جان!!

کیسے ہیں آپ؟ جو لکھا ہے دھیان سے اور دو بار پڑھنا کام والی کو تنخواہ دے دی ہے، زیادہ مہربان مت ہونا۔ آپ کو کتنی بار بتایا ہے کہ پڑوسن کا اخبار والا، دودھ والا اور لانڈری والا ہم سے مختلف ہے۔ ہر روز صبح یہ پوچھنے مت پہنچ جانا کہ اخبار آیا کہ نہیں۔

الماری میں بائیں طرف پر آپ کے بنیان رکھے ہیں، دائیں طرف منے کی ہیں، پچھلی بار کی طرح اس کو مت پہن لینا نہیں تو پھر سارا دن آفس میں اوپر نیچے کھینچتے رہیں گے۔ عینک صحیح جگہ رکھنا، پچھلی بار پانچ دن بعد آئی تو فرج کے اندر ملی تھی۔ اپنا موبائل بھی سنبھال کر رکھنا، باتھ روم ساتھ لیجانے کی بالکل کوشش مت کرنا، مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی باتھ روم میں موبائل کا کیا کام؟

اپنے رشتہ داروں، دوستوں کو زیادہ جمع نہ کرنا، گھر کو گھر ہی رہنے دینا جوا خانہ بنانے کی ضرورت نہیں اور ہاں زیادہ اچھلنے کی ضرورت نہیں میں کبھی بھی اچانک آسکتی ہوں۔ خیال رکھنا۔

فقط بس تمہاری۔۔۔

ایک درزی نے خواب میں دیکھا کہ وہ مر گیا ہے اور اس کی قبر پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ اس نے کسی کو کہتے سنا ''یہ فلاں درزی کی قبر ہے، اس نے اپنی زندگی میں جس جس گاہک کا کپڑا چوری کیا تھا، وہی چوری شدہ کپڑے جھنڈے بنا کر اس کی قبر پر لہرا دیے گئے تاکہ دوسروں کو عبرت ملے۔

درزی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو اس نے شکر ادا کیا کہ یہ سب خواب تھا اور دوسرے یہ کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اس نے اسی وقت طے کیا کہ آئندہ کسی گاہک کا کپڑا چوری نہیں کرے گا، بلکہ جس کا کپڑا ضرورت سے زیادہ ہوا تو اسے ایمانداری کے ساتھ واپس کر دے گا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی وہ دکان پر گیا اور شاگردوں ساتھیوں کو اپنا خواب سنا کر بولا ''آئندہ کے لیے میں نے توبہ کر لی ہے۔ اب میں کسی گاہک کا کپڑا چوری نہیں کروں گا، پھر بھی بندہ بشر ہوں! اگر عادت سے مجبور ہو کر ایسی حرکت کر ہی بیٹھوں تو جو کوئی نوٹ کرے وہ صرف ''جھنڈے'' کہہ دیا کرے۔ مجھے اپنا خواب یاد آجائے گا اور میں اس حرکت سے باز آجاؤں گا''۔

چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہا۔ جب بھی وہ کپڑا کترنے کے لیے تیاری کرتا تو حسب سابق و عادت پہلے ناپ لیتا پھر اندازہ کرتا کہ کتنا کپڑا بچ رہا ہے؟ اس نیت کے ساتھ جیسے ہی وہ قینچی اٹھاتا اور فالتو کپڑے پر چلاتا، اس کے شاگرد تاڑ جاتے کہ اب کپڑا اچھر ہوا، وہ آواز لگا دیتے:

''استاد! جھنڈے!''

استاد تب اپنے خواب کو یاد کر کے ایک جھرجھری لیتا، اپنی حرکت پر نادم ہوتا اور کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کا اعادہ کر لیتا۔

ایک بار کسی گاہک کا بے حد نفیس کپڑا آ گیا جو قیمتی ہونے کے ساتھ ساتھ کم یاب بلکہ نایاب بھی تھا۔ اس کی

چھوٹے آدمی کا بڑا پن

م ص ایمن

ایک لائبریرین کے دلچسپ تجرباتِ زندگی
جو طویل عمر گزار کر توشۂ ذہن میں شامل ہوئے

نیت میں فتور آ گیا۔ اس نے مخصوص انداز میں قینچی اٹھائی ہی تھی کہ شاگردوں نے ہانک لگائی ''استاد! جھنڈے!''

استاد نے کچھ سوچا۔ خواب دیکھے کافی دن بیت گئے تھے اور بے ایمانی عود کر آ رہی تھی۔ بولا ''رہنے دو یار! اس رنگ کا نہیں تھا۔''

☆☆☆

میں نے اپنے علاقے میں لائبریری کھول رکھی ہے۔ ریاض شجاع، میڈیکل سٹور کے مالک اور لائبریری کے رکن ہیں۔ جب بھی آتے' وقت کی کمی کے شاکی ہوتے ہیں۔ ایک بار اپنے ذوق کے مطابق کتاب تلاش کر رہے تھے۔ میں نئی آنے والی کتب کا اندراج کر رہا تھا۔ انہیں جلدی تھی کہ کتاب لوں اور جاؤں۔ میری کوشش تھی کہ میں پہلے نئی آنے والی کتابوں کا اندراج کر لوں پھر ان پر توجہ دوں۔ بولے ''یار! مجھے فارغ کرو، میں نے جانا ہے!''

میں نے کہا ''مجھے جانا ہے!''

وہ رکوع کی حالت میں جھکے کتاب منتخب کر رہے تھے، تن کر کھڑے ہو گئے ''میں اہل زبان ہوں، تم غلطی کرو تو میرا کام ہے میں تمہاری اردو درست کروں!..... اُلٹا تم میری اردو درست کر رہے ہو؟''

میں نے کہا ''کیا تمہارا جملہ صحیح ہے؟''

''میں یہ نہیں کہہ رہا! میں مانتا ہوں کہ میرا جملہ غلط ہے، لیکن میرا مطلب ہے کہ میری غلطی تم نکال رہے ہو؟ مجھے پتا ہے ''نے'' مصدر کے ساتھ بولا جائے تو کلام کا عیب کہلاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مجھے یہ غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ میں اہل زبان ہوں اردو میری مادری زبان ہے''۔

یہ تھا ایک چھوٹے آدمی کا بڑا پن کہ اس نے میری تصحیح کا برا منانے کے بجائے اعتراف کیا کہ واقعی اس سے غلطی ہوئی ہے۔

☆☆☆

جارج برنارڈ شا، جنہیں بعض لوگ غلطی سے 'شاہ' کہتے ہیں، سے کسی نے پوچھا کہ اس قدر عمدہ خیالات آپ کے ذہن میں کیونکر آتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

''میں اپنے پیر گرم اور سر ٹھنڈا رکھتا ہوں''

لوگوں نے سنا تو اعلیٰ خیالات کی پرورش کے لیے سر پر برف رکھنا شروع کر دی اور پاؤں کو آگ سے سینکنا شروع کر دیا۔ ردعمل میں وہ مختلف بیماریوں میں گھر گئے۔ کسی کو نزلہ ہوا تو کوئی سرسام میں گرفتار ہو گیا۔ اب وہ لگے برنارڈ شا کو تلاش کرنے۔ برنارڈ شا کو اطلاع ہوئی تو کہنے لگے:

''ارے عقل کے دشمنو! میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم آتش دان کے پاس بیٹھو! میں تو پیدل زیادہ چلتا ہوں، یعنی پاؤں زیادہ تر حرکت میں رہتے ہیں اور کوئی ناگوار بات سنوں تو اسے برداشت کرتا ہوں یعنی غصہ غالب نہیں ہونے دیتا۔ جب کہ تم لوگ ذرا ذرا سی بات پر غصہ کر بیٹھتے ہو۔ سر کے بجائے دماغ کو ٹھنڈا رکھو''۔

☆☆☆

ایک چور اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''وہ سامنے مکان میں بتی جلتی نظر آ رہی ہے؟'' بیٹے نے ہاں کہا تو باپ بولا:

''میں نے اس گھر میں آٹھ دفعہ چوری کی ہے اس گھر میں تو پھر بھی بتی جل رہی ہے لیکن ہمارے گھر میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے''۔

قدرتی بات ہے جس شخص کی چوری ہو اور وہ انا للہ و انا الیہ راجعون کا ورد کرے تو اس آیت کی برکت سے اسے سکون بھی میسر آ جاتا ہے۔ اس کے نقصان کی عمدہ تلافی بھی ہو جاتی ہے جبکہ چور عمر بھر خوار ہی رہتا ہے۔

شاعر سائل آزاد کہتے ہیں کہ بھٹو دور میں ہم سیاسی قیدی تھے۔ جیل میں ہر طرح کے مجرم موجود تھے۔ وہ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرتے اور نئے آنے والے سے پوچھتے کہ

تمہارے یہاں آنے کی کیا وجہ ہے۔ کوئی کہتا کہ میں نے قتل کیا ہے تو اسے پرانے 'بدمعاش' شاباشی دیتے:

''اڑے بندہ مار کے آیا ہے، بڑا دل والا آدمی ہے۔''

کوئی جائیداد کے چکر میں جھگڑے میں ملوث ہو کر آیا ہوتا تو اس سے ہمدردی کی جاتی۔ کیوں کہ ایسے مقدمات میں اکثر بے گناہ لوگ ہی گرفتار ہوتے ہیں، جب کہ سازشی عناصر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی کہہ دے کہ چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے تو اس کی بات بھی پوری نہیں ہوتی تھی کہ اسے لات مار کر اپنے قریب سے اٹھا دیتے اور کہتے ''چل چور کا بچہ، چوری کرتا ہے، گھٹیا آدمی! دفع ہو جا''۔

سائل آزاد کہتے ہیں کہ جیل میں بڑا بدمعاش چھوٹے بدمعاش سے اپنی خدمت کرواتا ہے۔ چھوٹا بدمعاش مٹھی چاپی بھی کرتا ہے لیکن اگر کوئی 'چور' کسی چھوٹے بدمعاش کے پاؤں دبانے کی کوشش بھی کرے تو اسے لاتیں مار کر دفع دور کیا جاتا ہے۔ یہ ان کی آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔

اپنی چپل دستیاب نہ ہونے پر مسجد سے ننگے پیر آنا کئی لوگوں کو عبرت دلاتا ہے۔ ایسے میں اگر اتفاقاً چور یا اس کا کوئی واقف بھی دیکھ رہا ہو تو ممکن ہے چور ننگے پیر نمازی کو مسجد سے نکلتا دیکھ کر اپنی حرکت سے تائب ہو جائے۔

اللہ کا قانون ہے ''کچھ نہیں انسان کے لیے مگر جو وہ کوشش کرے۔'' چور بھی محنت کرتا ہے، اسے بھی اس کی محنت کا صلہ ملتا ہے۔

میرے پاس ایک ''چور'' آیا۔ اس کے پاس ایک بھگونا (بڑا پتیلا) تھا۔ بولا ''میرا بچہ بیمار ہے، گھر میں پیسا نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ دیگچہ لے لو اور دو سو روپیا دے دو۔ بچے کے لیے دوا لانی ہے۔'' میں نے اسے سو روپیا دیا اور کہا کہ جاؤ اس سے کام چلاؤ، اور یہ دیگچہ بھی لے جاؤ!''

وہ غصے سے بولا ''میں کوئی بھیک تھوڑی مانگ رہا ہوں، میرے گھر کا پتیلا ہے، استعمال کا ہے، بہت بڑا ہے' کبھی کبھی کام آتا ہے۔ اس وقت مجھے دو سو روپے کی سخت ضرورت ہے، اس لیے بیچ رہا ہوں۔'' میں نے صاف منع کر دیا کہ مجھے نہیں چاہیے۔

وہ بڑا دیگچہ ان دنوں کم از کم ایک ہزار روپے کا ہو گا، جسے وہ دو سو روپے کا بیچ رہا تھا۔ جس کا بھی تھا مالک نے اسے ہزار روپے کا خریدا ہو گا، چور نے چوری کی، اور ایک ہزار روپے والی چیز کے دو سو روپے مانگ رہا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ دیگچہ چوری کا ہے اور اونے پونے بیچ کر اس سے وہ فوری طور پر جان چھڑانا چاہتا ہے تاکہ اس کی تحویل میں کم سے کم افراد دیکھیں۔ اسی لیے وہ دیگچے کی قیمت نہیں مانگتا تھا، بلکہ اپنی 'محنت' کی 'اجرت' طلب کر رہا تھا۔

☆☆☆

بعض افراد کی عادت ہوتی ہے کہ پکوڑے والے کے پاس گئے، پکوڑے کا دانہ اٹھا لیا' دام پوچھے اور ہونٹ پلٹتے ہوئے چل پڑے۔ اسی طرح بعض لوگ بیر یا چنے کے ڈھیر میں سے ایک آدھ دانہ اٹھا لیتے ہیں..... اس میں مالک کی مرضی، اس کی اجازت شامل نہیں ہوتی۔

ہمارے چچا حاجی نور محمد اپنے سفرِ حج کا واقعہ بتاتے ہیں:

''۱۹۶۷ء میں حج کے دوران میری ملاقات بھارت سے آئے ہوئے ایک حاجی سے ہو گئی، مزاج مل گیا۔ ساتھ ساتھ آنا جانا شروع کر دیا۔ جب میری واپسی کی تاریخ قریب آئی تو میں بازار گیا کہ اپنے ہم وطنوں کے لیے حج کی سوغات لے لوں۔ وہ بھارتی حاجی بھی میرے ساتھ تھا۔ کھجور لینے ایک دکان پر کھڑے ہوئے۔ دکاندار کھجور تول رہا تھا کہ اس بھارتی حاجی نے کھجور کا ایک دانہ اٹھایا، منہ تک لایا ہی تھا کہ دکاندار بولا:

''لا..... لا..... حرام حرام! قطعی حرام!''

حاجی نے گھبرا کر دانہ کھجور کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

دکاندار نے ایک مٹھی بھری اور جتنی کھجوریں اس کی مٹھی

میں آسکتی تھیں، بھر کر اس حاجی کو دیتے ہوئے کہا "ھــــذا حلال۔"

یعنی دوسرے کا مال اگر آپ اس کے مرضی کے بغیر ایک دانہ بھی اٹھا کر استعمال کریں اور مالک کی مرضی اس میں شامل نہیں، تو وہ قطعی حرام ہے۔ ہاں مالک اپنی مرضی سے آپ کو اس سے زیادہ بھی دے تو وہ حلال ہے کیونکہ اس کی مرضی شامل ہے۔

☆☆☆

ایک شخص دماغی عارضے میں مبتلا ہوا تو اہلِ محلّہ کے "بے حد اصرار" پر اسے نفسیاتی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ چھ سات ماہ علاج کے بعد ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد اسے شہر میں رہنے کی باضابطہ اجازت دی اور ساتھ ہی دماغی صحت کا سرٹیفکیٹ بھی دیا۔

اگرچہ اسے ڈاکٹروں نے باعزت "بری" کر دیا تھا، اس کے دوست رشتہ دار اسے موقع بے موقع شرمندہ کرتے رہتے تھے۔

ایک بار خاندان کی کسی میٹنگ میں سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو ایک 'بے تکلف' نے ٹوک دیا "ارے تم کیا بولو گے، تم تو ہو ہی پاگل! آٹھ مہینے پاگل خانے میں گزار کر آئے ہو؟"

وہ پھٹ پڑا "پاگل میں نہیں تم سب پاگل ہو!" یہ کہتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کا دیا ہوا سرٹیفکیٹ جیب سے نکال کر لہرایا "میرے پاس ڈاکٹر کا دیا ہوا سرٹیفکیٹ ہے اگر تم پاگل نہیں ہو تو دکھاؤ کوئی سرٹیفکیٹ!"

☆☆☆

ملا نصیر الدین گھر میں سوئے تھے کہ زوجہ نے انہیں جھنجھوڑ کر جگایا۔ گلی میں ان کے دروازے کے عین سامنے چند افراد جھگڑ رہے تھے۔ اس دھینگا مشتی میں ان کے دروازے سے بھی بار بار ٹکرا رہے تھے۔ سردی تھی۔ ملا کا جی بستر سے نکلنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن زوجہ کے پیہم اصرار پر وہ اپنی رضائی سنبھالتے ہوئے گھر سے باہر آ ہی گئے۔ بیچ بچاؤ کرواتے ہوئے ان کی رضائی کہیں گر گئی۔ معاملہ تو رفع ہو گیا لیکن رضائی نہ جانے کون لے گیا۔ بغیر رضائی کے وہ گھر میں داخل ہوئے تو زوجہ نے پوچھا:

"کون جھگڑ رہا تھا؟"

"اگلے محلے کے افیمی تھے۔" ملا نے جواب دیا۔

"کیوں لڑ رہے تھے؟"

ملا نصیر الدین ان افراد میں سے تھے جو لاجواب ہونا نہیں جانتے۔ بیگم کی اس بات کا جواب دیتے ہیں "میری رضائی کے لیے۔"

☆☆☆

میں ایک بار 'لوڈشیڈنگ' کا بل جمع کروانے بینک گیا۔ کھڑکی خالی تھی۔ ڈیوٹی پر کوئی موجود بھی نہیں تھا۔ متعلقہ افسر بھی دائیں بائیں ہو گیا تھا۔

مجھے کھڑکی پر دیکھ کر وہ افسر میرے قریب آیا۔ اتنی ہی دیر میں ایک بڑی بی بھی آکر ساتھ والے 'زنانہ' کاؤنٹر، پر کھڑی ہو گئی۔

وہ افسر بولا "اماں لائن سے آؤ۔"

میں نے چونک کر دیکھا، زنانہ کھڑکی پر بڑی بی کے علاوہ کوئی نہ تھا اور مردانہ کاؤنٹر پر میرے سوا کوئی نہ تھا، پھر لائن سے آنے کی کیا تک ہے؟

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے مجھ سے بل اور رقم لیتے ہوئے اس بڑھیا سے پھر کہا "اماں سنا نہیں، لائن میں لگ جاؤ۔"

بڑھیا نے اپنے پیچھے دیکھا۔ وہاں کسی کو نہ پا کر بولی "کیسے لائن میں لگ جاؤں؟"

افسر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا "اتنی عمر ہو گئی ہے، پتا ہی نہیں ہے لائن کیسے لگاتے ہیں؟"

افسر کے چہرے پر گہری متانت تھی، ذرا بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ پھر بولا 'اماں لائن سے آؤ' بغیر لائن کے بل جمع نہیں ہوتا۔"

"میں کیسے......" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ افسر نے پھر اس کی بات کاٹی۔

"ایک تو ان عورتوں کو پتا نہیں کیا ہوتا ہے کبھی لائن میں نہیں لگتیں، ہر جگہ مرد کی برابری کا دعویٰ کرتی ہیں مگر بینک میں آکر یہ برابری بھول جاتی ہیں۔ ہمیشہ مرد سے آگے ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔"

"میں کیسے لائن لگاؤں؟ کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔" عورت نے کہا۔

"کوئی ہو یا نہیں! آپ کو لائن سے ہی آنا چاہیے۔" اس نے فیصلہ سنا دیا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں منہ پھیر کر ہنسنے لگا۔ اتنی دیر میں اس نے میرا بل مہر وغیرہ لگا کر میرے حوالے کر دیا اور بڑی بی سے بولا "آج تو میں بغیر لائن کے لے رہا ہوں لیکن آئندہ لائن سے آنا۔" بڑی بی پریشان ہوتی رہیں اور میں افسر کی ظرافت پر مسکراتا ہوا کھڑکی سے دور ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

جو نہیں مانتا تھا، وہ فال نکالنے والے کے پاس بیٹھ گیا۔ جو قائل تھا وہ اس کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے اس چکر سے باز رہنے کی تلقین کر رہا تھا، بولا "چھوڑ یار! وقت کم ہے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔"

نہ ماننے والے نے اس کی پروا نہیں کرتے ہوئے نجومی سے پوچھا "کتنے کی فال نکالتے ہو؟"

اس نے بتایا "پانچ روپے میں ایک لفافہ۔"

نہ ماننے والے نے اسے دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا "دو لفافے نکال دو۔"

کھڑے ہوئے دوست نے جو کہ فال وغیرہ کو 'مانتا' تھا، اس کی کمر پر اپنا گھٹنا چبھوتے ہوئے کہا "میرے لیے نہ لے یار! اپنے لیے ہی فال نکلوا! مجھے ضرورت نہیں۔"

نجومی کو گمان گزرا کہ اگر ایسا ہوا تو دس روپے کے اس نوٹ میں سے آدھی رقم واپس کرنا پڑ جائے گی۔

نجومی کے سامنے بیٹھے نہ ماننے والے دوست نے اپنے 'ماننے والے' دوست کی پروا نہ کرتے ہوئے نجومی سے کہا:

"تو دو لفافے ہی نکال۔ ایک میرے لیے اور دوسرا اپنے لیے...... کہ کب تک فٹ پاتھ پر بیٹھا رہے گا؟"

●●●

سفید کاغذ

پروفیسر صاحب نے بلیک بورڈ پر ایک سفید کاغذ چسپاں کرنے کے بعد اس کے درمیان میں ایک سیاہ نقطہ لگا دیا۔ پھر اپنا رخ کلاس کی طرف کرتے ہوئے طلبہ سے پوچھا آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟ سب نے کہا سیاہ نقطہ۔ پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا حیرت ہے اتنا بڑا سفید کاغذ تمھاری نظروں سے اوجھل ہے مگر چھوٹا سا ایک سیاہ نقطہ تمھیں صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یاد رکھنا زندگی میں کیے گئے لاتعداد اچھے کام سفید کاغذ کی طرح ہوتے ہیں جب کہ کوئی غلطی یا خرابی محض ایک نقطے کی مانند ہوتی ہے۔ لوگوں کی اکثریت دوسروں کی غلطیوں پر توجہ زیادہ دیتی ہے لیکن اچھائیوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ آپ کی ساری زندگی کی اچھائیوں پر آپ کی کوئی ایک کوتاہی یا کسی غلطی کا ایک سیاہ نقطہ ان کو صاف دکھائی دیتا ہے، اسی طرح آپ آدھا گلاس پانی بھر کر اگر لوگوں سے پوچھیں تو کم از کم 80٪ کہیں گے آدھا گلاس خالی ہے اور 20٪ کہیں گے کہ آدھا گلاس پانی ہے۔ دونوں صورتوں میں بظاہر فرق کچھ نہیں پڑتا لیکن درحقیقت یہ دو قسم کے اندازِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں ایک منفی ذہن کے لوگ ہر چیز میں خیر تلاش کر لیتے ہیں۔ آپ ہمیشہ مثبت سوچ اپنانے کی کوشش کریں آپ کو بھی ہر چیز میں خیر نظر آئے گی اس میں شخصیت کا نکھار ہے اور اچھی سوچ کی پہچان بھی۔

حادثہ جس نے دنیا کو ہلا ڈالا

نیلم احمد بشیر

اس دن کی سنسنی خیز یادیں جب چند سر پھرے ہائی جیکروں نے نہ صرف کیف و مستی میں ڈوبے امریکیوں کو جھنجھوڑا بلکہ دنیا بھی الٹ پلٹ کر ڈالی

جس روز نائن الیون کا واقعہ پیش آیا' میں اتفاق سے نیویارک میں ہی تھی جہاں میرے دو بچے، عنبر اور کاشف رہائش پذیر تھے۔ میں باری باری دونوں کے پاس رہتی اور نیویارک شہر کے خوبصورت نظاروں اور سیر گاہوں سے لطف اندوز ہوتی۔ دس ستمبر کا دن میں نے عنبر کے گھر واقع کوئینز میں گزارا۔ عنبر کی اس دن اتفاقیہ چھٹی تھی لہٰذا ہم ماں بیٹی نے ایک دوسرے کے ساتھ سے فائدہ اٹھایا اور گھر میں آرام کیا۔ عنبر کا شوہر، سروش خاموشی سے کمپیوٹر پہ بیٹھا دن رات کام کرتا رہتا۔ اس کے گھر ہونے نہ ہونے کا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ وہ روایتی شوہروں کی طرح عنبر کو خواہ مخواہ نہ ٹوکتا لہٰذا عنبر تسلی سے اپنے میکے والوں کو وقت دیتی۔

گیارہ ستمبر کی صبح اٹھ کر میں نے عنبر کو بتا دیا کہ آج ناشتے کے بعد کاشف کے گھر، سٹیٹن آئی لینڈ چلی جاؤں گی کیونکہ اسے گھر منتقل کروانے کی تیاری کروانا تھی۔ عنبر کام پہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ بات سن کر خلاف توقع کہنے لگی ''امی آپ آج نہ جائیں۔''

''کیوں؟ میں کیوں نہ جاؤں؟'' میں حیران ہوئی کیونکہ عنبر مجھے نیویارک میں کہیں آنے جانے سے روکتی تھی اور نہ ہی میرے کسی پروگرام میں رخنہ ڈالتی تھی۔

''بس آج آپ نہ جائیں..... میں شام کو خود ہی آپ کو چھوڑ آؤں گی یا کاشی سے کہیں، آ کر آپ کو لے جائے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''لو بھلا میں سارا دن اکیلی یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ تم دونوں میاں بیوی کام پہ جا رہے ہو۔ اب تم رات آٹھ بجے تھکی ہاری آ کر مجھے چھوڑنے جاؤ گی تو کتنی مصیبت ہو گی۔ آنے جانے میں چار گھنٹے لگ جائیں گے۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''امی، آپ کہاں تنہا اتنا لمبا سفر کریں گی، پہلے یہاں سے پیدل چل کر بس اسٹاپ پہ جانا، پھر ریل پکڑنا، دوسری ریل بدلنا، ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے فیری میں سوار ہونا، اس کے بعد

اتر کر پھر بس لینا۔ مشکل ہو گی نا آپ کے لیے۔'' میری بچی فکر مندی سے بولی۔

''عنبرین جان، میری بچی، میں کیا کبھی پہلے نہیں گئی۔ رُل کھل کے چلی ہی جاؤں گی نا۔''

عنبر خاموشی سے دفتر چلی گئی اور میں نے جلدی جلدی ناشتا کر کے نکلنے کی ٹھانی۔ میں کچھ حیران ہو رہی تھی کیونکہ عنبر جانتی تھی' میں اپنے بچوں سے خواہ مخواہ کی ڈیوٹیاں کبھی نہیں لیتی۔ کوشش کرتی ہوں کہ کوئی مجھے لینے چھوڑنے نہ آئے، میں خود ہی اپنے آنے جانے کا بندوبست کر لوں۔ میرے پیارے بچے پہلے ہی امریکا میں کون سا سکھ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پاکستان میں نوکروں اور ماں باپ کے لاڈ پیار کے پلے ہوئے شہزادے شہزادیاں اب امریکا کی آدم منڈی میں محنت کش چوہوں کی طرح بھاگتے بھاگتے صبح سے شام کر دیتے ہیں اور ایک پل بھی آرام نہیں کرتے۔ پھر کوئی بھی بچہ مجھے چھوڑنے یا لینے جاتا تو اسے ویرازنو پل پار کرتے ہوئے سات ڈالر ٹول ٹیکس دینا پڑتا۔ میں یہ بوجھ ان پہ کیوں ڈالتی، لہٰذا گھر سے نکلی اور لوکل بس اسٹیشن سے ریل کے اسٹیشن لے جانے والی بس میں سوار ہو گئی۔

میری ساتھ والی نشست پہ بیٹھی ایک گوری چٹی خوبصورت خاتون نے مجھ سے خود ہی بات چیت کرنا شروع کر دی اور چند ہی لمحوں میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ خواتین کے درمیان بہنا پا بڑی جلدی قائم ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق پولینڈ سے ہے اور وہ کئی گھروں میں ہیلتھ کیئر ورکر کے طور پر کام کرنے جاتی ہے۔

''مگر میری ملازمت کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔'' اس نے شرارت سے آنکھ ماری۔

''وہ کیا؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا بے کار میاں سارا دن گھر بیٹھا رہتا ہے۔ ہر وقت لڑتا ہے۔ زہر لگتا ہے مجھے۔ میں تو اس کے مرنے کی دعائیں مانگتی ہوں تاکہ میں بھی زندگی کا لطف اٹھا سکوں۔''

''ہیں؟ وہ اگر اتنا ہی برا لگتا ہے تو چھوڑ دو اسے۔'' میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ بھلا مغرب کی عورت کو ایسی زبردستی کی زندگی گزارنے کی کیا ضرورت تھی؟

''کیا کروں میرے بچے.....''

''لیکن وہ تو اب جوان ہوں گے۔'' میں نے اس کی عمر سے اندازہ لگایا۔''

''ہاں، لیکن وہ کہتے ہیں ماں، اسے نہ چھوڑنا۔ اب یہ کہاں جائے گا۔ بس بچوں کی بات کا پاس رکھے ہوئے میں اس مصیبت کے ساتھ گزارا کرنے پہ مجبور ہوں۔'' اس نے اپنا دکھڑا سنایا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ عورت اور اس کی تقدیر ساری دنیا میں ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ جب وہ ماں ہوتی ہے تو مامتا کا جذبہ ہر جذبے پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ مجھے لگا جیسے وہاں گوری چٹی، پینٹ شرٹ میں ملبوس، کٹے ہوئے بالوں والی پولش عورت کی جگہ میرے دیس کی معاشرتی طور پر پسی ہوئی عورت بیٹھی ہے۔ ان دونوں عورتوں کے پیروں میں پڑی زنجیریں ایک ہی جیسے رنگ اور وزن کی ہیں جنہیں وہ چاہیں بھی تو آسانی سے توڑ نہیں سکتیں۔

میں نے اپنی بیٹی عنبر کے بارے میں سوچا تو مجھے اس پہ پیار آنے لگا۔ خواہ مخواہ ہی میرے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ بس نے ہمیں کانٹی نینٹل ایونیو تارا تو میں جلدی سے اتر گئی۔ عنبر نے اترنے کے لیے یہی اسٹیشن بتایا تھا، دوسرے اسٹیشنوں پہ اترنے سے وہ ہمیشہ منع کرتی تھی کیونکہ وہاں کالے اور نشئی بہت ہوتے ہیں۔ عنبر کو میری بہت فکر رہتی ہے۔

اسٹیشن کے نیچے سیڑھیاں اتر کر میں نے جلدی سے ریل لی اور صبح سویرے کے ہجوم میں لوگوں کے ساتھ ہچکولے لینے لگی۔ شکر ہے کہ ٹرین ایکسپریس تھی اس لیے کئی اسٹیشن پھلانگتی

ہوئی وہ لیکسنگٹن ایونیو پہ پہنچ گئی۔ وہاں سے دوسری ٹرین لے کر مجھے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے سامنے واقع فیری ٹرمینل پہنچنا اور فیری لے کر سٹیٹن آئی لینڈ جانا تھا۔

ساؤتھ فیری ٹرمینل سے ابھی ہم دو اسٹاپ پیچھے کینال اسٹریٹ اسٹاپ پہ ہی پہنچے تھے کہ یکدم ریل کو زور سے بریک لگی اور مسافر ایک دوسرے کے اوپر جا گرے۔ ’’او مائی گاڈ، ’آئی ایم سوری، کیا ہوا؟‘‘ اور میرے منہ سے نکلا ہوا ’’یا الٰہی خیر‘‘ سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کہیں ٹرین ہائی جیک تو نہیں ہو گئی؟ مجھے یکدم فلمی سا خیال آیا‘ کیونکہ فلموں میں ایسا بہت دیکھ رکھا تھا۔ چلتی ریل ایک دم ساکت ہو گئی۔ فضا میں کچھ لوگوں کی چیخیں ابھی تک تیر رہی تھیں۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا......؟ باہر پلیٹ فارم گھپ اندھیرے میں خاموش پڑا تھا۔

چند لمحوں بعد ایک ریل گارڈ ٹارچ ہاتھ میں تھامے باہر کھڑا نظر آیا اور آٹومیٹک دروازے جادوئی طور پہ کھل گئے۔ اس نے لوگوں کو باہر آنے کا اشارہ کیا، تو مسافر نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہوئے باہر نکلنے لگے۔ گارڈ نے ہمیں بتایا کہ ہم لوگ پلیٹ فارم سے اوپر کی سیڑھیاں چڑھ کر باہر نہیں جا سکتے کیونکہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ کیا گڑبڑ ہے؟ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا۔ یہ غالباً وہی وقت تھا جب پہلا طیارہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت سے ٹکرایا تھا اور ساری دنیا میں قیامت مچنے والی تھی۔ کوہ قامت عمارات میں آگ اور خون کا خوفناک کھیل شروع ہو چکا تھا۔ پگھلا ہوا اسٹیل سیال مادہ بن کر کسی کی رگوں میں اتر رہا تھا اور کھڑکیوں کے چٹکتے ہوئے شیشے کسی نرم و گداز جسم میں گھس کر کرچی کرچی ہو رہے تھے۔

ہم اس وقت کہاں جانتے تھے کہ چند دیوانوں نے ان ٹاورز کی مضبوط بنیادوں کو اتنی زور سے ہلا کر رکھ دیا ہے کہ اس کی دھمک امریکا اور دور دراز دیسوں کے رہنے والوں کی زندگیوں اور معیشتوں میں عرصے تک سنی جاتی رہے گی۔ تباہی کا بادل اس زور سے گرجے گا کہ دھرتی کانپ اٹھے گی اور آسمانی دیوتا حیرت و استعجاب میں ڈوب جائیں گے۔

پلیٹ فارم پر اندھیرے میں اندر ہی اندر چلتے چلتے ہم بالآخر ساؤتھ فیری ٹرمینل کے اسٹیشن جا پہنچے جہاں سے سیڑھیاں چڑھ کر ہم سب کو اوپر جانا تھا۔ بوکھلائے مسافر سراسیمگی کے عالم میں اوپر چڑھے اور باہر کھلے آسمان تلے جا کر کھڑے ہو گئے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹرز میری آنکھوں کے بالکل سامنے تھے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اسے دیکھ کر میرا جسم پتے کی طرح کانپا اور آنکھیں خوف سے چِر گئیں۔ دو اونچے اونچے پربتوں میں الاؤ دہک رہے تھے اور حشر کا سا سماں تھا۔

ایک بلڈنگ میں آگ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ایک لمبوترے چوکور کیک میں سرخ نارنجی کریم کی فلنگ بچھا دی گئی ہو۔ دوسری دھوئیں کا غلاف پہنے مبہوت کھڑی تھی کہ دنیا کی سب سے طاقتور اور اہم عمارتوں کے ساتھ یہ سلوک کس نے اور کیسے کیا؟......اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹاور نیچے کو آنے لگا۔ آتے آتے اتنا نیچے آ گیا کہ سفید گرد کے غبار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لوگوں کی چیخ پکار اور آہ و بکا سن کر لگتا تھا جیسے یہ کسی فلم کا سین ہو۔ بعد میں ہالی وڈ کے ایک ڈائریکٹر نے یہ کہا تھا کہ اگر ہالی وڈ بھی چاہتا تو ’’تباہی کا ایسا پرفیکٹ‘‘ پروگرام نہ سوچ، نہ لکھ اور نہ فلما سکتا تھا۔

فیری اسٹیشن ٹرمینل سامنے ہی تھا۔ اس پر سے اترنے والے لوگ یوں دھیرے دھیرے فیری سے اتر کر آ رہے تھے جیسے وہ کٹھ پتلیاں ہوں، ان کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی اور آنکھوں میں پتھر کے ڈیلے ہوں۔ میں بھی دم بخود کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ یکدم مجھے خیال آیا...... اوہ میرے اللہ تو نے میرے بچے کاشف کو بچا لیا۔ تیرا شکریہ۔ میں وہیں زمین پر ڈھیر ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میرا کاشف بھی تو صبح کی شفٹ میں وہیں کام کیا کرتا

تھا۔ اگر خدانخواستہ وہ بھی...... آگے سوچنے سے میرے دل نے انکار کر دیا مگر اسی وقت مجھے ان سب ماؤں کا بھی خیال آ گیا جن کے بچے وہاں جل بھن رہے تھے۔ ان کی بھی وہاں یوں مرنے کی بھلا کیا تک تھی؟ وہ بھی تو کسی کے بچے ہی تھے۔

مجھے یاد آیا کہ ۱۹۹۳ء میں بھی جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے نیچے پارکنگ لاٹ میں بم رکھ کر اسے اڑانے کی کوشش کی گئی تھی تو میرا بچہ کاشف اس کے کہیں آس پاس ہی موجود تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نیویارک سے نیوجرسی جانے والی ہالینڈ ٹنل (سرنگ) میں گھنٹوں بلاک شدہ ٹریفک میں کھڑا رہا تھا کیونکہ دونوں طرف کے راستے بند کر دیے گئے تھے۔

ہم مسافر باہر کی بھگدڑ سے خوفزدہ ہو کر پھر نیچے اتر گئے اور اندھیرے پلیٹ فارموں پہ اندر ہی اندر پیدل چلنے لگے۔ ٹرانزٹ والوں نے بتایا کہ ہمیں اس علاقے سے دور جا کر کوئینز واپس جانے کے لیے ریل شاید مل سکے کیونکہ مین ہٹن اور سٹیٹن آئی لینڈ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اور ایک بھارتی ہم سفر عورت آپس میں بات چیت کرتے، دعائیں مانگتے چلتے چلے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹا چلنے کے بعد ہم کوئینز میں باہر نکلے اور کچھ سکھ کا سانس لیا۔

کوئینز پہنچتے ہی میں نے عنبر کو پے فون سے فون کر دیا۔ وہ بھی دفتر سے چھٹی ہوتے ہی سیدھی گھر چلی آئی تھی۔ اس نے مجھے اسٹیشن سے لیا اور ہم جلدی جلدی سیڑھیاں چل کر اس کے اپارٹمنٹ کے اندر چلے گئے۔ ’’شکر ہے امی‘ آپ خیریت سے آ گئیں۔ ہم لوگ تو بڑے پریشان تھے کہ آپ کہیں پھنس نہ جائیں۔‘‘ بیٹی نے میرے گلے سے لگ کر کہا۔ اب تک میرا داماد سروش بھی گھر واپس آ چکا تھا اور ہم نے جلدی جلدی نیویارک میں اپنے عزیز و اقارب کو فون کر کے ان کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ٹیلی فون سسٹم ڈاؤن تھا۔ امریکا میں ٹیلی فون کا خراب ہونا ایک عجیب و غریب بات تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟

ہم سب بار بار ایک دوسرے کے صحیح سلامت ہونے اور کاشف کے وہاں موجود نہ ہونے پہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے اور ساری دنیا کی طرح یہی سوچے جا رہے تھے کہ آخر ہوا کیا ہے؟ امریکا میں پاکستان کی طرح چھتوں پر چڑھنے کا رواج نہیں مگر اس روز ہم نے ہزارہا امریکیوں کو عمارات کی چھتوں پر چڑھے دیکھا۔ مین ہٹن کی سمت سے اٹھنے والا دھواں اور سفید غبار صاف دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب نظارہ تھا۔

مجھے مین ہٹن میں رہنے والے اپنے کزن شکوہ کا خیال آ گیا، نہ جانے وہ کہاں ہو گا؟ اللہ کرے خیریت سے ہو، میرا دل ڈرنے لگا اور میں نے اسے فون کرنے کی کوشش کی مگر اس روز امریکی فون بالکل پاکستانی فون بنے ہوئے تھے۔ ٹون مستقل طور پر انگیج جا رہی تھی۔ خدا خدا کر کے شام تک کہیں جا کر اس کی بیوی مریم سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں خیریت سے ہیں۔ شکوہ صبح تیار ہو کر اپنے دفتر جا چکا تھا۔ مریم ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ایک دفتر میں انٹرویو کے لیے گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ یہ سب ہو گیا۔

شکوہ نے فوراً مریم کو موبائل فون پہ بتا دیا کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے اور گھر پہ ہی رک گئی۔ اگر یہ واقعہ صبح نو بجے کے بعد پیش آیا ہوتا تو سبھی لوگ دفتر آ چکے ہوتے چونکہ نو بجنے میں دس گیارہ منٹ باقی رہتے تھے لہٰذا کچھ بچت ہو گئی۔ اس وقت تقریباً تیس ہزار کے قریب لوگ بلڈنگوں میں تھے۔ جانی نقصان چار ہزار لوگوں کا ہوا اور بلڈنگوں میں موجود تین لاکھ خالی کرسیاں بیٹھنے والوں کے انتظار میں چورا چورا ہو گئیں۔

شکوہ سے بات ہوئی تو اس نے بڑی نقاہت سے بولتے ہوئے بتایا کہ دھماکے کے فوراً بعد چونکہ سبھی دفتر وغیرہ بند ہو گئے تھے وہ بھی گھر کو چل دیا۔ سڑک پہ ٹیکسی، کار، بس، کچھ بھی نہیں چل رہا تھا‘ اس لیے اسے پانچ گھنٹے مسلسل پیدل چلنا پڑا تب کہیں جا کر وہ گھر پہنچا۔ اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں اور

جسم چُور چُور۔ اس لیے میں نے زیادہ بات نہیں کی اور آرام کرنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

گیارہ ستمبر کا سارا دن سبھی نے ٹی وی کے آگے گزارا۔ میں عنبر کے گھر بیٹھی تھی اور شام کے تقریباً پانچ بج چکے تھے۔ اس وقت تک ٹی وی پہ ایک دو ہائی جیکرز کے نام اور تصاویر آ چکی تھیں اور مسلمانوں پہ الزام لگ چکا تھا۔ میرا دل گھبرا گیا اور میں نے عنبر سے کہا ''چلو ذرا باہر چہل قدمی کر کے آتے ہیں۔'' وہ مان گئی اور ہم دونوں ماں بیٹی اسی طرح جیسے گھر میں بیٹھی تھیں، نیچے گلی میں اتر گئیں۔ اس وقت ہم نے معمول کے مطابق شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ عنبر کے اپارٹمنٹ کا رہائشی علاقہ بہت پرسکون اور محفوظ سمجھا جاتا ہے اس لیے آپ آرام سے ادھر ادھر گھومیں تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔

ہم دونوں گلی سے نکل کر مین سڑک پہ آ گئیں مگر یکدم مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے اُس سڑک، محلے، پورے شہر میں شاید صرف ہم دو ذی روح ہی تھے جو اس وقت گھر سے باہر نکلے۔ دور دور تک کوئی نظر نہ آیا۔ تمام کاریں گھروں کے آگے سلیقے سے یوں پارک تھیں جیسے کسی نے انہیں سجا کر رکھ دیا ہو۔ ہر گھر سے ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

حادثے سے سہمے امریکیوں کا ہجوم

تھوڑا سا آگے چلنے پر ہم نے دو تین پولیس والے کھڑے دیکھے۔ ہم حسب معمول بڑے اعتماد کے ساتھ ان کے آگے سے گزرے لیکن ان کی ایک ہی نظر نے ہمیں چوکنا کر دیا۔ ہمارا لباس انہیں بتا رہا تھا کہ ہم ہائی جیکرز کے قبیلے کی عورتیں ہیں جو اچانک ان کے لیے دشمن بن چکی تھیں۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہمیں شاید شلوار قمیص پہن کر باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ حالانکہ عنبر تو ہر وقت شلوار قمیص میں گھومتی تھی۔ سٹور سے سودا لاتی اور کبھی نہ جھجکتی۔

ہم دونوں جلدی سے قریبی کافی شاپ میں گھس گئیں۔ کاؤنٹر پہ کھڑی بھارتی لڑکی نے سہمی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ کافی شاپ بالکل خالی تھی۔ ہم نے ایک ایک ڈونٹ کھایا اور کافی لی۔

''اور ڈونٹ لے لیجیے بلکہ سارے لے لیں۔'' اس نے ہمیں کہا۔

''کیوں؟ ہم نے ایک ایک لے تو لیا ہے۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آج صبح سے کوئی آیا ہی نہیں۔ اب میں دکان بند کرنے والی ہوں۔ قاعدے کے مطابق مجھے آج کے نہ بکنے والے ڈونٹ کوڑے دان میں پھینک کر ہی جانا ہوں گے۔'' وہ دھیمے انداز میں بولی۔

''نہیں شکریہ ہمیں اور نہیں چاہیے۔'' میں نے انکار کر دیا۔ پھر دل میں افسوس کی ایک سی لہر اٹھی۔ ''ہائے ہائے ہمارے غریب ملکوں کے لوگ خوراک کو ترستے ہیں اور اس امریکا میں صاف ستھری، خالص، مزیدار

کھانے کی چیزیں کوڑے کی نظر ہو جاتی ہیں۔ سچ ہے امریکا کو اللہ نے بہت نوازا ہے۔''

ہم پھر گھر لوٹ گئے۔ وہاں جا کر بھی سوائے ٹی وی دیکھنے کے اور کسی چیز میں جی نہیں لگا۔ پتھرائی آنکھوں سے پھر ٹی وی کو گھورنے بیٹھ گئے۔ ایک عجیب منظر نظر آیا، تو میں چونک گئی۔ نیویارک کے تمام خوبصورت، خوابوں کے جھولوں جیسے پُل پبلک کے لیے مکمل طور پر بند کر دیے گئے تھے۔ خبر ملی تھی کہ پلوں کے نیچے ایسے آتش گیر مادے کی موجودگی کا امکان ہے جس سے ان کی آہنی رسیاں کسی بھی وقت ٹوٹ کر انہیں دریا برد کر سکتی ہیں۔ یہ بھی دیکھا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حادثے سے بچ جانے والے سفید دھول میں اٹے کپڑوں میں ملبوس لوگ خاموش، ننگے پیر، بُت بنے، چہروں پہ خوف کے رنگ سجائے چپ چاپ پیدل چلے جا رہے ہیں۔ یوں جیسے ان کی قوت گویائی سلب ہو چکی ہو اور ذہن کسی بھی قسم کا ادراک کرنے سے قاصر ہو۔ جیسے وہ کسی سائنس فکشن فلم کے مشینی روبوٹ کا کردار ہوں، انسان نہ ہوں۔

مجھے اپنی بیٹی عنبر کا خواب یاد آ گیا جو مجھے کئی روز پہلے سنایا بھی تھا۔ عنبر نے دیکھا تھا کہ نیویارک میں سناٹا طاری ہے اور وہاں کوئی ذی حس نظر نہیں آتا۔ میں حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگی، کئی بار کیسی عجیب عجیب باتیں ہو جاتی ہیں، جن کا بظاہر کوئی مقصد یا تک نہیں ہوتا۔ ہم ان کے ہونے کی منطق نہیں سمجھ پاتے ہیں مگر انجام پا جاتی ہیں۔ عنبر نے پہلے ہی وہ منظر نہ جانے کیسے دیکھ لیا تھا۔ ویسے عنبر نے پہلے بھی دو ایک بار سچ ہو جانے والے خواب دیکھے تھے اور ہم سب سوچتے رہ گئے تھے کہ یہ سب کیا تھا؟

اس روز نیویارک شہر مکمل طور پر بند ہو گیا۔ پروازیں، بسیں، ٹرینیں، سبھی کچھ رک گیا۔ ایک ہنستا مسکراتا چہکتا بہکتا شہر، دہشت اور افسردہ نگری بن چکا تھا۔ نہ جانے کیا ہو چکا تھا اور کیا ہونے والا تھا۔ ٹی وی کے سبھی چینل بس وہی خوفناک منظر دکھاتے چلے جا رہے تھے۔ دونوں طیاروں کا ٹاورز سے ٹکرانا اور پھر ان دیوہیکل عمارات کا کمزوری سے لڑکھڑا کر گرنا اور بعد کے مناظر ذہن کے پردے پہ ہمیشہ کے لیے نقش ہو کر رہ گئے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹرز میں قائم کئی دفاتر کے کروڑوں سفید کاغذ یوں اڑ کر فضا میں تیر رہے تھے جیسے مرے ہوئے پتنگے ہوں۔ شیشے چیخ رہے تھے اور کسی کھڑکی میں کوئی انسان سفید کپڑا ہلا کر مدد کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔ کئی لوگوں نے پگھلے ہوئے سٹیل اور بھڑکتی آگ سے بچنے کے لیے سو منزلہ عمارت سے چھلانگیں لگانے کو ترجیح دی۔ ایک مرد عورت ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نیچے کودے، یوں جیسے گرم ریت بھری کڑاہی میں بھنتی ہوئی مکئی کے دانے پھول بن کر باہر جا گرتے ہیں۔

مجھے اس روز پھر یقین ہو گیا' محبت ایک لافانی جذبہ ہے جو کبھی کافور نہیں ہو سکتا۔ یہی اس دنیا کی سجاوٹ، اس کا ہار سنگھار ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ خوف اور تباہی، بے سکونی اور بے چینی ہے۔ موت ایک وحشی چڑیل کی طرح ان گلیوں میں رقصاں تھی جہاں کبھی زندہ لوگ چلتے پھرتے تھے۔ ایک منحوس' بے بس اور سفید گرد کے بادل کا عفریت جان بچا کر بھاگنے والوں کے تعاقب میں تھا۔ سب کے لبوں پہ ایک ہی پکار تھی ''اوہ مائی گاڈ۔'' ''اوہ مائی گاڈ۔'' اسی اللہ اور گاڈ کو پکارا جا رہا تھا جس کے ماننے والے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے اور نفرت جن کا مسلک بن گئی تھی۔

اعداد و شمار کے مطابق دس ہزار گیلن جیٹ فیول کی وجہ سے دو ہزار ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت کی آگ نے تین بلین پاؤنڈ کے سٹیل کو پگھلا کر رکھ دیا۔ ایسے میں نرم و نازک، گوشت پوست کے بنے ہوئے انسانوں کے جسم یہ سب کیسے سہار سکتے تھے؟ کانچ کے کھلونوں نے تو ٹوٹ ہی جانا تھا اور کانچ کے ذروں کو ملبے سے چھانٹنا ناممکن عمل تھا۔ سبھی ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ترا سی ملکوں کے لوگ، مختلف مذاہب کے پیروکار اکھٹے

سوگئے۔ مٹی میں مٹی ہوئے تو مٹی کا ہی رنگ اختیار کرلیا اور ان کے جسموں کے ریزوں نے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے پر کوئی بھی اعتراض نہ کیا۔

ٹاورز گرنے سے قبل ان میں پھنسے لوگوں کو جب یقین ہو گیا کہ وہ موت کے خونی پنجے سے نجات حاصل نہیں کر سکتے' تو اپنے پیاروں کو موبائل یا ٹیلی فونوں سے آخری کالیں کرنے لگے۔ زیادہ تر نے یہی بات کی کہ ''میں اس وقت فلاں منزل پہ پھنس چکا (چکی) ہوں۔ آپ پریشان نہ ہونا اور یہ یاد رکھنا کہ آئی لو یو۔'' کسی نے اپنی بیوی، ماں، بچوں اور کسی نے اپنے شوہر، باپ، بھائی کو ایسا پیغام دیا جو وائس میل میں ریکارڈ ہو کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔ محبت کتنا عظیم، اہم اور طاقتور جذبہ ہے کہ انسان زندگی کے آخری لمحات میں بھی، لب پہ اسی کا ذکر کرتا ہے۔ اسی کی یاد کی خوشبو دلوں میں چھوڑ جانا چاہتا ہے۔

نیویارک کے ہر دلعزیز میئر' جولیانی صاحب کو جیسے ہی حادثے کی خبر ملی' وہ اپنے عملے سمیت فوراً جائے وقوع پر پہنچ گئے۔ حالات کا جائزہ لیا اور ضروری اقدامات کی ہدایت دی۔ ساتھ ساتھ ان کی سٹاف ورکر' نینسی بھی چل رہی تھی۔ وہ اپنے باس کی ہر ہدایت نوٹ کرتی جاتی۔ یکا یک میئر جولیانی کو خیال آیا، انہوں نے ایک دم گردن موڑ کر نینسی کو دیکھا اور سوالیہ نظروں سے پوچھا ''نینسی تمہارا شوہر ایڈی کہاں ہے؟''

فائر مین ایڈی کی بیوی کی آنکھوں میں سمندر امڈ آیا۔

''کیا وہ؟'' میئر نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔ اس وقت تک دونوں ٹاورز زمین بوس ہو چکے تھے۔

''ایڈی کو کال آئی تو وہ فوراً چلا گیا تھا۔'' نینسی نے گلوگیر آواز میں بتایا۔

''تو تم! تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' میئر نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ''میرے کلیجے سے اٹھنے والی ٹیس نے مجھے بتا دیا ہے کہ ایڈی اب نہیں رہا۔''

نینسی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ بولی ''وہ یقیناً لوگوں کی مدد کرتے ہوئے ہی گیا ہوگا۔ وہ ایسا ہی تھا۔'' میئر نے نینسی کو زبردستی چھٹی دے کر گھر بھیج دیا۔ اس کی کوکھ میں پہلا بچہ سانس لے رہا تھا جس کا باپ اس سے ملے بغیر ہی دنیا سے روانہ ہو چکا تھا۔

میئر جولیانی نے اپنی پریس کانفرنس کی تقریر میں اطالوی شاعر' دانتے الغیری کی طویل کلاسیکی نظم ڈیوائن کامیڈی (Divine Comedy) کا حوالہ دیا جس میں قیامت اور دوزخ کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے سانحۂ نیویارک کو دانتے کی قیامت تصور کرتے ہوئے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی آگ کو دوزخ کی دہکتی آگ سے مشابہ قرار دیا۔

عجیب بات تھی کہ دانتے کی نظم کی طرح یہاں بھی اس سانحے اور آفت میں اکٹھے آن ملنے والے لوگوں کا تعلق دنیا کے ہر ملک اور قوم سے تھا۔ سبھی کے چہرے اور جسم ایک ہی مٹی میں گھل مل گئے۔ دو سو کے قریب تو صرف پاکستانی ہی تھے۔ جن میں سے کئی کی کہانیاں سننے کو ملیں تو دل ہزار ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔

ایک پاکستانی اس روز دفتر پہنچنے میں لیٹ ہو گیا کیونکہ بچی نے خلاف توقع ضد پکڑ لی ''آج ابو ہی مجھے اسکول چھوڑیں گے' میں بس میں نہیں جاؤں گی۔'' بیٹی کی بات باپ ٹال نہ سکا اور یوں اس تباہ کن گھڑی سے بچنے میں کامیاب ہو گیا جس کا وہ بھی باآسانی شکار ہو سکتا تھا۔ اللہ کی مرضی کچھ یوں ہی تھی۔

بہت برس گزرے پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں ایک جہاز گر کر لاپتا ہو گیا جسے ایک جواں سال پائلٹ اڑا رہا تھا۔ پائلٹ اپنی تین ماہ کی بیاہتا بیوی کی منتظر آنکھوں میں سپنوں کے دیے جلتے چھوڑ آیا تھا مگر افسوس کہ وہ واپس نہ جا سکا۔ بیوی اپنی نظریں دروازے پہ ٹکائے اس کا انتظار کرتی رہ گئی۔ اس کی زندگی سے بہاریں روٹھ گئیں مگر جب خاتون

کے آنگن میں ایک پھول کھلا تو اس کی خوشبو سے اپنی زندگی معطر کر لی اور یوں زندگی میں دوبارہ مصروف ہو گئی۔

بیٹا جوان ہو کر امریکا چلا گیا اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے کسی دفتر

جلتی عمارتوں کی راکھ نے لوگوں کو بھوت بنا دیا

میں ملازمت کرنے لگا۔ گیارہ ستمبر کی خوبصورت صبح جب نیلے نیلے آسمان پہ بادل کا کوئی بھی ٹکڑا موجود نہ تھا، وہ پاکستان میں اپنی پیاری ماں سے ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا۔ یکا یک اس نے کہا ''امی جی کوئی دھماکا ہوا ہے۔'' اور پھر لائن کٹ گئی۔ یوں ہمیشہ کے لیے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا کبھی دوبارہ جاری نہ ہونے کے لیے.....

مشہور پاکستانی پاپ سنگر' جنون کے گٹارسٹ اور کمپوزر سلمان احمد کے والد اعجاز احمد نیویارک کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی ایک دوست فیملی کے جواں سال اکلوتے بیٹے تیمور بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ٹریڈنگ کا کام کرتے تھے۔ حادثے کے بعد تیمور کا عرصے تک کوئی سراغ نہ ملا مگر والدہ ظاہرہ کسی طرح یہ حقیقت قبول کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس کا لاڈلا اب کبھی دکھائی نہیں دے گا۔ اسے امید تھی کہ تیمور زندہ ہوگا اور ایک دن کہیں نہ کہیں سے اپنا ہنستا مسکراتا چہرہ لیے نکل آئے گا۔

اس نے نیویارک میں اپنے گھر کئی بار میلاد کروایا۔ بزرگوں سے رابطے کیے اور اس کے زندہ مل جانے کی دعائیں منگوائیں۔ بیٹے کے دوستوں کو منع کر دیا کہ اس کے بیٹے کو مردہ نہ سمجھیں۔ لوگ اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے تو وہ کہتی ''جب تک اس کا کوئی نشان نہ ملے، میں کیسے سمجھ لوں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' ایک ماں کا اپنی اولاد کے لیے ایسا سوچنا کتنی مشکل بات ہے، یہ ایک ماں ہی جان سکتی ہے۔ حادثے کے کئی دن گزرنے کے بعد ملبہ اٹھانے والے ایک ایسے مقام پہ جا پہنچے جہاں سیڑھیوں کے نیچے کچھ لوگ سو رہے تھے۔ ان کے جسم منتشر نہیں ہوئے تھے۔ تیمور وہیں تھا۔ شاید ماں سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت تھی۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ریستورانوں اور کیفے میں کام کرنے والے بہت سے بنگلہ دیشی ویٹر اور تہہ خانے میں ناشتے کا سامان بیچنے والی جوان بنگالی ماں جس کی ننھی بچی گھر پہ تھی' ہونے سے نا ہونے کی منزلیں طے کر گئے۔ کیا ان میں سے کسی کا بھی کوئی قصور تھا؟ ان محنت کشوں کو زہر کا پیالہ کیوں پینا پڑا؟ پتا نہیں، وہ ظالموں میں سے تھے یا مظلوموں سے، کچھ خبر نہیں اور وہ بارہ تیرہ سالہ امریکن بچی میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتی جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے اٹھتے دھوئیں کے آگے کھڑی مستقل چیخے جا رہی تھی I want my mommy (''مجھے میری امی چاہیے'')۔ اس کی ماں بھی اسی عمارت میں نوکری کرتی تھی اور لاپتا ہو چکی تھی۔

مجرم

راہ سے بھٹکے بیٹے کا سبق آموز ماجرا

سید محمد وصی

امجد پانچ بہنوں کے بعد پیدا ہوا تو گھر خوشیوں سے بھر گیا۔ بہنیں خوشی کے مارے پھولی نہیں سماتی تھیں۔ ماں باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ محلے بھر میں مٹھائی تقسیم کی گئی اور کئی دنوں تک خوشیوں کا ماحول چھایا رہا۔

امجد آہستہ آہستہ پرورش پاتا رہا اور اسکول جانے کے لائق ہو گیا لیکن پڑھائی میں اُس کا بالکل دل نہیں لگتا تھا اور نہ ہی کبھی اُس نے تعلیم کی طرف کچھ خاص توجہ دی۔ والدین اور بہنوں کے لاڈ پیار نے اُس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا لہٰذا وہ پڑھائی لکھائی کو بے کار جاننے لگا۔ والدین اپنی پوری کوشش کے باوجود اُس کو تعلیم کی طرف راغب نہ کر سکے۔

کافی سوچ بچار کی گئی کہ آخر اُس کے لیے ایسا کون سا راستہ اختیار کیا جائے جس سے وہ اپنی زندگی میں کوئی بہتر اور اچھا مقام حاصل کر لے۔ مالی وسائل اتنے اچھے بھینہ تھے کہ امجد کے لیے کوئی بہتر راہ تلاش کریں۔ آخر کار اُسے ایک موٹر سائیکل مرمت کرنے والے کے حوالے کر دیا گیا تا کہ کچھ ہنر سیکھ جائے اور آگے چل کر اپنا بوجھ خود اٹھا سکے۔ امجد وہاں بھی دل لگا کر کام نہ سیکھ سکا اور راہ فرار اختیار کر لی۔

والدین کی کہی کسی بات کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا اور وہ ایک دن گھر سے فرار ہو گیا۔ اسے بہتیرا ڈھونڈا گیا لیکن کافی کوشش کے بعد بھی اُس کا کوئی پتا نہ چلا۔ آخر ماں باپ صبر کر کے بیٹھ گئے۔ اُن کے اور خاص کر اُس کی بہنوں کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا جسے سہنا بہر حال کوئی آسان کام نہ تھا مرے ہوئے کو تو صبر آ بھی جائے مگر بچھڑے ہوؤں کو نہیں آتا۔

ادھر امجد مختلف چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث ہو گیا اور اکثر پولیس کے ہتھے چڑھ کر جیل کی ہوا کھاتا رہا۔ ایک دن اُس کی ملاقات ایسے گروہ سے ہو گئی جو قبرستان سے مردوں کے کفن چوری کیا کرتا۔ پہلے پہل تو اُسے اس کام سے بہت ڈر لگا لیکن پھر بے رحم ساتھیوں کے اکسانے پر اس نے اس کام میں ہاتھ ڈال دیا اور شہر کے مختلف قبرستانوں میں کی جانے والی ہر کارروائی کا حصہ بننے لگا۔

جب اسے اس کام کا کافی تجربہ ہو گیا تو وہ یہ کام مستقل انجام دینے لگا۔ اب اپنے کام میں ماہر ہو چکا تھا اور نڈر بھی۔ کئی مرتبہ جیل جانے کے باوجود اُس نے یہ کمر وہ دھندہ نہ چھوڑا۔

ایک دفعہ رات کے پچھلے پہر وہ اپنے کام پر نکلا اور ایک تازہ قبر کا انتخاب کیا۔ کام زیادہ مشکل نہیں تھا، اس لیے جلد ہی قبر کھود لی اور کفن اُتارنا شروع کر دیا۔ ابھی قبر بند نہیں کی تھی کہ افق پر سفیدی نمودار ہونا شروع ہو گئی۔ اتنے میں اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا کوئی شخص بالکل اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھائی تو سامنے اس کا باپ کھڑا تھا اور..... وہ قبر اُس کی ماں کی تھی۔

☆☆☆☆

لاپتا افراد کے عزیز و اقارب کتنے ہی دن تک اپنے پیاروں کی تصویریں ہاتھوں میں تھامے فلموں کی طرح، ہر ایک سے سوال کرتے ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے؟ کیا آپ کو اس کے بارے میں کوئی علم ہے؟'' افراتفری میں جو لوگ زندہ یا زخمی ملے انہیں فوراً ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہسپتالوں میں بھیج دیا گیا، یہ معلوم کیے بغیر کہ وہ کون ہیں۔ اس لیے کئی لوگوں کا عرصے تک پتا ہی نہ چل سکا کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ۔ ملبے میں سے انسانی جسموں کے ٹکڑے ڈھونڈ نکالنے کے لیے تین سو سپیشل کتے لائے گئے جو زندگی اور موت کی بو سونگھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کتوں نے دن رات ایک کر کے بڑی تندہی سے اپنا کام کیا۔

نیویارک کی عمارتیں ہر وقت سیاحوں کے کیمروں کی زد میں رہتی ہیں لہٰذا کسی نے طیاروں کے ٹکرانے کی تصاویر اور فلمیں یونہی اتفاقیہ طور پہ ہی بنا ڈالی تھیں۔ وہ کب جانتے تھے کہ وہ اس وقت تاریخ کا ایک اہم لمحہ ریکارڈ کر رہے ہیں۔

بروکلین کی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ سے مشہور زمانہ فوٹو گرافر مارک فلپس نے، جو ایسوسی ایٹڈ پریس کے مانے ہوئے فوٹو گرافر ہیں' اس روز کچھ انوکھی تصاویر بنائیں۔ وہ جائے حادثہ سے صرف تین میل دور تھے اور یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جنوری ۱۹۸۶ء میں چیلنجر خلائی جہاز روانگی کے چند لمحوں بعد تباہ ہوا' تو تب بھی مارک تین میل کے فاصلے پر موجود تھے۔ انہوں نے چیلنجر کی جلتی اور زمین پر گرتی تصویر بنا کر صحافتی دنیا میں بہت شہرت حاصل کی تھی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جلتی ہوئی عمارات کی تصاویر انہوں نے اپنے ڈجیٹل کیمرے سے کھینچیں اور اچھی طرح دیکھے بغیر ہی فوراً اپنے لیپ ٹاپ کمپیوٹر سے اخبارات کو روانہ کر دیں۔ جب تصاویر چھپیں تو مارک فلپس اور دنیا والے یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ دھوئیں میں ایک ہیبت ناک چہرے کی واضح شبیہ موجود تھی۔ مارک فلپس کہتے ہیں۔ میں ششدر رہ گیا اور میرے منہ سے ایک دم نکلا:

''Its the devil.'' (''یہ تو شیطان ہے۔'')

کچھ لوگوں نے تصویر کی حقیقت پہ شک و شبہ کا اظہار کیا کہ یہ کمپیوٹر سے تیار کی گئی ہے جس پہ مارک فلپس بہت جز بز ہوئے۔ کئی ٹی وی انٹرویوز اور اخباری بیانات میں انہوں نے وضاحت کی کہ انہوں نے تصویر کو کسی بھی طرح تبدیل نہیں کیا اور وہ اپنے پیشے کی حرمت کا پاس رکھتے ہوئے ایسا کبھی نہیں کرتے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس نے بھی ان کی بات کی تائید کرتے ہوئے یہی کہا کہ مارک فلپس فوٹو گرافی کے شعبہ میں مستند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی اچھی شہرت اور دیانت کو دیکھ کر ان کی بات پہ شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تصویر کئی مہینوں تک انٹرنیٹ پہ لوگوں کی توجہ کا باعث بنی رہی اور اس کی بابت قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ اس تصویر کی نمائش سے آمدن ورلڈ ٹریڈ سنٹر ریلیف فنڈ اور دیگر مختلف چیرٹی اداروں کو دے دی گئی۔ یہ تصویر Urban Legend ویب سائٹ پہ آج بھی دیکھ جا سکتی ہے۔

مین ہٹن ایریا کے سب اسکول غیر معینہ مدت کے لیے بند کر دیے گئے کیونکہ انہیں اب رہائشی کیمپوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ دراصل کئی عمارات میں دراڑیں پڑ گئیں لہٰذا اب وہ محفوظ نہیں رہی تھیں، اسی لیے ان کے مکین اب گھر سے بے گھر ہو کر اسکولوں میں پڑے تھے۔ نیویارک سٹی میں جگہ جگہ ایسے مراکز کھول دیے گئے جہاں لواحقین اور دیگر شہری نفسیاتی آسودگی اور راہنمائی حاصل کر سکتے تھے۔ دفاتر کھل جانے پر ہر دفتر میں میٹنگ ہوئیں جہاں لوگ اکھٹے ہوئے اور ایک دوسرے کے گلے لگ لگ کر روئے۔ عنبر اور میرے کزن شکوہ نے بتایا کہ وہ اپنے دفاتر میں ان میٹنگوں میں شریک ہوئے، مگر کسی نے ان پر انگلی نہ اٹھائی۔ انہیں اپنے غم میں برابر کا شریک ہی سمجھا۔ وہ دونوں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اظہار افسوس کرتے رہے۔

طبیعت بہت بے چین تھی اور مجھے بار بار اپنی بہن سنبل کا خیال آ رہا تھا جو بے چاری پہلی بار امریکا آئی تھی اور اب اسے اتنا بڑا حادثہ دیکھنا پڑ گیا۔ میں نے اپنے کزن ڈاکٹر نگار کے

ہاں فلاڈلفیا فون کرنے کی بہت کوشش کی مگر ٹیلی فون نظام میں بے قاعدگی کی وجہ سے رابطہ نہیں ہو پایا۔ اللہ اللہ کر کے رابطہ ہوا۔ کزن کی بیگم لبنیٰ سے بات ہوگئی جو بہت ہی ہنس مکھ نرم دل مگر نروس قسم کی خاتون ہیں۔ رنج وغم کی کوئی بات ان سے برداشت نہیں ہوتی۔ انہوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پہ حملہ ہوتے دیکھ کر ہی گھر میں ٹی وی دیکھنے پر پابندی لگا دی کیونکہ جیسے ہی وہ شعلوں میں گھرے لوگوں کی بے بسی کے مناظر دیکھتیں، رو رو کر حشر کر دیتیں۔

بُری بات سننو نہ بُری بات دیکھو کے مصداق انہوں نے یہی بہتر سمجھا کہ نہ جاننے میں راحت ہے اور جاننے میں زحمت۔ اس لیے اچھا ہے ٹی وی نہ ہی دیکھوں۔ سنبل بھی کچھ اسی قسم کا مزاج رکھتی ہے' اس لیے خوب گزر رہی تھی ان دو دیوانیوں کی۔ سنبل کو ویسے بھی ہمیشہ سے حالات حاضرہ، سیاست وغیرہ سے خاص دلچسپی نہیں رہی لہٰذا وہ بھی حالات کی سنجیدگی اور نزاکت سے بے خبر تھی۔ ہماری فیملی میں اکثر سنبل سے مذاقاً پوچھا جاتا ''سنبل تمہیں پتا ہے بھٹو مر گیا ہے'' یا یہ ''آج کل کون ہم پہ حکومت کر رہا ہے؟'' سنبل اخبار بھی یہ کہہ کر نہیں پڑھتی کہ اُسے ڈپریشن ہوتا ہے۔ جب میں نے اسے حالات کے بارے میں بتایا تو بڑے آرام سے کہنے لگی ''ہاں سنا ہے صبح نیویارک میں کوئی دھماکا ہوا ہے لیکن میں اور لبنیٰ تو شاپنگ مال جا رہے ہیں تاکہ ذرا دل بہل جائے۔ دھماکوں کا کیا ہے' پاکستان میں تو آئے روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔''

میں اپنی بھولی بہن کو کیا بتاتی کہ یہ امریکا ہے پاکستان نہیں جہاں کبھی کچھ نہیں ہوتا نہ ہوسکتا ہے۔ یہ قوم تو اللہ کی لاڈلی اور نوازی ہوئی قوم ہے۔ امریکن تو کام اور تفریح کے مزے کرو (Have Fun) ویک اینڈز منا کر زندگی کے سانس پورے کر جاتے ہیں، انہیں ایسی تباہی، بربادی، ناکامی اور شکست کا بھلا کہاں تجربہ؟ وہ نقصان اٹھانے کے خیال سے سمجھوتہ کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو اب دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے لیکن یہ سب باتیں کہہ کر میں اپنی بہن کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا چپکی ہو رہی۔

''کل پرسوں تک تو سب ٹھیک ہو جائے گا نا؟ حالات آخر نارمل ہو ہی جاتے ہیں؟'' اس نے پھر سادگی سے کہا۔

اسے کیا پتا تھا امریکن لاڈ پیار سے پلی ہوئی ایک ایسی نازک قوم ہے جسے تپتی ہوا کبھی چھو کر بھی نہیں گزری۔ جہاں دولت، آسائش، فراوانی آپ کی باندی ہے اگر آپ میں محنت کی صلاحیت ہے۔ جہاں کتے انسانوں سے زیادہ بہتر خوراک اور محبت پاتے ہیں اور کوئی رات کو بھوکا نہیں سوتا۔ اس اللہ کے لاڈلے ملک کو چند دیوانے ہائی جیکروں نے کیف دستی کی نیند سے ایک دم جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ خود کوئے یار سے نکلے اور سوئے دار چل دیے اور یوں پوری دنیا ہلا کر الٹ پلٹ کر ڈالی۔

امریکن میڈیا کو تو اللہ موقع دے، حادثہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو ہمہ وقت فوکس کر کے ناظرین کی توجہ کو خوب قابو کیا۔ خبریں' قیاس آرائیاں' تبصرے، مذاکرے، لعن طعن، الزام تراشیاں..... غرض ایک رونق سی لگ گئی میڈیا بازار میں۔ میڈیا جو کچھ بتا رہا تھا' سبھی اسے ہضم کر رہے تھے، نگل رہے تھے اور مسمرزدہ ہوئے ٹی وی سے جُڑے بیٹھے تھے۔ میڈیا سامعین، ناظرین، قارئین کو جو کچھ بتا رہا تھا وہی سچ تھا اور باقی سب جھوٹ۔ سب کو اسی پہ یقین تھا اور وہی سب کا ایمان۔

میڈیا سرکس کے اکھاڑے میں رنگ برنگے مختلف کرتب دکھائے جا رہے تھے۔ کاروبار خوب چمک رہا تھا۔ مشتاق اور خبروں کے بھوکے عوام کو معلومات کا جو بھی ٹکڑا پھینکا جاتا وہ ندیدوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑتے اور اسے کچ پکا نگل لیتے۔ امریکن میڈیا نے ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور سچ جھوٹ، ظلم وعدل کا فیصلہ گھروں کی ٹی وی اسکرینوں پہ ہی کیا جانے لگا۔ اس کے بعد دنیا میں افغانستان، عراق جنگیں شروع ہوگئیں اور آج تک دنیا میں امن قائم نہیں ہوسکا۔

دنیائے کمپیوٹر میں ہزارہا کمپنیاں نت نئے سافٹ ویئر تیار کرنے میں دن رات محو رہتی ہیں۔ ان میں کچھ قیمتاً دستیاب ہوتے ہیں اور بعض شائقین کمپیوٹر کو انٹرنیٹ پر مفت مل جاتے ہیں۔ ذیل میں ایسے مفت سافٹ ویئرز کا تعارف پیش ہے جو روزمرہ زندگی میں اکثر کام آتے ہیں۔

بہترین مفت سافٹ ویئر

شائقین کمپیوٹر کے لئے کارآمد پروگراموں کا منفرد تحفہ

ابو صارم

اینٹی مال ویئر ٹول

مال ویئر (Malware) خاص قسم کا وائرس ہے جو کمپیوٹر کے نظام میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور اُسے کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچاتا ہے۔ اس خطرناک وائرس کو ڈھونڈنے کے لیے خاص سافٹ ویئر درکار ہوتے ہیں۔ مال ویئر بائٹس اینٹی مال ویئر (Malware bytes Anti-Malware) کمپیوٹر میں چھپے بیٹھے مال ویئر وائرس کھوجنے والا بہترین مفت سافٹ ویئر ہے۔

جب یہ سافٹ ویئر انسٹال ہو جائے، تو اس کا پریمیم ایڈیشن ۱۴ دن تک کام کرتا ہے۔ اس ایڈیشن میں ریئل ٹائم اسکیننگ بھی شامل ہے۔ یہ اسکینر ہر وقت کمپیوٹر کو مال ویئر وائرس سے محفوظ رکھتا ہے مگر چودہ دن بعد ریئل ٹائم اسکیننگ موڈ ختم ہو جاتا ہے۔ اب کمپیوٹر میں پوشیدہ مال ویئر کھوجنے کی خاطر پروگرام خود چلانا پڑتا ہے۔

اس حالت میں بھی مال ویئر بائٹس بہترین سافٹ ویئر ہے۔ چنانچہ وہ نئے آنے والے مال ویئر بھی پکڑ لیتا ہے۔ اس پروگرام کو اپنے کمپیوٹر میں انسٹال کیجیے اور اُسے ہر قسم کے مال ویئر سے پاک رکھیے۔ ہفتے میں دو تین بار اس پروگرام کو ضرور چلائیے تاکہ کمپیوٹر پاک صاف رہے۔

ویڈیو ایڈیٹر

آج کل سمارٹ فون کی بہتات کے باعث ہر قسم کی محفلوں کی ویڈیو بنانا بہت سہل ہو گیا ہے مگر عموماً ویڈیو کو ایڈٹ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اُسے بہتر بنایا جا سکے۔ اس سلسلے میں مفت ویڈیو ایڈیٹر، فری ویڈیو کٹر ایکسپرٹ ۴ (Free video cutter expert 4) آپ کے بہت کام آ سکتا ہے۔ اس کا سائز صرف ۷ ایم بی ہے اور یہ ونڈوز ایکس پی سے لے کر ونڈوز ۱۰ پر بخوبی کام کرتا ہے۔

اس سافٹ ویئر میں ویڈیو ایڈٹ کرنے والے تمام آلات موجود ہیں۔ اس کی مدد سے آپ مختلف کلپ ملا کر ایک فلم بنا سکتے ہیں۔ نیز اس پر فلم کی کاٹ پیٹ بھی آسان ہے۔ یہ فلم کو ایک فارمیٹ سے دوسرے فارمیٹ میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ ویڈیو ایڈیٹر درحقیقت چھوٹی سی ورکشاپ کے مترادف ہے۔

ان انسٹالر

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر میں ڈھیروں سافٹ ویئر انسٹال ہو جاتے ہیں۔ تب اکثر اوقات سمجھ نہیں آتا کہ کس پروگرام کو رکھا اور کسے ختم کر دیا جائے۔ یہ مسئلہ ''ان انسٹالر

ویو'' (Uninstall View) سافٹ ویئر انسٹال کرنے سے حل ہوسکتا ہے۔ یہ پروگرام صرف ۹۵.۵ کلو بائٹس کا ہے۔ ونڈوز ایکس پی سے لے کر ونڈوز ۱۰ تک میں کارآمد ہے۔

یہ سافٹ ویئر آپ کے کمپیوٹر میں انسٹال کردہ تمام سافٹ ویئرز کی تفصیل سامنے لے آتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ پروگرام کی رجسٹری کس نام سے ہوئی ہے، ورژن کیا ہے، کب انسٹال ہوا اور کہاں۔ غرض وہ سارا کچھ جھٹ سامنے لے آتا ہے۔ اب آپ تمام سافٹ ویئرز کی خصوصیات جان کر غیر مطلوبہ پروگرام باآسانی ڈیلیٹ کرسکتے ہیں۔

اس مفت سافٹ ویئر کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ خاموشی سے ہر پروگرام ختم کرسکتا ہے۔ بعض سافٹ ویئر خاصے ڈھیٹ ہوتے ہیں اور آسانی سے ڈیلیٹ نہیں ہوتے مگر یہ پروگرام ان ہٹ دھرموں کو بھی نکال باہر کرتا ہے۔ یہی نہیں، یہ ایک سے زیادہ پروگرام بیک وقت ڈیلیٹ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

فائل شیئرنگ ٹول

انٹرنیٹ اب ہر کسی کی دسترس میں آچکا۔ لہٰذا کمپنیوں سے لے کر افراد تک اس کے ذریعے دفتری یا نجی نوعیت کی فائلیں بھی بھجوانے لگے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب زیادہ بڑی فائل کسی کو بھجوانی ہو، تو ہمیں کلاؤڈ سٹوریج سروس مثلاً ڈراپ باکس یا گوگل ڈرائیو کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں مگر اب ایک مفت سافٹ ویئر نے یہ مسئلہ حل کردیا ہے۔

اس سافٹ ویئر کا نام ''اوانیڈ او فائل ڈائرکٹ'' (O & O File Direct) ہے۔ یہ ۱۹.۴۶ ایم بی کا ہے اور ونڈوز ایکس پی سے لے کر ونڈوز ٹین تک میں چل جاتا ہے۔ یہ سافٹ ویئر انسٹال کیجیے اور پھر اُسے کھول لیجیے۔ جو فائل دوسرے فرد کو بھجوانی ہو، اسے ڈریگ کرکے مین انٹرفیس میں ڈال دیں۔ سافٹ ویئر ایک ویب لنک تخلیق کردے گا۔ اب آپ کا دوست اس ویب لنک کے ذریعے آپ کی فائل براہ راست ڈاؤن لوڈ کرسکتا ہے۔ تمام فائل ٹرانسفر ویب آر ٹی سی انکرپشن کے ذریعے ہوتی ہے۔

ہارڈ ڈسک کے اندر جھانکیے

جب کمپیوٹر نیا ہو، تو تیزی سے دوڑتا ہے مگر جب ہارڈ ڈسک قسم قسم کے پروگراموں سے بھر جائے، تو وہ سست رفتاری سے حرکت کرنے لگتی ہے۔ یہ سستی پھر کمپیوٹر کو بھی سست کردیتی ہے۔ اسی لیے وقتاً فوقتاً ہارڈ ڈسک کو غیر ضروری سافٹ ویئرز سے پاک کرنا ضروری ہے مگر ان کا کیسے کھوج لگایا جائے۔ اس موقع پر ''ٹری سائز فری'' (Tree Size free) سافٹ ویئر کام آتا ہے۔

یہ سافٹ ویئر ۱.۷ ایم بی جسامت کا ہے۔ ونڈوز سیون، ایٹ اور ٹین پر چلتا ہے۔ یہ سافٹ ویئر واضح طور پر بتاتا ہے کہ ہارڈ ڈسک میں فلاں فلاں سافٹ ویئر انسٹال ہیں اور ان کی جسامت اتنی ہے۔ غرض جن غیر ضروری سافٹ ویئرز نے زیادہ جگہ گھیر رکھی ہے۔ انہیں ڈیلیٹ کرکے آپ ہارڈ ڈسک اور کمپیوٹر، دونوں کی رفتار تیز کرسکتے ہیں۔

فوٹو ایڈیٹر

پاکستان میں کمپیوٹر پر تصاویر ایڈیٹ کرنے کے لیے ''فوٹو شاپ'' سافٹ ویئر سب سے مقبول ہے۔ تاہم یہ اچھی خاصی جگہ گھیرتا ہے۔ مزید برآں بعض اوقات اس میں خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

آج کل گھریلو سطح پر فوٹو ایڈیٹ کرنے والا ایک مفت سافٹ ویئر ''پینٹ ڈاٹ نیٹ'' (Paint.net) بہت مشہور ہورہا ہے۔ یہ پروگرام فوٹو شاپ کی طرح فوٹو ایڈیٹنگ کے کئی کام انجام دیتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ صرف ۷.۱۶ ایم بی کا سافٹ ویئر ہے۔ لہٰذا اِسے ڈاؤن لوڈ کرکے چلانا بہت آسان ہے۔

کمپیوٹر بیک اپ کیجیے

آج کل ایسے سافٹ ویئر آ گئے ہیں جو پوری ونڈوز کو ڈسک پارٹیشن میں محفوظ کردیتے ہیں۔ یہ محفوظ ونڈوز ''بیک

اپ'' کہلاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خدانخواستہ کبھی ونڈوز کرپٹ یا خراب ہوجائے، تو بیک اپ کے ذریعے اُسے عین پہلے کی طرح انسٹال کرلیا جائے۔ یوں ونڈوز اور سبھی سافٹ ویئرز دوبارہ انسٹال نہیں کرنے پڑتے کیونکہ ونڈو بیک اپ میں موجود ہوتے ہیں۔

دنیائے انٹرنیٹ میں بیک اپ تیار کرنے والے مفت سافٹ ویئرز بھی دستیاب ہیں مگر ماہرین کے نزدیک ان میں ''ایزایس ٹو ڈو بیک اپ فری'' (easeus todo backup free) پروگرام بہترین ہے۔ یہ انفرادی فائل سے لے کر کمپیوٹر کی پوری ونڈوز کو من پسند جگہ میں بیک اپ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے تازہ ورژن کی مدد سے یو ایس بی ڈرائیو میں بھی پورٹیبل ونڈوز تشکیل دینا ممکن ہوچکا۔ یہ سافٹ ویئر ونڈوز ایکس پی سے لے کر ونڈوز ۱۰ تک پر کارآمد ہے۔ اب تک دنیا بھر میں ساٹھ لاکھ سے زائد مردوزن اس کو ڈاؤن لوڈ کرچکے۔ یہ تیزی سے چلنے والا اور استعمال میں آسان سافٹ ویئر ہے۔

اینٹی وائرس

دنیائے انٹرنیٹ پر مختلف اینٹی وائرس پروگرام دستیاب ہیں۔ ماہرینِ کمپیوٹر سائنس کے مطابق آج کل ''بٹ ڈیفنڈر اینٹی وائرس'' کا فری ایڈیشن سب سے عمدہ اینٹی وائرس پروگرام ہے۔ یہ پروگرام رومانیہ کی کمپنی کا تخلیق کردہ ہے۔ اس سوفٹ ویئر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سسٹم پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور چپکے چپکے پس پردہ کمپیوٹر کو ہر قسم کے شیطانی پروگراموں مثلاً وائرس، وارم، ٹروجن، سپائی ویئر، روٹ کٹس وغیرہ سے محفوظ رکھتا ہے۔

تاہم یہ اینٹی وائرس انسٹال کرنے کی بعض شرائط ہیں۔ اول یہ کہ آپ کے کمپیوٹر میں ونڈوز ۷، ۸، ۹ یا ۱۰ انسٹال ہو۔ ہارڈ ڈسک میں کم از کم ۱۸۰۰ ایم بی جگہ خالی ہو۔ کمپیوٹر کی میموری ۱.۵ گیگا بائٹ ہو جبکہ اس میں انٹل ڈیولکور کا پروسیسر لگا ہو۔ انٹرنیٹ ایکسپلورر بھی ۱۰ یا اس سے اوپر کا ہونا چاہیے۔

لطیفے

سرجن صاحب بہت تیزی سے آپریشن تھیٹر میں داخل ہوئے اور عجلت آمیز لہجے میں بولے: ''دیکھو میاں! سرجری نے بہت ترقی کرلی ہے اور زمانہ بہت تیز رفتار ہوگیا ہے۔۔۔ جن مریضوں کا آپریشن میں کرتا ہوں۔ وہ اُسی روز بستر سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور پانچ منٹ میں چلتے پھرتے ہیں۔۔۔ سمجھے، کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟''

''جی ہاں! میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپریشن کے لیے مجھے لیٹنے کی مہلت دیں گے یا کھڑے کھڑے ہی آپریشن کریں گے؟'' مریض نے اطمینان سے پوچھا۔۔۔

☆☆☆

ایک چور مکان میں داخل ہوا، تجوری پر لکھا تھا دائیں والا بٹن دبائیں۔ چور نے ایسا کیا تو سائرن بجا اور چور پکڑا گیا۔ عدالت میں جج نے پوچھا ''کیا تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟ چور نے افسردہ لہجے میں کہا ''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دنیا بڑی دھوکے باز ہے۔

☆☆☆

سیاح: (ملاح سے) یہاں بڑی مچھلیاں تو نہیں ہیں؟

ملاح: جناب، بےفکر ہوکر نہایے۔ چھوٹی بڑی تمام مچھلیوں کو مگرمچھ ختم کرچکے ہیں۔

☆☆☆

دروازے پر گھنٹی بجی۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔ آنے والے صاحب نے پوچھا۔ ''امجد صاحب ہیں؟''

''جی نہیں وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''کیا سکون اور تفریح کی غرض سے گئے ہیں؟''

''میرا خیال ہے ایسا تو نہیں۔ بیگم صاحبہ بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔'' نوکر نے ادب سے جواب دیا۔

قاتل کی تلاش

شاکر لطیف

قتل کے ایک پیچیدہ کیس کی قدم قدم

پر نئے موڑ لیتی تحیّر خیز داستان

میں نے بغور مسٹر جانسن کی لاش کا جائزہ لیا۔ اس کے سینے میں خنجر دستے تک پیوست تھا۔ فرش اور کرسی پر خون بھی پھیلا ہوا تھا۔ مسٹر جانسن کو اُس وقت قتل کیا گیا جب وہ اپنی دفتری کُرسی پر براجمان تھے۔ لاش کا جائزہ لینے کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا تھا کہ قاتل نے اُن پر ایسا اچانک وار کیا تھا کہ اُنہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ملک عدم سدھار گئے۔ میرا نام جیمز ہے' سارجنٹ جیمز۔ مجھے آج صبح ہی اس بہیمانہ قتل کی اطلاع ملی۔ جس کے بعد میں اپنے ماتحت عملے کے ساتھ جائے وقوع پر موجود تھا۔

میرا ماتحت عملہ اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا۔ پورے دفتر اور خاص کر خنجر پر سے انگلیوں کے نشانات تلاش کیے جا رہے تھے۔ لاش کے آس پاس نشانات لگانے کے بعد اُسے اُٹھوانے کا بندوبست کرنا تھا تاکہ جلد از جلد پوسٹ مارٹم کروایا جا سکے۔ کچھ ہی دیر میں مجھے بتایا گیا کہ خنجر پر کسی قسم کے انگلیوں کے نشانات موجود نہیں۔ گویا قاتل نے یہ واردات انجام دیتے وقت ربڑ کے دستانے پہن رکھے تھے۔

چھان بین سے ہمیں پتا چلا' مسٹر جانسن کی بیوی کو مرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ بے اولاد تھے اِس لیے تنہا ہی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُن کی کسی کے ساتھ دُشمنی بھی نہیں تھی۔ وہ ایک ہنس مُکھ اور سب کا خیال رکھنے والے شخص تھے۔ اِن دنوں اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار چلا رہے تھے۔ یہ دفتر بھی اُنہوں نے اِسی سلسلے میں بنا رکھا تھا مگر آج اُنہیں اِس دفتر میں انتہائی بے رحمانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ کہ قتل کے وقت کمرے سے ملحق چھوٹے سے ہال میں اُن کا مختصر سا دفتری عملہ بھی موجود تھا مگر وہ سب قاتل کے بارے میں لاعلم تھے۔

قاتل کا سراغ لگانا میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔ تاہم مجھے احساس ہو چکا تھا کہ یہ کیس میرے لیے آسان نہیں' مجھے قاتل کا سراغ لگانے کے لیے پوری محنت اور جانفشانی سے کام کرنا ہوگا۔ آج مسٹر جانسن حسبِ معمول دفتر آئے تھے۔ اُن کے کمرے کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا اور کسی کو بھی بلا اجازت اُنہیں تنگ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ دفتر کی اکلوتی کھڑکی سے اپنے دفتری عملے کا جائزہ لیتے تھے۔ کھڑکی میں مخصوص طرز کا شیشہ لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمرے کے اندر سے تو باہر کا سارا منظر نظر آتا تھا مگر ہال سے اندر دیکھنا ناممکن تھا۔

اُن کی دفتر آمد کے تقریباً تین گھنٹے بعد سیکرٹری جینی کو اُن سے رابطے کی ضرورت پیش آئی۔ جینی نے پہلے تو انٹر کام کے ذریعے مسٹر جانسن سے رابطے کی کوشش کی مگر کوئی جواب نہ ملنے پر وہ اُٹھی اور کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ جانتی تھی کہ مسٹر جانسن دروازے پر دستک دینے سے ناراض بھی ہو سکتے تھے۔ اُن کا حکم تھا کہ جب تک وہ خود نہ بلائیں'

کوئی بھی اُن کے کمرے میں نہ آئے مگر کیونکہ کام بہت ضروری نوعیت کا تھا اِس لیے جینی نے اُن کی حکم عدولی کرتے ہوئے دستک دے ڈالی۔ یہ اتفاق تھا کہ دروازہ بس چوکھٹ میں پھنسا ہوا تھا۔ اِسی لیے جینی کے دستک دیتے ہی کھلتا چلا گیا۔ اندر کا بھیانک منظر دیکھتے ہی جینی کی چیخیں نکل گئیں۔ کرسی پر مسٹر جانسن کی لاش پڑی تھی اور اُن کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔

اِس کے بعد پولیس کو اطلاع کرنے میں دیر نہ لگائی گئی۔ اب میں یہاں پہنچ کر اپنی تفتیش کا آغاز کر چکا تھا۔ میں نے دفتر کے مین گیٹ پر لگے سی سی ٹی وی کیمرے کی ریکارڈنگ دیکھ لی تھی۔ آج مسٹر جانسن کے مختصر سے دفتری عملے کے علاوہ کوئی بھی یہاں نہیں آیا تھا۔ دفتر میں داخلے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ مجھے یہی لگتا تھا کہ مسٹر جانسن کو اُن کے ملازمین میں سے ہی کسی نے قتل کیا ہے مگر کس نے اور کیوں' اِس سوال کا جواب مجھے ہر صورت تلاش کرنا تھا۔

قتل کے پیچھے کوئی نہ کوئی جذبہ کارفرما ہوتا ہے..... نفرت، انتقام، دُشمنی، یا لالچ۔ اگر مسٹر جانسن کو ملازمین میں سے کسی نے قتل کیا تھا تو اس کے پیچھے بھی کوئی جذبہ کارفرما تھا۔ مسٹر جانسن کی سیکرٹری مس جینی نے سب سے پہلے لاش کو دیکھا تھا۔ وہ ایک کمزور اور لاغر سی خاتون تھی۔ اس قدر طاقت ور نہیں تھی کہ کسی کے سینے میں ایک ہی وار سے خنجر دستے تک پیوست کر سکتی۔ اِس کے علاوہ ایک مسٹر ڈیوڈ تھے اور دوسرے مسٹر جارڈن! دونوں ہی خاصے بوڑھے تھے۔ بظاہر نہیں لگتا تھا کہ وہ قتل جیسے بھیانک جُرم کا ارتکاب کر سکتے ہوں۔ مگر آج باہر سے دفتر میں اور کوئی آیا بھی نہیں تھا۔

اُن سب کا مشترکہ بیان یہی تھا کہ آج مسٹر جانسن کے دفتر آنے کے بعد کوئی اُن کے کمرے میں نہیں گیا۔ میں ایک طرف کھڑا اِس عجیب و غریب قتل کی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرا ماتحت گیری پاس آیا۔ گیری ایک ذہین پولیس افسر تھا اور قتل کے کئی مشکل کیس حل کر چکا تھا مگر اب اُس کے چہرے پر بھی اُلجھن کے تاثرات موجود تھے۔

''سر مجھے نہیں لگتا کہ یہ قتل اِن تینوں میں سے کسی نے کیا ہے۔ مسٹر جانسن کے سینے میں جس طرح سے وار کیا گیا یہ کسی بہت طاقتور شخص کا کام ہے۔ جب کہ یہ تینوں ہی جسمانی طور پر خاصے کمزور سے دکھائی دیتے ہیں۔ مسٹر ڈیوڈ تو اتنے بوڑھے ہیں کہ اُن سے ٹھیک طرح سے چلا بھی نہیں جاتا۔'' گیری نے متذبذبانہ لہجے میں کہا۔

''میں بھی اِسی بات پر غور کر رہا ہوں۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ بات بھی باعثِ اُلجھن ہے کہ مسٹر جانسن نے مرنے سے پہلے مزاحمت کیوں نہیں کی؟ اگر ایک شخص اُن کے دفتر میں خنجر سمیت داخل ہوا تھا تو وہ شور مچا سکتے تھے۔ اپنی جان بچانے کے لیے کوشش کر سکتے تھے۔ مگر یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ کرسی سے اُٹھے ہی نہیں اور انہوں نے قاتل کو خود پر وار کرنے کا پورا موقع دیا۔''

''سر ممکن ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھے اُونگھ رہے ہوں۔ اُنہیں قاتل کے اپنے سر پر پہنچنے کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ قاتل نے اُن کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر خنجر سے وار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دفتر کے عملے میں سے کسی نے اُن کی آخری چیخ بھی نہیں سُنی۔''

''تمہاری باتوں میں وزن ہے۔'' میں نے کہا ''مگر یہ سوال اب بھی اپنی جگہ پر موجود ہے کہ یہ قتل کس نے کیا؟ مسٹر جانسن کے دفتری عملے میں سے کوئی بھی قتل جیسا بھیانک جُرم کرنے کے قابل نہیں۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ قاتل مسٹر جانسن کے کمرے میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر کیسے داخل ہوا؟

''سر کہیں ایسا تو نہیں اِس دفتر میں داخلے کا کوئی خفیہ راستہ بھی موجود ہو۔'' گیری کے الفاظ نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''یہ ہو سکتا ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''تم میرے ساتھ آؤ۔'' یہ کہتے ہوئے میں ایک طرف بیٹھے مسٹر

جارڈن، مسٹر ڈیوڈ اور مس جینی کی طرف بڑھ گیا۔ اِس وقت اُن تینوں کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔ شاید اُنہیں بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ پولیس اُن پر شک کر رہی ہے۔

''میں آپ تینوں سے ایک اہم سوال کرنے والا ہوں۔ ذرا سوچ کر جواب دیجیے گا۔ کیا مسٹر جانسن کے دفتر میں آنے جانے کا کوئی خفیہ راستہ موجود ہے۔''

''ہم ایسے کسی بھی خفیہ راستے سے لاعلم ہیں۔'' مسٹر ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ''یہ دفتر تین سال پہلے ہی تعمیر کیا گیا ہے۔ تاہم میں اُس شخص کو جانتا ہوں جس نے دفتر کا نقشہ بنایا تھا۔ ہوسکتا ہے شاید وہ اِس بارے میں آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ کر سکے۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے چونک کر استفسار کیا۔

''اُس کا نام چارلی ہے۔ وہ نقشے بنانے اور دفاتر ڈیزائن کرنے کا کام کرتا ہے۔ اُس کا دفتر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' مسٹر ڈیوڈ نے جواب دیا۔

''آپ مجھے چارلی کے دفتر کا پتا بتا دیں''۔ میں نے کہا۔ مسٹر ڈیوڈ نے فوراً پتا لکھوا ڈالا۔ میں نے مقتول مسٹر جانسن کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے کی ذمہ داری اپنے دیگر ماتحت عملے کے سپرد کی اور خود گیری کے ہمراہ چارلی سے ملنے روانہ ہوگیا۔

چارلی تیس بتیس سال کا ایک خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ اُس نے خوش دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ میں نے اُسے اپنا اور گیری کا تعارف بطور ایک پولیس افسر کروایا اور پھر اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''آپ کا خیال درست ہے۔'' اُس نے سنجیدہ لہجے میں انکشاف کیا۔ ''مسٹر جانسن کے دفتر میں ایک خفیہ راستہ موجود ہے۔ یہ راستہ اُنہوں نے خاص طور پر تعمیر کروایا تھا۔ وہ کبھی کبھی اِس راستے کا استعمال کرتے تھے۔ دفتری عملہ اِس مغالطے میں رہتا کہ وہ اپنے کمرے میں موجود ہیں اور کھڑکی کے شیشے سے اُن پر نظر رکھے ہوئے ہیں لہٰذا وہ سب مستعدی سے کام کرتے رہتے اور شاید مسٹر جانسن نے خفیہ راستہ اس لیے تعمیر کروایا کہ اگر وہ باہر بھی چلے جائیں تو اُن کا دفتری عملہ اُنہیں موجود سمجھ کر مستعدی سے کام کرتا رہے۔ مجھے کچھ دیر پہلے ہی اُن کے قتل کی اطلاع ملی ہے۔ میرے اُن سے دیرینہ مراسم تھے۔ اُن کی موت کا جان کر بہت افسوس ہوا۔''

''چارلی، کیا تم بتا سکتے ہو کہ اِس خفیہ راستے سے تمہارے اور مسٹر جانسن کے علاوہ کون کون واقف تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرے خیال میں رابرٹ اِس خفیہ راستے کے بارے میں جانتا تھا۔'' چارلی نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

''یہ رابرٹ کون ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مقتول مسٹر جانسن کا بھتیجا اور جہاں تک میری معلومات ہیں، اب مسٹر جانسن کی تقریباً اسی فیصد دولت کا مالک بھی۔'' چارلی نے کہا۔

چارلی نے شاید یونہی روانی میں یہ بات کر دی تھی مگر میرے لیے یہ بات بہت اہم تھی کہ مسٹر جانسن کی موت کا سب سے زیادہ فائدہ اُن کے رابرٹ نامی بھتیجے کو ملے گا۔ ہر قتل کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ رابرٹ نے جائیداد کی خاطر مسٹر جانسن کو راستے سے ہٹا دیا۔

چارلی نامی اُس نوجوان سے ملاقات ضائع نہیں گئی تھی۔ میں نے تعاون پر اُس کا شکریہ ادا کیا اور پھر گیری کے ہمراہ واپس مسٹر جانسن کے دفتر پہنچ گیا۔ میرے ماتحت عملے نے اُن کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ اب دفتر کو سیل کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

میں چارلی سے اُس خفیہ راستے کے متعلق معلوم کر چکا تھا۔ اب اُسے دیکھنا بھی ضروری تھا۔ کچھ ہی دیر میں، میں نے اُس راستے کو کھول لیا۔ یہ راستہ مسٹر جانسن کے دفتر کی عقبی جانب سے براہ راست اُن کے کمرے میں کھلتا تھا۔ عقبی اور داخلی دروازے کو اِس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ بظاہر دیوار ہی

محسوس ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اور گیری کو بھی یہ راستہ نہیں مِل سکا تھا مگر چارلی نامی اُس نوجوان نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا لیکن اِس خفیہ راستے کی اچھی طرح پڑتال کے باوجود مجھے ایسا کوئی ثبوت نہیں مِل سکا جو قاتل کی گرفتاری میں معاون ثابت ہوسکتا۔

میں نے گیری کو تاکید کی کہ کل تک وہ رابرٹ کے بارے تمام معلومات حاصل کر لے۔ خاص کر یہ بات بھی جاننے کی سعی کرلے کہ آج صبح نو بجے سے بارہ بجے تک وہ کہاں تھا۔ مسٹر جانسن کا قتل اِسی دوران ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ میں نے رابرٹ، مسٹر جانسن اور اُن کے دفتری عملے کا فون ریکارڈ حاصل کرنے کا بھی کہہ دیا۔ میں پھر گھر روانہ ہوگیا۔ آج کی بھاگ دوڑ نے مجھے تھکا دیا تھا اور اب میں آرام کرنا چاہتا تھا۔

اگلی صبح جب میں اپنے دفتر پہنچا تو گیری تمام معلومات حاصل کر چکا تھا۔ چارلی نے درست کہا تھا، مسٹر جانسن کی موت کے بعد اُن کی اسی فیصد جائیداد کا مالک اب رابرٹ ہی تھا۔ وہ شہر سے چالیس کلومیٹر دور واقع ایک قصبے میں رہائش پذیر تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ کل سارا دِن وہ اپنے قصبے میں ہی موجود رہا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک وہ اپنے قصبے میں ایک فٹ بال میچ کھیلتا رہا۔ گویا جب مسٹر جانسن قتل کیا گیا تو وہ شہر میں نہیں تھا۔ معاملات اب مزید اُلجھ گئے تھے۔ پراسرار قاتل نے اپنے پیچھے کوئی ایسا سراغ ہی نہیں چھوڑا تھا جس کی مدد سے اُسے تلاش کیا جاسکتا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا گیری سے اِس سلسلے میں گفت وشنید کرنے لگا۔

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ رابرٹ نے مسٹر جانسن کو راستے سے ہٹانے کے لیے کسی کرایے کے قاتل کی خدمات حاصل کی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔'' گیری نے جواب دیا۔ ''رابرٹ کے بارے اب تک میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں، اُن کے مطابق وہ شریف النفس نوجوان ہے۔ اُس کا کوئی پولیس کرمنل ریکارڈ بھی نہیں۔ میں نے اُس کا فون ریکارڈ بھی چیک کیا ہے، جس وقت مسٹر جانسن کا قتل ہوا، اُس نے پورے دِن شہر میں کسی کو فون نہیں کیا۔ اگر کرایے کا قاتل یہ کام انجام دیتا تو اُس کا رابرٹ سے فون پر ضرور رابطہ ہوتا مگر نہ اُس نے شہر میں کسی کو فون کیا نہ شہر سے اُسے کوئی فون کیا گیا۔ تاہم مسٹر جانسن کے ایک دوسرے رشتے دار کا بھی پتا چلا ہے۔ مسٹر جانسن کی جائیداد کا باقی بیس فیصد حصہ اُسے ہی ملنے والا ہے۔ اُس کا نام ٹامی ہے۔ وہ ایک عادی شراب نوش اور جواری ہے اور کئی مرتبہ جیل کی ہوا بھی کھا چکا۔ ہوسکتا ہے اُس نے بیس فیصد جائیداد حاصل کرنے کے لیے ہی مسٹر جانسن کو قتل کر دیا۔''

''ٹامی ایک مجرم ہے۔ اُس سے ایسی توقع کی جاسکتی ہے۔ تم نے اہم معلومات حاصل کی ہیں۔'' میں نے گیری کو داد دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر ایک اہم سوال ابھی باقی ہے۔ وہ یہ کہ کیا ٹامی جانتا تھا، مسٹر جانسن کا دفتر ایک خفیہ راستہ رکھتا ہے؟''

''سر، اِس بارے میں جاننے کے لیے ہمیں دوبارہ چارلی سے مِلنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ ٹامی کے بارے میں بھی جانتا ہو۔''

''تو پھر چلو۔'' میں نے دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم چارلی کے دفتر میں موجود تھے۔

ٹامی کے متعلق ہمارا سوال سُن کر وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یاد پڑتا ہے، جب مسٹر جانسن کا دفتر تعمیر کیا جا رہا تھا تو ٹامی نام کا ایک نوجوان وہاں آیا کرتا تھا۔ اِس لیے ممکن ہے، وہ بھی اِس خفیہ راستے سے واقف ہو۔ اِس راستے کو باہر سے بھی باآسانی کھولا جاسکتا ہے۔''

چارلی نے پھر اہم معلومات فراہم کر دی تھیں۔ میں نے معنی خیز نظروں سے گیری کی جانب دیکھا۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ''سر! اگر یہ قتل ٹامی نے ہی کیا ہے تو پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ رابرٹ کو بھی راستے سے ہٹا دے کیونکہ رابرٹ کی موت

سے ٹامی ساری جائیداد کا مالک بن جائے گا اگر وہی قاتل ہے تو پھر وہ صرف بیس فیصد پر ہی اکتفا نہیں کرے گا۔''

جب گیری نے یہ بات کہی تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اُس کا خدشہ حقیقت کا روپ دھارنے والا ہے۔ اُس وقت تو ہم چارلی کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گئے مگر اگلے دِن مجھے صبح سویرے دفتر پہنچنا پڑا۔ گیری نے مجھے فون پر اطلاع دی تھی کہ آج صبح رابرٹ کو اُس کے قصبے میں گولی مار کے قتل کر دیا گیا ہے۔ کسی نے بھی قاتل کو نہیں دیکھا۔ وہاں کی پولیس اس کی تلاش میں سرگرم ہو چکی ہے۔

رابرٹ کی موت میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھی تمام حالات اور واقعات یہ اشارہ کر رہے تھے کہ ٹامی نامی نوجوان مجرم ہے جو اب مسٹر جانسن کی ساری جائیداد کا مالک بننے والا تھا۔ گویا اُس نے اپنے راستے کی آخری رکاوٹ بھی ہٹا دی تھی۔ گیری بضد تھا کہ اب ٹامی کو گرفتار کر لینا چاہیے۔ مسٹر جانسن کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ چکی تھی۔ اس کے مطابق اُن کی موت کی وجہ سینے میں پیوست ہونے والا خنجر ہی تھا۔ وہ موت سے پہلے کسی درد کش دوا کے زیر اثر بھی تھے۔ رپورٹ کے مطابق یہ دوا انسان پر غنودگی طاری کر دیتی ہے۔ اب بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ شاید اِسی لیے مقتول مسٹر جانسن کو آخری وقت تک قاتل کے اپنے سر پر پہنچنے کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

تم ٹامی کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ آج وہ رابرٹ کے قصبے کی جانب گیا تھا تو اُسے عدالت میں مجرم ثابت کرنا آسان ہو جائے گا۔ میں ذرا مسٹر جانسن کو موت سے قبل کی جانے والی فون کالز کا ریکارڈ دیکھ لوں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی میز کی دراز سے وہ فائل نکال لی جو میری ہدایت پر گیری نے تیار کی تھی۔

مسٹر جانسن نے موت سے قبل آخری دو فون ایک ہی نمبر پر کیے تھے۔ ''یہ نمبر کس کا ہے؟'' میں نے گیری سے سوال کیا۔

گیری نے جواب دیا ''مسٹر جانسن نے مرنے سے پہلے آخری دو مرتبہ جس شخص کو کال کی تھی، اُس کا نام مارتھر ہے۔ وہ سونے کا تاجر ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے ہنکارہ بھرا اور پھر کچھ دیر تک سوچنے کے بعد فون اُٹھایا اور وہ نمبر ملا دیا۔ کچھ دیر تک بیل جاتی رہی اور پھر فون اُٹھا لیا گیا۔ میں نے بلند آواز کرنے کا بٹن دبا دیا تاکہ گیری بھی گفتگو سُن سکے۔

''ہیلو کیا آپ مسٹر مارتھر بول رہے ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جی ہاں، آپ کون؟'' دوسری طرف سے جواب دیتے ہی سوال کر دیا گیا۔

''مسٹر مارتھر، میں سارجنٹ جیمز بول رہا ہوں۔ میں مسٹر جانسن کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ اُن کے فون ریکارڈ کے مطابق اُنہوں نے اپنی موت سے قبل دو مرتبہ آپ کو فون کیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ فون کس سلسلے میں کیے گئے تھے؟''

''جی بالکل پولیس سے تعاون کرنا تو میرا فرض ہے۔'' مارتھر نامی اُس شخص نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ ''دراصل مسٹر جانسن کچھ سونا خریدنا چاہتے تھے تقریباً دو لاکھ ڈالر کی مالیت کا۔ میں سونا لے کر اُس دِن اُن کے دفتر آنے والا تھا۔ اُنہوں نے مجھے دونوں فون بھی اِسی سلسلے میں کیے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ بینک سے رقم نکلوا کر اپنے دفتر میں میرا انتظار کر رہے ہیں مگر میں نے اُس دِن آنے سے معذرت کر لی کیونکہ اچانک میرے ایک عزیز چل بسے اور مجھے ان کی آخری رسومات میں شرکت کرنے جانا پڑا۔ بعد میں اُن کے قتل کی اطلاع ملی تو بے حد افسوس ہوا۔''

مسٹر مارتھر کے اِس انکشاف نے کہ جس دِن مسٹر جانسن قتل ہوئے تھے اُنہوں نے بینک سے دو لاکھ ڈالر کی خطیر رقم نکلوائی تھی مجھے اور گیری کو ایک بار پھر بُری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی تک ساری تفتیش کا دائرہ رابرٹ اور ٹامی تک

محدود رہا تھا مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ ہم اب بھی مسٹر جانسن کے قاتل سے بہت دور ہیں۔ ہماری تفتیش لمحہ بہ لمحہ رُخ تبدیل کر رہی تھی۔

''مگر ہمیں تو لاش کے پاس سے کوئی رقم نہیں ملی۔ پھر آپ بینک کے ذریعے بھی تو رقم وصول کر سکتے تھے۔ آپ نے نقد رقم کا تقاضا کیوں کیا؟'' میں نے مسٹر مارتھر سے سوال کیا۔

''اُنہوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ رقم کے ساتھ اپنے دفتر میں موجود ہیں۔ رقم برآمد نہ ہونے کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ممکن ہے اُنہیں قتل کرنے والا رقم بھی لے اُڑا۔ جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو ہم سونے کے تاجر ٹیکس وغیرہ سے بچنے کے لیے نقد سودے کو ترجیح دیتے ہیں۔'' مارتھر نے جواب دیتے ہوئے وجہ بھی بتا دی۔

''مسٹر جانسن کا اکاؤنٹ کون سے بینک میں ہے؟'' میں نے سوال کیا تو مسٹر مارتھر نے بینک کا نام اور برانچ نمبر بھی بتا دیا۔

''بہت بہت شکریہ مسٹر مارتھر اگر ضرورت پڑی تو آپ سے دوبارہ بھی رابطہ کیا جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون کریڈل پر رکھ دیا۔

''سر یہ معاملہ تو کسی اور طرف چل نکلا ہے۔'' گیری نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ فون کا اسپیکر بلند آواز پر تھا۔ اُس نے بھی ساری گفتگو سنی تھی۔

''ہاں'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''معاملات اب مزید اُلجھ گئے ہیں۔ اگر یہ قتل اِس رقم کے لیے کیا گیا تو پھر یہ جائیداد کا چکر نہیں مگر پھر مسٹر جانسن کے بھتیجے رابرٹ کو کس نے قتل کر ڈالا؟''

''ہو سکتا ہے سر، وہ کوئی دوسرا چکر ہو۔ اُس کی کسی کے ساتھ ذاتی دُشمنی ہو۔''

''نہیں گیری۔'' میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا ''دونوں قتل یکے بعد دیگرے کیے گئے ہیں۔ وقت کی یہ مماثلت ظاہر کرتی ہے کہ دونوں قتل ایک ہی آدمی نے کیے ہیں۔ بظاہر ہمارا سارا شک وشبہ ٹامی نامی اُس نوجوان پر ہی جا رہا ہے۔ وہ اب مسٹر جانسن کی ساری جائیداد کا وارث ہے مگر رقم کا قصہ سامنے آنے کے بعد مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ بہت گہرا چکر ہے۔ ہم اِس معاملے کو جتنا سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں یہ اتنا ہی اُلجھتا جا رہا ہے۔ ہمارا واسطہ ایک شاطر قاتل سے ہے۔''

''سر، میرے خیال میں ٹامی کو گرفتار کر کے تفتیش کی جائے۔ ہو سکتا ہے، پوچھ گچھ کے دوران اُس سے کام کی کوئی بات معلوم ہو جائے۔ یہ بات خارج از امکان نہیں کہ یہ قتل ٹامی نے ہی کیا ہو اور دو لاکھ ڈالر کی رقم وہ بونس کے طور پر لے اُڑا ہو۔'' گیری نے اپنی رائے پیش کی۔

''تمہاری بات میں وزن ہے، میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''اگر ہمیں رقم کے متعلق علم نہ ہوتا تو ہمارا سارا شک اُسی پر جا رہا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ جائیداد کے لیے مسٹر جانسن کو مارنے آیا ہو۔ اُسے رقم کی موجودگی کا سرے سے علم نہ تھا۔ یہ پیسے اُس کے ہاتھ دوران قتل بونس کے طور پر ہی لگ گئے۔ رابرٹ کا قتل اُسی کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔''

''سر'' اسی لمحے گیری اپنی کرسی سے اُچھل پڑا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے حیرت سے استفسار کیا۔

''سر، میرے ذہن میں ایک اہم نکتہ آیا ہے۔ اگر یہ قتل رقم حاصل کرنے کے لیے کیا گیا ہے تو پھر قاتل کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ اُس دِن بینک سے رقم نکلوا کر اپنے دفتر میں جا رہے ہیں۔ یقیناً جس وقت مسٹر جانسن بینک سے رقم نکلوا رہے تھے، وہ قاتل بھی وہاں موجود تھا۔ ممکن ہے رابرٹ کا قتل ہمیں محض اُلجھانے کے لیے کیا گیا ہو۔''

گیری نے بہت اہم نکتہ اُٹھایا تھا۔ میں بھی پرجوش انداز میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب ہمیں فوراً بینک جا کر اُس دِن کی سی سی ٹی وی ریکارڈنگ دیکھنی تھی۔ مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ تھا۔ میں اور گیری فوراً بینک روانہ ہو گئے۔

تقریباً دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ بینک منیجر نے یہ جاننے کے بعد کہ ہم پولیس والے ہیں ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا اور ہمیں اپنے آفس میں بٹھایا۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے ہمیں اُس دِن کی سی سی ٹی وی ریکارڈنگ بھی فراہم کر دی جب مسٹر جانسن بینک سے رقم نکلوانے آئے تھے۔

میں اور گیری بغور اُس ویڈیو ریکارڈنگ کا جائزہ لے رہے تھے۔ ویڈیو میں مسٹر جانسن کاؤنٹر کے پاس کھڑے نظر آرہے تھے کاؤنٹر مین نے رقم گن کر اُن کے حوالے کی تو وہ ایک سائڈ پر ہو گئے۔ اِسی لمحے ایک شخص اُن کے پیچھے آکر کھڑا ہوا۔ اُس نے مسٹر جانسن سے باقاعدہ مصافحہ کیا اور دونوں کے درمیان کچھ دیر تک بات چیت بھی ہوئی۔ جیسے ہی اُس شخص کا چہرہ واضح ہوا میں اور گیری اپنی کرسیوں سے گرتے گرتے بچے۔ یہ شخص تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

بینک سے واپسی کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی میں نے اپنی پوری پولیس فورس کے ساتھ چارلی کے دفتر پر چھاپہ مارا اور نہ صرف اُسے گرفتار کرلیا بلکہ اُس کے دفتر کے ایک خفیہ سیف سے مسٹر جانسن کے دولاکھ ڈالر بھی برآمد کر لیے۔ عدالت میں اُسے سزا دلوانے کے لیے یہ برآمد شدہ رقم ہی کافی تھی۔ چارلی سے تفتیش کے بعد بہت سے تشنہ رہ جانے والے سوالات کے جوابات بھی مِل گئے۔

اُس دِن چارلی اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں بینک آیا تھا مگر مسٹر جانسن کو رقم نکلواتے دیکھ کر اُس کی نیت فتور آگیا۔ اُس نے باتوں باتوں میں مسٹر جانسن سے یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ رقم لے کر کہاں جارہے ہیں۔ چارلی کے پاس کوئی ریوالور نہیں تھا۔ اِسی لیے اُس نے خنجر سے ہی واردات کو انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ باقی کا کام آسانی سے ہو گیا کیونکہ وہ مسٹر جانسن کے دفتر میں داخلے کے خفیہ راستے سے واقف تھا اِس لیے وہ خاموشی سے وہاں داخل ہوا۔ مسٹر جانسن اپنے دفتر میں آچکے تھے اور کرسی پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ چارلی نے ایک ہاتھ اُن کے مُنہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے پوری قوت سے خنجر مسٹر جانسن کے سینے میں پیوست کر دیا۔ مسٹر جانسن چند لمحوں کے لیے تڑپے اور پھر ساکت ہو گئے۔ جب کہ چارلی رقم لے کر چلتا بنا۔ واردات کے وقت اُس نے ربڑ کے دستانے پہن رکھے تھے اِسی لیے پولیس کو اُس کے فنگر پرنٹس نہیں مِل سکے۔

جب ہم اُس سے ملنے گئے تو اُس نے بڑی چالاکی سے ہماری توجہ مسٹر جانسن کے بھتیجے کی جانب مبذول کروا دی۔ جب اُس نے اگلی ملاقات میں محسوس کیا کہ ہم مسٹر جانسن کے دوسرے رشتے دار ٹامی پر شک کر رہے ہیں اور گیری نے مجھ سے اِس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ کہیں ٹامی ساری جائیداد حاصل کرنے کے لیے رابرٹ کو بھی راستے سے نہ ہٹا دے تو اُس نے ٹامی پر ہمارے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے ایک بھیانک کھیل کھیلا۔ اُس نے ایک کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کیں اور رابرٹ کو قتل کروا دیا۔ اُس کی یہ چال کامیاب رہی اور ہم نے اپنی ساری توپوں کا رخ ٹامی کی جانب کر دیا مگر آخرکار بینک سی سی ٹی وی فوٹیج نے سارا بھانڈا پھوڑ دِیا۔

چارلی سے مزید تفتیش کے بعد اُس کرایے کے قاتل کو بھی گرفتار کرلیا گیا جس نے چند پیسوں کے لیے رابرٹ کو مارا تھا۔

اب چارلی اور وہ کرایے کا قاتل جیل میں ہیں جب کہ مسٹر جانسن اور اُن کا بھتیجا رابرٹ چارلی کے لالچ کی بھینٹ چڑھ کر منوں مٹی تلے دفن ہو چکے۔ سب ہی نقصان میں رہے سوائے ایک شخص کے اور وہ ہے ٹامی جواب مسٹر جانسن کی ساری جائیداد کا مالک بن چکا۔ ٹامی ایک عادی شراب نوش اور جواری ہے۔ ایسے انسان کے پاس اچانک اتنی دولت آجائے تو وہ اِس کا کیا کرے گا؟ اِس بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ مالِ مفت، دلِ بے رحم۔

جنگ ستمبر

لاہور ریڈیو میدانِ جنگ میں

تجمل حسین

اکیاون برس قبل کے ڈرامائی دنوں کی جھلکیاں جب شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں نے اپنے قلم و جذبات سے عدو کو منہ توڑ جواب دیا

یہ مئی ۱۹۶۵ء کی بات ہے' میں اپنے ایک دفتری کام کے سلسلے میں مری پہنچا۔ شام کے وقت جنرل [اختر] ملک کے گھر فون کیا جو میرے بڑے قریبی دوست تھے۔ [بیگم] نے بتایا کہ وہ تو دفتر میں بیٹھے ہیں۔ وہاں فون کیا اور اپنی [آمد] کی اطلاع دی۔ کہنے لگے' تمہیں آج ہی آنا تھا؟ میں تو [چار] روز تمہیں مل نہ سکوں گا، بڑے ضروری کام میں مصروف [ہوں]۔ مجھے مایوسی کے علاوہ حیرت بھی ہوئی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے [کے] بعد اُن کا فون آیا کہ اگر تم مجبور نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں [آدھ] ایک گھنٹے کے لیے آسکتا ہوں۔

آخر وہ چلے آئے اور محفل چونکہ بے تکلف دوستوں کی [تھی] ہوئی تھی لہٰذا دلچسپ رہی۔ تین بجے تک بیٹھے رہے اور پھر [ایک] دم اُٹھ کھڑے ہوئے کہ مجھے تو ابھی مری سے باہر جانا [ہے]۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کور کمانڈر بھی اپنی موٹر مال روڈ پر نہیں [لا] سکتا تھا لہٰذا اسے طویل راستے سے چھاؤنی پہنچنا ہوتا تھا۔ [جنرل] صاحب پھر دو دن نظر نہیں آئے اور میں بھی واپس راولپنڈی چلا گیا۔

پنڈی پہنچ کر بھائی الطاف گوہر سے میں نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا مجھے تو شک گزر رہا ہے کہ کشمیر میں کچھ ہونے والا ہے۔ انہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کچھ دنوں بعد میرے شک کو تقویت ملی اور کشمیر میں جنگ شروع ہوگئی۔ بھائی گوہر کی لاعلمی کا اعلان مجھے عجیب سا لگا۔ ملنے پر انہوں نے بتایا کہ اس وقت انہیں واقعی علم نہیں تھا۔ جنگ کی ساری تیاری بھٹو صاحب' ایڈمرل اے۔ آر خان وزیر دفاع، عزیز احمد سیکرٹری وزارت خارجہ اور جنرل اختر ملک کر رہے تھے۔ جنرل موسیٰ کمانڈر اِن چیف اور صدر ایوب خان کو چیدہ چیدہ باتیں بتائی جاتیں۔ پانچوں کے گٹھ جوڑ کا یہ فیصلہ تھا کہ الطاف گوہر کو اس کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ صدر صاحب کو اس کے خلاف مشورہ دیں اور سارا کیا دھرا خراب ہو جائے۔

الطاف بھائی کو اس بات کا پتا تب چلا جب ملٹری انٹیلی

جنس کے چیف جنرل ریاض اور بریگیڈیئر ارشاد نے انہیں آزاد کشمیر ریڈیو فوراً لگانے کا کہا۔ پوچھنے پر انہیں بتایا گیا کہ جنگ کا سارا انتظام پکا کرلیا گیا ہے اور جنرل اختر ملک دو دن میں اکھنور تک قبضہ کرلیں گے۔ ہمارے سویلین کپڑوں میں فوجی سری نگر تک پہنچ چکے ہوں گے۔ انہوں نے صرف یہ پوچھا کہ کشمیر کے لوگوں کو بھی تیار کرلیا گیا ہے؟ بتایا گیا کہ سارا کام آنکھ جھپکنے میں ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے عزیز احمد اور آغا شاہی نے ایک رپورٹ میں دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ بھارت بین الاقوامی بارڈر پر حملہ نہیں کرے گا، لہٰذا سب خیریت ہے۔

بھائی گوہر آزاد کشمیر ریڈیو مری میں لگا استاد یوسف ظفر کو وہاں ڈائریکٹر مقرر کر واپس اسلام آباد آرہے تھے تو انہوں نے ریڈیو سری نگر سے چار پاکستانی فوجیوں کو یہ بتاتے ہوئے سنا کہ وہ وہاں کیسے آئے' کیسے پکڑے گئے اور ان کا پروگرام کیا ہے۔ بھائی گوہر نے یہ سن کر چلتی موٹر ہی سے بریگیڈیئر ارشاد کو فون کر دیا جو رابطے میں تھا۔ اُسے بتایا تو بریگیڈیئر ارشاد نے صرف یہ کہا کہ غداروں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ چونکہ جنرل اختر ملک کی کمان میں اکھنور پر قبضہ ہونے والا تھا لہٰذا دو دن بعد بھارت نے لاہور پر حملہ کر دیا اور باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ ماہ جون میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں فیض صاحب کراچی سے تشریف لائے اور میرے ہاں مقیم ہوئے۔ ۶ جون کو میں تو حسب دستور آٹھ بجے دفتر چلا گیا مگر فیض صاحب دس بجے کے قریب تشریف لائے۔ ان کے بیٹھتے ہی ہمارے سروں پر طیارے اڑنے کی آوازیں آنی شروع ہوئیں اور کئی زوردار دھماکے ہوئے۔ ہم دونوں یہ سمجھے کہ شہر پر بمباری ہو رہی ہے (بعد میں پتا چلا کہ وہ دھماکے بھارتی جہازوں کے ساؤنڈ بیریئر کراس کرنے سے ہوئے تھے)۔

فیض صاحب کرسی سے اٹھ کر کمرے میں دائیں بائیں چلنے لگے اور بار بار کہتے کہ یہ تو شہروں پر باقاعدہ بمباری ہے۔ پھر مجھے حکم دیا کہ الطاف گوہر صاحب سے پتا کروں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ وہ تو ڈھاکا گئے ہوئے ہیں لیکن میں ان کے دفتر فون کر کے پتا چلاتا ہوں کہ ان کا پروگرام کیا ہے۔ فون کیا تو سیکرٹری نذیر صاحب نے بتایا کہ وہ تو صبح آگئے تھے۔ دفتر ہی میں ہیں اور فون ملا دیا۔ میں نے پنجابی میں پوچھا کہ یہ ہمارے سروں پر پٹاخے کیوں چل رہے ہیں؟ انہوں نے صرف یہ کہا کہ یہ پٹاخے نہیں ہیں..... وہ آرہے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ اللہ خیر کرے اور فون بند کر دیا۔

انھوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ وہ اس وقت شہرہ آفاق تقریر لکھ رہے تھے جو صدر ایوب کو قوم کی سماعت کے لیے ریڈیو سے نشر کرنی تھی۔ ان کے پروگرام میں فوری تبدیلی اس لیے ہوئی کہ ایک روز پہلے جب ریڈیو پر انہوں نے بھارتی وزیراعظم کی تقریر سنی تو انہوں نے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین سے کہا کہ مجھے اس تقریر میں سانپ کی پھنکار سنائی دی ہے، ہمیں فوراً واپس جانا چاہیے۔ وہ پھر پہلے جہاز سے روانہ ہو گئے۔ یہ آخری جہاز تھا جو جنگ کے بعد مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آیا۔ ہوائی اڈے پر عملے کے لوگ موجود تھے جنہوں نے انہیں ایوان صدر فوراً پہنچا دیا۔ وہ پہنچے تو شعیب صاحب، بھٹو صاحب اور آغا شاہی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ کہنے لگے کہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔ صدر صاحب کی تقریر کرنے کا اعلان کیا جا چکا۔ انہیں دو مسودے دکھائے گئے ہیں مگر وہ دونوں انہوں نے قبول نہیں کیے۔ اب آپ ہی تقریر لکھیں۔

بھائی گوہر نے کہا کہ میں صدر صاحب سے ملے بغیر ان کی تقریر نہیں لکھ سکتا۔ صدر صاحب کی فوجی مصروفیات کے باوجود بھائی گوہر کو بلا لیا گیا۔ انہوں نے صدر ایوب کو باہمت پایا۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ ہندوستانیوں کو اب پتا چلے گا کہ مسلمان قوم کتنی دلیر قوم ہے تو بھائی گوہر اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کیا میں ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر تقریر کا مسودہ پیش

کرتا ہوں۔ میرے فون کے وقت وہ اسی کام میں مصروف تھے۔

تقریر لکھی گئی اور قوم نے سنی تو لاہور کے نہتے شہری انڈے اور دیگر اوزار لے کر واہگہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں بڑی مشکل سے اپنے اپنے گھر واپس جانے پر آمادہ کیا گیا۔ نہتے جی دار شہری تو دوبدو لڑنے مرنے کو تیار تھے مگر وہ سب لوگ جو پاکستان بننے سے پہلے سائیکل سوار اور اب ماشاء اللہ موٹروں اور بنگلوں کے مالک تھے' سرپٹ لاہور کو تیاگ رہے تھے۔ راوی دریا کے پل سے گزرنا جان جوکھوں کا کام بن گیا۔ نہ جانے سب لوگ کہاں جا رہے تھے۔ گلبرگ خالی ہو گیا۔ ڈیفنس کا علاقہ ابھی تعمیر ہی نہیں ہوا تھا۔ ٹرینوں، بسوں اور لاریوں پر بھی متمول لوگ راوی پار کر کے ساہیوال، ملتان یا سندھ جا رہے تھے۔ اُدھر صفدر میر اپنی ایک طویل اور خوبصورت نظم ''چلو واہگے کی سرحد پر'' ایک ٹرک پہ سوار ہو کر لاہور کے بازاروں، گلی کوچوں میں اپنی دل آویز آواز میں لوگوں کو سنانے اور جذبۂ شہادت کو تقویت دینے لگے..... چلو واہگے کی سرحد پر۔

دوسرے ہی دن بھائی گوہر کا فون آیا کہ لاہور کے تمام سیاسی راہنماؤں کو بلا تخصیص صدر صاحب سے کل ہی ملنے کی دعوت دو۔ یہ اپنی اپنی نوکریوں کے بندھن میں بندھے رہنے کا نہیں، یہ وقت جہاد کا ہے۔ دشمن آپ کے گھر کے دروازے پر ہے۔ یہ پیغامات دینے کے بعد آپ ریڈیو اسٹیشن چلے جائیں، میں نے ریڈیو کے ڈائریکٹر' بٹ صاحب سے بات کر لی ہے۔ شہریوں کو منظم کرنے اور دشمن کو چونکا دینے کا کوئی طریقہ سوجھے تو اس کی تجویز بٹ صاحب کو دے دیں۔

فیض صاحب تو اسی دن ریل سے کراچی چلے گئے کہ ''میزو'' ان کی بیٹی (منیزہ ہاشمی) وہاں اکیلی تھی۔ اس کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرنے کے بعد وہ اسلام آباد بھائی گوہر کے پاس چلے گئے اور جنگ کے دوران وہیں رہے۔ ان کے مشورے بہت مفید ثابت ہوئے ہوں گے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران فیض صاحب' کرنل فیض احمد فیض بن کر نازی اور جاپانی دشمن سے نبرد آزما ہونے دہلی چلے گئے تھے۔ یہ وہی دن تھے جب چراغ حسن حسرت اور ضمیر جعفری کپتان بن کر یہ کام سنگاپور میں کر رہے تھے۔ چونکہ روس بھی اتحادیوں کے ساتھ اس جنگ میں شانہ بشانہ لڑ رہا تھا لہٰذا جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری بھی ریڈیو دہلی سے ''میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے'' قوم کو سنا رہے تھے۔ سارا ہندوستان تقریباً متحد تھا۔ سبھی انگریزوں کی حکومت سے جان چھڑانا چاہتے تھے مگر ہٹلر اور پھر جاپانیوں کی غلامی کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ اگرچہ ہٹلر صاحب نے ہندوؤں کو ورغلانے کے لیے یہ شوشا بھی چھوڑ رکھا تھا کہ جرمن قوم بنیادی طور پر آریائی ہیں۔

جب بھارتی جہاز لاہور پر دھماکے کر رہے تھے تو دفتر کے دو ایک سینئر افسر میرے پاس آئے اور کہا کہ دفتر بند کر دینا چاہیے۔ بچے اسکولوں میں ہیں اور انہیں گھر پہنچانا بہت ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ میرے تینوں بچے بھی اسکولوں میں ہی ہیں۔ اب ہمیں اپنے اپنے مورچے چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ چنانچہ میرا دفتر اسی طرح دوران جنگ کھلا رہا۔ ریڈیو اسٹیشن لاہور میں بٹ صاحب کی مدد کے لیے ایک غیر سرکاری کمیٹی بنائی گئی جس کے رکن صوفی تبسم، اعجاز بٹالوی، اشفاق احمد اور میں تجویز کیے گئے۔

طے ہوا کہ صوفی صاحب شعر و ادب اور موسیقی کے پروگرام پیش کریں گے۔ اعجاز صاحب کشمیر پر قانونی سیاسی تقریر ہر روز نشر کریں گے۔ اشفاق احمد اپنے جاری پروگرام کو جنگی جامہ پہنا دیں گے اور میں شہر نامہ کے عنوان سے شام سات بجے ہلکی پھلکی تقریر کروں گا تاکہ دشمن یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ لاہور پہلے ہی کی طرح بس رہا ہے اور کسی زمینی یا فضائی حملے نے لاہوریوں کے طور طریقے نہیں بدلے۔ یہ کام شروع ہو گیا۔ لاہور ریڈیو کی ہر دلعزیزی میں دن دگنا رات چوگنا اضافہ ہوتا رہا (میری تقریریں اور اشفاق صاحب کا پروگرام کتابی صورت میں بھی چھپ چکے)۔

انہی دنوں بٹ صاحب نے صوفی صاحب سے کہا کہ اگر نور جہاں آپ کی نظمیں گانے کے لیے تیار ہو جائے تو مزا آجائے۔ صوفی صاحب نے فوراً مجھے حکم دیا کہ تم بٹ صاحب کے ساتھ نور جہاں کے گھر جاؤ اور میری طرف سے نظمیں گانے کا پیغام دو۔ تم دو ایک دفعہ اس سے میرے گھر پہ مل بھی چکے ہو۔ تمہارے جانے کے بعد اس نے مجھے کہا تھا کہ یہ کون شخص ہے جس میں سرکاری افسری کی بو کا نشان تک نہیں۔ میں کیسے حکم عدولی کر سکتا تھا؟ بٹ صاحب کے ڈرائیور کو نور جہاں کے گھر کا علم تھا جو گلبرگ میں واقع تھا لہٰذا ہم دونوں ان کے گھر پہنچے۔ اعجاز اور نور جہاں برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ بچے بچیاں بھی تیار تھے۔ ایک ٹرک میں سامان بھرا جا رہا تھا۔ شاید ایبٹ آباد جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

بٹ صاحب نے میرا تعارف کروایا تو نور جہاں نے کہا کہ میں مل چکی ہوں۔ آپ ٹیکس لینے گھر پر خود ہی آ گئے ہیں۔ نور جہاں جیسا فقرے باز میں نے تو کم ہی دیکھا ہے۔ میں نے کہا، ابھی آپ سے ساری قوم اس دولت کا ٹیکس مانگ رہی ہے جو دل کھول کر پیار اور شہرت کی شکل میں آپ کو دیا گیا۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟ یہ قوم اور ہمارے سپاہی آپ کی آواز کے پیاسے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی جب انہوں نے رکنے کا فیصلہ کر لیا اور دریافت کیا کہ میں تو یہاں اکیلی رہ جاؤں گی اور میرے پاس موٹر بھی نہیں ہو گی۔ بٹ صاحب نے کہا، سب انتظام ہمارے سپرد ہو گا۔ نور جہاں نے اعجاز اور بچوں کو روانہ کیا اور ہمارے ساتھ ریڈیو اسٹیشن چل پڑیں جہاں انہوں نے کبھی ایک گانا بھی نہیں گایا تھا۔

یہ قصہ میں نے تفصیل سے اس لیے تحریر کیا کہ ہمارے ہاں لوگ کسی بھی شخص کی قربانی اور عظمت تسلیم کرنے سے گھبراتے ہیں۔ قوم کو جگانے اور زندہ رکھنے کے باوجود کئی لاہوریوں نے یہ کہا کہ نور جہاں افسری کے رعب میں آ گئی ہو گی۔ سچ یہ ہے کہ اس جیسی شخصیت کا کسی کے رعب میں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جنگ کے اختتام پر بیگم نصرت بھٹو لاہور تشریف لائیں۔ میرے گھر پر ان کی دعوت تھی۔ لاہور کی وہ سب خواتین مدعو تھیں جنہوں نے جنگ کے دوران کچھ خدمت کی تھی۔ نور جہاں بھی موجود تھیں۔ مجھے میری بیوی کا دفتر میں فون آیا کہ نصرت بیگم نے نور جہاں سے دو چار بار کوئی جنگی گیت سنانے کو کہا ہے مگر اس نے ہر بار یہی کہا کہ میں تو کھانا کھانے آئی ہوں اور کھانا اور گانا ایک ساتھ نہیں چلتے۔ لہٰذا آپ ہی اسے سنا دینے کا کہہ دیں۔ میں نے کہا کہ اگر وہ انکار کر چکی تو میں تو کیا کسی کے کہنے پر بھی نہیں مانے گی، آپ اب کھانا ہی لگا دیجیے۔

ریڈیو پر ہوتا یہ تھا کہ صوفی صاحب ریڈیو اسٹیشن ہی پر سب کی موجودگی میں نظم تیار کرتے پھر ایک ایک مصرع کو نور جہاں خود ہی مختلف سروں میں ڈھالنا شروع کرتی۔ ایک آدھ گھنٹے میں وہ نظم اور اس کی دھن تیار ہو جاتی۔ نور جہاں پھر دو ایک سازندوں کے ساتھ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا اس نظم اور دھن کو دھراتی۔ تب کہیں جا کر وہ ریڈیو کے لیے ریکارڈ کی جاتی اور اس شام ساری قوم اسے سنتی اور سرد ھنتی۔

پنجابی گانا ''جنگ کھیڈنیں ہوندی زنانیاں دی'' گایا گیا تو اس کے ریکارڈ ڈھاکا کے گلی کوچوں میں دن رات بجنے لگے۔ لاہور کا کوئی شاعر، ادیب، فنکار، گویا ایسا نہ تھا جو بن بلائے ریڈیو پر آ کر قوم کے دلوں کا سہارا نہ بنا ہو۔ (یہ گانا ملتان کے ایک گائیک اسد ملتانی کی عنایت تھی)۔

لاہور ریڈیو کے بارے میں اخباروں نے لکھا کہ جو کچھ وہاں سے نشر ہو رہا ہے، وہ کم از کم چھ آٹھ مہینوں کی تیاری کے بغیر تخلیق ہو نہیں سکتا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یقین محکم عمل پیہم ہو تو مہینوں کا کام سیکنڈوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ ریڈیو کے تمام پروگراموں کو بہت شہرت ملی مگر ان سب پروگراموں کی افادیت وقتی تھی۔ جنگ ختم ہوتے ہی وہ بھی اذہان سے محو ہو چکے مگر نور جہاں نے ایسی دولت دی جو پاکستانی قوم کے لیے آج بھی سرمایہ حیات ہے۔

جنگ میں ہمارے فوجیوں اور ہوابازوں کے قصے کئی

کتابوں کی صورت چھپ چکے۔ مصدقہ واقعات بھی بھائی گوہر کی کتاب ''ایوب خان۔ پہلا فوجی ڈکٹیٹر'' میں شائع ہوئے ہیں۔ اس ساری تفصیل کے کاغذات مجھے جنرل اختر ملک کے تعلق سے ملے تھے جن کی آج تک ہماری یا ہندوستانی فوج نے کسی واقعہ کی تردید نہیں کی۔ مجھے چند ایک واقعات کا علم ہے جو پیش خدمت ہیں۔

ایک دن بھارتی ریڈیو نے اعلان کیا کہ پاکستان کے گاؤں برکی پر ہماری فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ میں اپنی تقریر کے سلسلے میں دو ایک دوستوں کو لیے برکی کی طرف روانہ ہوا۔ جب ٹینکوں کی قطاروں میں سے گزرتا تو انہیں بتایا جاتا کہ میں ہی ہر روز ریڈیو پر آپ کے کارنامے سناتا ہوں تب فوجی مع وردی کے میرے ہاتھ چومتے۔ ایک ایسا گاؤں آیا جہاں ایک جگہ کچھ لوگ جمع تھے اور چائے پی جا رہی تھی۔ ہم بھی وہیں ٹھہر گئے۔ میری ملاقات برکی کے تھانیدار سے ہوئی جس نے میجر بلوچ کے کارنامے سنائے اور اپنی اور لوگوں کی ہمت اور مردانگی کا نشہ کھینچا، اللہ ہندوستانیوں کو سچ بولنے کی ہدایت دے۔

اس تقریر کے بعد لاہوریوں کے بجھے ہوئے دل پھر روشن ہو گئے۔ واپسی کے دوران ہمارے سر سے ایک طیارہ گزرا جس نے ہماری موٹر کو نشانہ بنایا۔ ہم سے کوئی سو گز آگے گرا جس نے سڑک پر تقریباً ۱۵ فٹ گہرا شاید ۱۰۰ گز چوڑا شگاف بنا دیا۔ دھول نے ہمیں اپنے اندر ایسا سمو لیا کہ آسمان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب دھند کچھ چھٹی تو مجھے اپنے دوست نظر نہ آئے۔ میں نے پریشانی کے عالم میں انہیں پکارا تو موٹر کے نیچے سے دونوں کا جواب ملا۔ میں ان دونوں کا نام بتانا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ دونوں بعد میں بڑے سرکاری عہدوں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

ان دنوں پاک فضائیہ کے کارناموں کی دھوم تھی اور یہ سارا کام سرگودھا ہی سے ہو رہا تھا جسے مٹی مسعود کمانڈ کر رہے تھے۔ میں وہاں انہیں ملنے گیا تو ان کی بیوی نے بتایا جو میری میزبانی بڑی دلجمعی سے کر رہی تھیں کیونکہ مٹی مسعود سے رشتہ داری کے علاوہ میری گہری دوستی تھی، کہ مٹی تو شاید رات بھر گھر واپس نہ آ سکے گا لیکن وہ اپنے ایک افسر سرفراز کو جس کے بڑے بھائی امتیاز رفیقی تمہارے قریبی دوست ہیں، کو بھیج رہے ہیں تاکہ تم شام ان کے ساتھ گزارو اور جو کچھ پوچھنا ہو تو انہی سے پوچھ لو۔ سرفراز بہت ہی چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا لہٰذا دیر تک اس سے ائیر فورس کے تمام کارناموں کا ذکر سنتا رہا۔

یہ خوشگوار ملاقات رات گئے ختم ہوئی۔ صبح میں لاہور واپس آ گیا۔ مٹی تو صبح تک مورچے سے واپس نہیں آئے تھے۔ تیسرے دن یہ دل خراش خبر آئی کہ سرفراز، بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سکواڈرن کو بچانے کے لیے خود شہید ہو گئے۔ میں غم سے نڈھال ہو گیا۔ انہیں بہادری کا ایک بڑا نشان ملا۔ اب ایک سڑک لاہور چھاؤنی میں ان کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

لاہور کے رئیس علاقے تقریباً خالی ہو چکے تھے۔ اندھیری راتوں کے باوجود میرے گھر کے لان میں محفل جمتی اور طرح طرح کی باتوں سے دل بہلایا جاتا۔ کوئی نہ کوئی ہیلمٹ پوش سائیکل پر سوار آتا اور کوئی فرضی کہانی سنا جاتا۔ لاہور عادت کے مطابق افواہوں کی فیکٹری چلا رہا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن ہر پروگرام کے بعد لوگوں کے لیے ترتیبی نعرے نشر کرتا تھا جس میں ایک اضافہ میں نے یہ کروایا کہ ''چشم دید واقعات کو بھی تسلیم نہ کریں۔''

ایک دن جب سیالکوٹ پر بھارت نے حملہ کر دیا تو مجھے بتایا گیا کہ وہاں کا انچارج انکم ٹیکس افسر شہر چھوڑ کر چلا گیا ہے اور دفتر بند ہو چکا۔ میں فوراً وہاں چار پانچ کارکنوں کو لے کر پہنچا۔ سیالکوٹ میں جنرل صاحب جو کالج میں اعلیٰ درجے کے اتھلیٹ تھے اور مجھے اچھی طرح سے جانتے تھے۔ کہنے لگے کہ تم بیچارے آئی۔ ٹی۔ او کو ڈھونڈ رہے ہو، یہاں کا ڈپٹی کمشنر بھی بھاگ گیا ہے۔ وہ پاکستان کے بڑے نامور ڈاکٹر کا بیٹا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے، تمہارا آئی ٹی او عملے سمیت سمڑیال میں ہے اور میں ابھی پیش کرواتا ہوں۔ ایک

آدھ گھنٹے میں وہ سب سیالکوٹ لائے گئے۔ دفتر کو پھر سے آباد کیا گیا۔ آئی ٹی او کو جنرل صاحب نے پوری حفاظت کا یقین دلایا۔

پاکستان ریڈیو اور وزارت اطلاعات نے جو کارنامے اس زمانے میں دکھائے، آج بھی تمام اخبار نویس اس کے مداح ہیں لیکن حسب عادت پاکستانیوں کو کیڑے نکالنے کی لت اپنے کرتب دکھاتی رہتی ہے۔ یہ بھی نجی محفلوں میں سننے میں آیا کہ جنگ ہمارے فوجیوں اور ہوابازوں نے نہیں یہ تو الطاف گوہر نے ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے جیتی ہے۔ اللہ ہمیں ایک دوسرے کی زبان سے محفوظ رکھے۔

ہمیں پتا چلا کہ جنرل اختر ملک اکھنور کے بعد دریائے توی کو اس دوران عبور کر کے جموں پر قبضہ کرنے والے ہیں۔ پھر اطلاع ملی کہ انہیں تبدیل کر دیا گیا ہے اور کمان جنرل یحییٰ کے سپرد کر دی گئی ہے۔ میرے کئی بار استفسار کے باوجود بھائی گوہر اور نہ ہی اختر ملک یہ بتا سکے کہ فتح کے موقع پر انھیں تبدیل کیوں کیا گیا۔ مختلف وجوہ سننے میں آئیں جو کچھ یوں ہیں۔

جنرل ایوب اس کارنامے کا سہرا یحییٰ کو پہنانا چاہتے تھے کہ وہ اسے بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے۔ امریکا نے جنرل ایوب کو مجبور کیا کہ ہندوستان کے بڑے شہر پر قبضہ انہیں قبول نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ افواہیں تو اور بھی بے شمار ہیں مگر اصل وجہ قوم پر آج تک عیاں نہیں ہوئی۔

جنگ کے اختتام کے دن قریب آئے، اور معاملہ اقوام متحدہ تک پہنچا تو وہاں بھٹو صاحب نے صدر صاحب کو کہا کہ دو دن جنگ اور جاری رکھیے، ہمیں یہاں کامیابی ہوگی۔ صدر صاحب نے تینوں کمانڈروں کو طلب کیا اور تین دن تک جنگ جاری رکھنے کو کہا۔ اُن تینوں نے بہ یک آواز یہ کہا کہ ہم جنگ تین منٹ اور جاری نہیں رکھ سکتے چونکہ سامان سارا ختم ہو چکا اور پھر وہی ہوا۔ (یہ بات مجھے بھٹو صاحب نے خود بتائی تھی اور بھائی گوہر نے اس کی تصدیق کی تھی۔)

جنگ بندی کے بعد جسے ذوالفقار علی بخاری صاحب نے فائر بندی کا نام دیا، ریڈیو پروگرام پہلے کی طرح چلتے رہے۔ ابھی دونوں ملکوں میں باقاعدہ جنگ بندی کا معاہدہ ہونا تھا۔ ایک دن بھائی گوہر لاہور آئے اور کہنے لگے، میں لاہور اور قصور کے کمانڈر سے جنگ کے متعلق بریفنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ ہیلی کاپٹر میں تم بھی ساتھ چل سکتے ہو۔ یوں تمہیں آج کی تقریر کے لیے مواد مل جائے گا۔

جنرل حمید قصور محاذ کے کمانڈر تھے۔ کیمپ میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ کیمپ میں ہر طرف اُس علاقے کے نقشے آویزاں تھے۔ انھوں نے بڑی تفصیل سے اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ پتا چلا کہ کھیم کرن پر تو ہمارا قبضہ ہو چکا تھا مگر فیروز پور جانے کے لیے خشک نہر سے نکل کے جانا تھا۔ بھارت نے عین وقت پر نہر میں پانی چھوڑ دیا اور ہمارے ٹینک وہیں پھنس گئے ورنہ فیروز پور پر قبضہ یقینی تھا کہ دفاع کے لیے بھارتی فوج موجود نہیں تھی۔ بریفنگ کے بعد ہم کھیم کرن دیکھنے گئے، بہت بڑا قصبہ تھا۔ بے شمار پکے اور دو منزلہ مکانات تھے۔ گلی کوچے ویراں، بازار بند، انسان تو کیا پرندے بھی نظر نہ آئے۔ ایسا ڈراؤنا منظر دن کے وقت کہاں دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ وہاں ہمارے ایک کپتان نے بتایا کہ دو بھارتی مورچے جو ہر قسم کے فوجی سامان سے خالی تھے، بوریوں میں بھری بوتلوں سے بھرے ملے تھے۔ میرے استفسار پر کہ اب بوتلیں کہاں گئیں، وہ خاموش ہو گئے۔ اُن کی خاموشی ہی سے مجھے اپنے بے معنی سوال کا جواب مل گیا۔

ہم پھر لاہور بریفنگ کے لیے پہنچے۔ جنرل سرفراز پرتپاک استقبال کیا۔ اپنے افسروں اور جوانوں کے کارنامے سناتے اور شہادتوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ زار و قطار رونے لگے۔ میں نے کسی فاتح جرنیل کو باوردی روتے ہوئے کبھی دیکھا اور نہ کہیں پڑھا تھا۔ اُس بریفنگ کو بھلانے میں مجھے وقت لگا۔

(مصنف کی آپ بیتی ''جو بچے ہیں سنگ'' سے اقتباس)

●●●

عجیب رشتہ تھا چاچا محمد حسین کا میرے والد کے ساتھ! سارا گاؤں کہتا تھا کہ ان دونوں کی دوستی مثالی ہے لیکن میں نے انھیں ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے دیکھا۔ وہ دن تو مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میرا میٹرک کا نتیجہ نکلا تھا۔ مبارک باد دینے کے لیے پورا گاؤں ہمارے گھر اُمڈ آیا۔ بس ایک چاچا محمد حسین کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے والد گاؤں والوں کی مبارک باد وصول کرتے اور لڈو بانٹتے ہوئے دیکھ دروازے کی طرف ہی رہے تھے کہ محمد حسین کیوں نہیں آیا۔

جب خاصی دیر ہو گئی تو وہ خود محمد حسین کے گھر کی طرف چل دیے۔ جا کر دیکھا کہ وہ اپنی چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ میرے والد نے کسی کی منت سماجت کرنا تو زندگی میں سیکھا نہیں تھا، اُسے دیکھتے ہی بولے: ''لڑکے کی کامیابی سے اتنا جل گئے محمد حسین کہ میرے گھر تک نہ آ سکے۔''

''لڑکے نے دسویں پاس کر لی تو اب وہ تیرا ہو گیا آیا سنگھا۔'' محمد حسین گرجا۔ ''وہ میرے کندھوں پر کھیلا، میری ہی گود میں پلا، اور پڑھ گیا تو تُو نے اُس پر قبضہ جما لیا۔ تجھ میں ذرا بھی عقل ہوتی سردار، تو آج کا جشن میرے گھر میں ہو رہا ہوتا۔''

میرے والد، جو کسی کے سامنے ہار ماننا جانتے ہی نہیں تھے، چپ چاپ واپس مڑ گئے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد لوٹے تو پورا گاؤں اُن کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ میرے والد یہ کہتے ہوئے آ رہے تھے کہ لڈو کھانے ہیں تو محمد حسین سے مانگو، جس کا لڑکا پاس ہوا ہے۔ میرے گھر میں بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے۔''

میری شادی پر تو حد ہی ہو گئی۔ پورے گاؤں کے لوگ باراتی بنے۔ بیلوں، تانگوں اور گھوڑوں پر سوار نہر کے کنارے میری سسرال جانے کے لیے تیار کھڑے تھے لیکن محمد حسین کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میری ماں نے میرے والد سے کہا ''بھائی محمد حسین شاید کسی بات پر روٹھ گیا ہے۔ جاؤ، اسے منا کر لے آؤ۔''

ماں نے مجھے بھی ساتھ بھیجا کہ وہ شاید ڈھنگ سے اُسے منا نہ سکیں۔ ایک طرح سے یہ عقل مندی کی بات تھی کیوں کہ میرے والد کے منانے کا ڈھنگ دنیا سے مختلف تھا۔ جاتے ہی کہنے لگے: ''تُو نے بڑی عقل مندی کی بات کی کہ تُو بارات میں شامل نہیں ہوا۔ میرے لڑکے کی سسرال والوں نے کہہ رکھا ہے کہ بارات ذرا کم لانا لیکن میں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر انھیں منا لیا کہ میں بارات میں ایک اور آدمی نہیں' صرف ایک گدھا لا رہا ہوں۔ اب تو چل پڑ کہ تیرے آنے کا کوئی بُرا نہیں مانے گا۔''

محمد حسین مونچھوں میں مسکرایا اور کہنے لگا: ''ایک گدھا تو بارات میں ہے ہی' دوسرے کی کیا ضرورت ہے۔''

پھر میرے والد اپنے روایتی غصے میں آ گئے اور کہنے لگے: ''میں نے کون سے تیرے ڈنگر چرا لیے ہیں جو تو مجھ سے رُوٹھا ہوا ہے۔ سارا گاؤں اپنے آپ بارات میں شامل ہونے کے لیے نکل آیا ہے اور تُو سالے' یہاں بیٹھا نخرے دکھا رہا ہے۔''

محمد حسین مسکرا کر کہنے لگا: ''آیا سنگھا! اگر اپنے بیٹے کی شادی پر بھی نخرے نہ دکھائے تو پھر کب دکھاؤں گا۔ ویسے میرے کپڑے دیکھ لے' میں بھی باراتی بنا بیٹھا ہوں۔ بس تیری ناک رگڑوانی تھی' رگڑ والی۔''

ویسے تو چاچا محمد حسین میرے والد کی زمینوں پر مزارع تھا لیکن یہ اُن دونوں کا کاروباری رشتہ تھا۔ بچپن میں کبڈی کھیلتے اور کشتیاں لڑتے جو دوستی قائم ہوئی تھی' وہ اس طرح نبھا رہے تھے کہ سگے بھائی بھی کیا نبھائیں گے۔

ہر سال زمین کی پیداوار کی تقسیم کے موقع پر اُن دونوں کا حساب کتاب دیکھنے والا ہوتا تھا۔ میں اکثر ایسے مواقع کا چشم دید گواہ ہوا کرتا۔ والد مجھے ساتھ اس لیے لے جاتے تھے کہ میں زمینداری کے ہتھکنڈے سیکھ جاؤں۔

تقسیم کے شروع ہی میں دونوں گالم گلوچ پر اُتر آتے تھے۔ چاچا محمد حسین کہتا ''یہ ایک کنستر دانوں کا میں نے مُلا کے لیے نکال لیا ہے کہ وہ مسجد میں دیا جلاتا ہے۔''

میرے والد کہتے: ''دیا خود جلا لیا کرو' میں نے مُلا کا ٹھیکا نہیں لیا ہوا۔'' پھر کہتے: ''ایک بوری گندم میرے نوکروں کے لیے نکال کے الگ رکھ دے' وہ لوگ میرے گھر میں کام کرتے ہیں۔''

اور چاچا کہتا: ''کیوں نکالوں؟ تیرے نوکروں کے لیے جرمانہ میں کیوں بھروں؟ اور ویسے بھی اپنے گھر کا کام تُو خود کیوں نہیں کرتا۔ شکل وصورت سے تو تُو نوکر ہی لگتا ہے۔''

دونوں گھنٹوں لڑتے رہتے اور جب میرے والد اپنا حصہ خچروں پر لدوا رہے ہوتے تو چاچا محمد حسین ایک بوری گندم ہمارے حصے میں اور ڈال دیتا۔

''اب یہ بوری کیوں رکھ رہے ہو یہاں؟''

''بیٹا آیا ہے میرا تمھارے ساتھ۔ اُسے کیا خالی ہاتھ لوٹا دوں گا۔''

چاچا محمد حسین نے میرے والد سے اپنی دوستی کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھایا۔ ویسے دونوں ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے کو تیار رہتے لیکن اگر چاچا محمد حسین نے کبھی میرے والد سے قرض لیا تو نہ صرف ضمانت دی' بلکہ سود بھی پورا دیا۔ قرض تو اُسے اکثر لینا پڑتا تھا' کیونکہ پیداوار کے حصے میں اُس کا گزارہ نہیں چلتا تھا۔ جب بھی اُسے بیج خریدنے' یا گھر میں شادی بیاہ کے موقع پر سو دو سو روپوں کی ضرورت پڑتی' وہ اپنی بیوی کا اکلوتا زیور کان کے جھمکے میرے والد کے پاس گروی رکھ جاتا اور جب فصل پکتی تو چھڑا کر لے جاتا لیکن پندرہ بیس دن کے بعد پھر جھمکے ہمارے گھر آ جاتے کہ ضرورتوں سے چھٹکارا کہاں ہوتا ہے؟

میرے والد اُسے چھیڑتے: ''محمد حسین! یہ جھمکے تُو نے اپنی بیوی کے لیے بنوائے ضرور ہیں لیکن اُسے پہننے کبھی نہیں دے گا۔''

محمد حسین جواب دیتا: ''جھمکے چاہے تیرے گھر میں

پڑے رہتے ہیں' ہیں تو میرے ہی اور پھر اللہ قسم' میری بیوی تو جھمکوں کے بغیر بھی بڑی خوبصورت لگتی ہے۔''

ایک دفعہ گاؤں میں بڑے زور کا سُوکھا پڑا۔ یوں لگتا تھا جیسے بادل دیکھے بغیر ہی ہماری باقی زندگی گزر جائے گی۔ ان حالات میں فصل کیا اُگتی اور جو تھوڑی اُگی' اُسے بے پناہ دھوپ نے جلا کر راکھ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محمد حسین میرے والد کو فصل کی طے شدہ رقم نہ دے سکا۔ میرے والد نے بہتیرا سمجھایا' بھول جاؤ کہ تم نے میرا کچھ دینا ہے لیکن محمد حسین کیسے مانتا۔ کہتا تھا: ''تُو نے معاف کر بھی دیا سردار تو کیا ہوا' قیامت کے دن اللہ کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔ یہ قرض تو مجھے چکانا ہی ہے۔''

محمد حسین کو شاید معلوم نہیں تھا کہ قرض تو شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اگلے سال تک یہ اتنا بڑھ گیا کہ اُسے اتارنے کے لیے محمد حسین کی اچھی فصل بھی مدد نہ کر سکی۔ قرض تبھی اُتر سکتا تھا اگر محمد حسین اپنے حصے کے سارے دانے میرے والد کے حوالے کر دیتا لیکن اگر ایسا کرتا تو پھر کھاتا کیا؟ معلوم نہیں کب شیطان نے اُس کے کان میں پھونک مار دی اور محمد حسین قرض ادا کیے بغیر فصل کا اپنا حصہ لدوا کر گھر چلا گیا اور میرے والد کو پیغام بھجوا دیا کہ اپنا حصہ کھیتوں سے اٹھوا کر لے جا۔

میرے والد حیران کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ اگر محمد حسین کہہ دیتا تو میرے والد اپنا حصہ بھی اُس کے حوالے کر دیتے لیکن یہ محمد حسین کی غیرت کو گوارہ نہ ہوا۔ میرے والد بھی اگر شرافت سے قرض کی ادائی کے لیے کہتے تو محمد حسین یقیناً زبردستی اٹھوا کر لایا ہوا اناج انھیں بھجوا دیتا' چاہے خود بھوکوں مرتا لیکن دونوں کی رگوں میں خون گرم تھا' ایسا کیوں کرتے۔ میرے والد نے پہلی ہی ملاقات میں جو جملہ بولا اُس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ انھوں نے کہا: ''محمد حسین! شرافت سے میرا قرض ادا کر دے' ورنہ تحصیل دار کی کچہری میں گھسیٹ کر لے جاؤں گا۔''

محمد حسین نے بھی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا: ''اگر اپنے باپ کی اولاد ہے تو ایسا ضرور کرنا۔''

اب مسئلہ دونوں کی دوستی سے زیادہ دونوں کی عزت کا ہو گیا۔ میرے والد نے اپنے جگری یار پر مقدمہ دائر کر دیا۔ آگ جب لگ جاتی ہے تو اُسے بجھانے کی نسبت اُس پر ہاتھ سینکنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ دونوں دوستوں کے حمایتیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ یار لوگوں نے محمد حسین کو اپنے پلے سے پیسے خرچ کر کے وکیل ڈھونڈ دیا' جس کا دعویٰ تھا کہ آیا سنگھ کی دھجیاں اُڑا کے رکھ دے گا۔

محمد حسین کو فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر تحصیل دار نے سوال کیا کہ تم نے آیا سنگھ کا قرض ادا کر دیا ہے یا نہیں تو کیا جواب دوں گا۔ وکیل نے سمجھا دیا کہ کہہ دینا' دے دیا ہے۔ اگر تحصیل دار نے پوچھا کہ رسید کیوں نہ لی تو کیا جواب دوں گا۔ وکیل نے سمجھا دیا کہ کہہ دینا کہ آیا سنگھ گھر میں نہیں تھا۔ میں نے روپے اُس کی بہو کو دے دیے تھے۔ ابھی سے رسید کیا مانگنا!

محمد حسین کو یہ بات پسند تو نہ آئی لیکن جب بار بار اس کے کان میں ڈالا گیا کہ جنگ میں سب جائز ہوتا ہے تو وہ یہ بیان دینے پر تیار ہو گیا۔ وکیل نے اُسے یقین دلایا کہ آیا سنگھ شرم کے مارے بہو کو کچہری میں نہیں لائے گا۔ وہ یقیناً چپ چاپ تسلیم کر لے گا کہ قرض ادا ہو چکا اور بھری کچہری میں معافی مانگے گا کہ اُس کی بہو اُسے بتانا بھول گئی۔

محمد حسین کے ہاں جو کھچڑی پک رہی تھی' اس کا میرے والد کو علم نہیں تھا۔ انھیں یقین تھا کہ محمد حسین کے لیے سوائے یہ اقبال کرنے کے کہ قرض ادا نہیں ہو سکا اور کوئی چارہ نہیں۔ وہ جب اقبال کرے گا تو اُس کی مونچھ نیچی ہو جائے گی اور یہی وہ چاہتے تھے۔ قرض کی وصولی کس سُسرے کو چاہیے۔

جب تحصیل دار کی کچہری میں مقدمہ پیش ہوا تو پورا گاؤں موجود تھا کہ اس سے بڑا تماشا گاؤں میں پہلے کبھی ہوا نہیں تھا۔ تحصیل دار نے پوچھا: ''محمد حسین! تم نے قرض ادا کیوں نہیں کیا؟''

"جی میں ادا کر چکا ہوں۔"

یہ سنتے ہی میرے والد کو جیسے بجلی کے تار نے چھو لیا۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولے: "تحصیل دار صاحب! ذرا اس بے ایمان سے پوچھیے کہ جب قرض ادا کر دیا تو رسید کیوں نہ لی۔"

تحصیل دار نے محمد حسین کی طرف دیکھا اور کہا: "جواب دو محمد حسین!"

محمد حسین کو شاید وکیل کا سکھایا ہوا سبق بھول گیا۔ اُس کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ وکیل نے جب اُسے کہنی ماری تو وہ اس طرح بولا جیسے کسی بچے کو بھولا ہوا سبق یاد آ گیا ہو۔

"حضور! میں جب اس کے گھر رقم دینے گیا تو یہ گھر پر نہیں تھا۔ صرف اس کی بہو گھر پر تھی۔ میں نے پیسے اُسے دے دیے۔ اُس سے رسید کیا لیتا۔ حضور! آپ بے شک اُسے کچہری میں بلا کے پوچھ لیں۔"

یہ سنتے ہی پوری کچہری میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سوچ رہے تھے' کیا آیا سنگھ اپنی بہو کو کچہری میں پیش کرے گا۔ اگر پیش نہیں کرے گا تو کیا وہ تسلیم کر لے گا کہ قرض ادا ہو گیا۔ محمد حسین کے اس بیان کی وجہ سے شاید دونوں دوستوں میں کلہاڑیاں چل جائیں لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

میرے والد کے چہرے سے ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ پھر سنبھلے اور تحصیل دار سے کہا: "حضور! ہو سکتا ہے' محمد حسین سچ کہہ رہا ہو۔ اگر یہ بہو کو رقم دے آیا ہے تو صرف اتنا بتا دے کہ میری بہو کا رنگ کیسا ہے۔ کالا' سانولا' یا گورا۔ بس اگر یہ اتنا بتا دے تو آپ میرا مقدمہ خارج کر دیجیے۔"

محمد حسین کے لیے یہ بتانا تو ذرا بھی مشکل نہ تھا کہ وہ تو ہمارے گھر میں اکثر آتا جاتا تھا۔ میری بیوی' یعنی میرے والد کی بہو کو تو اُس نے ہزاروں بار دیکھا تھا۔ کئی سال سے وہ عید کے موقع پر اُسے عیدی دیتا تھا۔ صرف رنگ کیا' وہ تو اُس کے نقش و نگار بھی بتا سکتا تھا۔

محمد حسین کے وکیل نے اپنی مونچھوں کو اس طرح تاؤ دیا جیسے مقدمہ اُس کے حق میں ہو چکا۔ محمد حسین کو صرف جواب دینا تھا اور تحصیل دار باقاعدہ فیصلہ صادر کر دیتا۔

وکیل کو بڑا تعجب ہوا جب محمد حسین خاموش کھڑا رہا۔ وکیل کے کہنی مارنے کے باوجود وہ خاموش رہا لیکن جب تحصیل دار نے اپنی گرج دار آواز میں اُسے جواب دینے کے لیے کہا تو محمد حسین بھری کچہری میں گھٹنوں کے بل گر پڑا اور بول اُٹھا۔

"مجھے بہو کے رنگ کا پتا نہیں حضور۔ میں نے جب اُسے دیکھا ہی نہیں تو اُس کا رنگ کیسے بتاؤں؟ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میں قرض کی رقم اُسے دے آیا ہوں۔ اب آپ جو سزا چاہیں' مجھے دے دیں۔"

کچہری میں وہ شور و غل اٹھا کہ اللہ کی پناہ۔ محمد حسین کے وکیل کی مونچھیں نیچے کو سرک گئیں۔ وہ غصے میں محمد حسین سے بولا: "تم نے سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ جیتا ہوا کیس ہرا دیا تم نے۔ کیا تمھیں آیا سنگھ کی بہو کے چہرے کا رنگ نہیں معلوم؟ تم نے تو اُسے ہزاروں بار دیکھا ہو گا۔"

"ہاں! دیکھا ہے وکیل صاحب! لیکن کیا کوئی اپنی بہو بیٹیوں کے رنگ روپ کا تذکرہ یوں بھری کچہری میں کرتا ہے۔ ایک معمولی قرضے سے چھٹکارا پانے کے لیے کیا میں اپنے خاندان کی عزت نیلام پر چڑھا دیتا۔ میرے یار آیا سنگھ کو پتا تھا کہ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا' تبھی تو اُس نے مجھ سے یہ سوال کیا۔"

محبت اور جنگ

ایک دفعہ ایک سپاہی نے ٹیپو سلطان سے کہا۔ "کیا محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے؟"

ٹیپو سلطان نے تاریخ ساز جواب دیتے ہوئے کہا: "یہ انگریزوں کا قول ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں جو کچھ ہو' وہ جائز ہو۔"

"آمنہ! اسائنمنٹ بنا لائی ہو؟" حوریہ نے پوچھا۔

"ہاں..... ہاں بنا لائی ہوں۔"

"ٹیسٹ کی تیاری بھی کر لی ہے کہ نہیں؟"

"کر لی ہے بھئی کر لی ہے۔ کیوں بار بار پوچھ رہی ہو۔ یونیورسٹی آئی ہوں تو کام کر کے ہی آئی ہوں گی نا" آمنہ نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"کیا بات ہے آمنہ! تم اتنی چڑچڑی اور بے زار کیوں ہو رہی ہو"۔

"حوریہ دراصل پچھلے چند دن سے تقریباً ہر رات کو دیر تک لیپ ٹاپ پر کام کے ساتھ ساتھ موبائل پر کزنز کے ساتھ گپ شپ بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے صبح جلدی آنکھ نہیں کھل پائی۔ اٹھنے کے بعد بھی طبیعت عجیب اکتائی ہوئی اور تھکی تھکی سے رہتی ہے"۔

"آمنہ! ایسا تو ہونا ہی ہے کیونکہ مسلسل بے خوابی اور نیند کی کمی کی وجہ سے نہ صرف تمہاری طبیعت چڑچڑی اور بے زار رہے گی۔ بلکہ تمہاری تعلیمی کارکردگی بھی متاثر ہو گی اور سارا دن ایسے ہی پژمردگی میں گزرے گا۔"

ایسا صرف آمنہ ہی نہیں بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ ہوتا ہے جو راتوں کو دیر تک جاگ کر کام کرتا ہے۔ نیند کی کمی کے باعث بجائے اس کے کہ صبح طبیعت تازہ دم ہو' وہ مزید بے زار ہوتا اور جسم تھکاوٹ کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس سے نہ صرف دن بھر کی مصروفیات، کام کی رفتار اور کارکردگی متاثر ہوتی ہے بلکہ نیند کی کمی خرابی صحت کا بھی موجب بنتی ہے۔

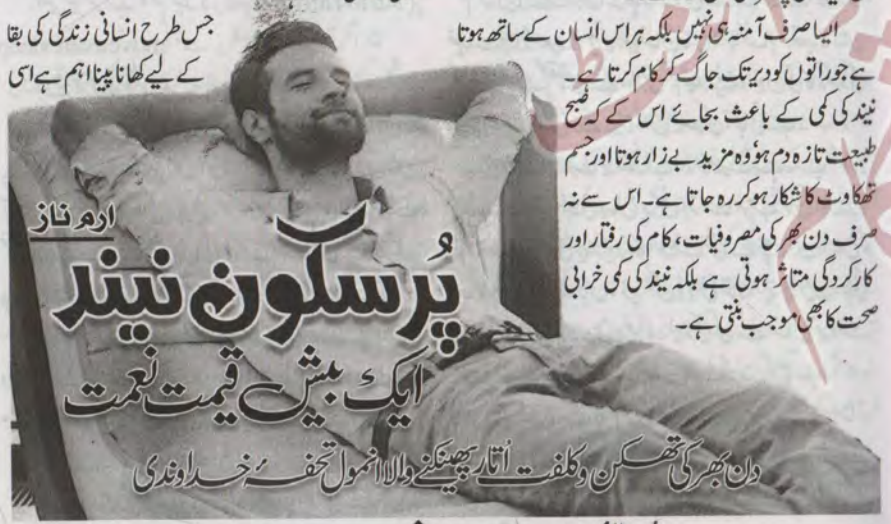

نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے دن بھر کے تھکے ہارے بندوں کے لیے عظیم تحفہ ہے۔ اللہ رب العزت نے نیند کے ذریعے ایک ایسا خودکار نظام انسان کے اندر پیدا کر دیا ہے جو انسانوں کی ساری تھکن اتار پھینکتا اور انھیں راحت دیتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق جب انسان گہری نیند سو جاتا ہے تو دورانِ نیند دماغ کے خلیے سکڑ جاتے ہیں تاکہ نیورانز کے درمیان فاصلہ قائم ہو سکے اور سیال مادہ دماغ کی صفائی کر سکے۔

اس صفائی کے دوران انسانی صحت کو نقصان پہنچانے والا جو زہریلا مادہ دماغ میں جمع ہو' وہ اسے باہر نکال دیتا ہے۔ نیز پرانی معلومات ختم کر کے مزید معلومات کے لیے جگہ بناتا ہے۔ دماغ کو یہ عمل کرنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اگر انسان جاگ رہا ہو تو توانائی دیگر جسمانی افعال میں استعمال ہوتی ہے۔ سو رہا ہو تو وہی توانائی دماغ جسمانی مرمت کے لیے استعمال کرتا اور اگلے دن کاموں کے لیے انسانی جسم کو نئی توانائی بخشتا ہے۔

جس طرح انسانی زندگی کی بقا کے لیے کھانا پینا اہم ہے اسی

طرح ذہنی وجسمانی صحت کے لیے نیند بھی اہم ہے۔ چند گھنٹے سونا بالخصوص رات کی نیند انسان کی فطری اور بنیادی ضرورت ہے۔ پرسکون نیند انسان کی اچھی صحت' جسمانی و ذہنی قوت، خوش مزاجی اور حسن کارکردگی کے لیے اہم ترین ہے۔

چھ سے آٹھ گھنٹے کی نیند دماغی طاقت بڑھانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ یہ عمل نئے اعصابی خلیات کو تقویت دیتا ہے۔ یوں نیند انسان کو چاک وچوبند رکھتی ہے۔ یہ سب تبھی ممکن ہے جب رات کو جسمانی ضرورت کے مطابق نیند لی جائے۔ امریکن سلیپ ایسوسی ایشن کے مطابق ایک بالغ کو ۹-۷ گھنٹے، نوعمر کو ۱۰-۸ گھنٹے، چھ سے بارہ سال کے بچے کو ۱۲-۹ گھنٹے، تین سے پانچ سال کے بچے کو ۱۳-۱۰ گھنٹے اور ایک سے دو سال کے بچے کو ۱۴-۱۱ گھنٹے (وقفوں) سے سونا بہت ضروری ہے۔

نیند کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں:۔

تیز حرکتِ چشم نیند (Rapid eye movement sleep)

بغیر تیز حرکتِ چشم نیند (Non-rapid eye movement sleep)

۱۔ تیز حرکتِ چشم نیند

اس کو ''سرگرم نیند'' (Active sleep) بھی کہتے ہیں۔ یہ نیند کی وہ قسم ہے جس میں ہم خواب دیکھتے ہیں۔ اس میں آنکھیں تیزی سے دائیں بائیں حرکت کرتی ہیں، پٹھے حرکت نہیں کرتے۔ صرف آنکھوں کی حرکت اور سانس لینے کا عمل جاری ہوتا ہے۔ یہ رات بھر میں کئی دفعہ وقوع پذیر ہوتی ہے۔

زیادہ تر لوگوں میں یہ نیند ۹۰ منٹ پر محیط ہوتی ہے۔ پہلا وقفہ ۵ منٹ لمبا ہوسکتا ہے۔ دوسرا ۱۰ منٹ اور آخری ۳۰ سے ۶۰ یا ۹۰ منٹ کا ہوتا ہے جس میں آپ خواب دیکھتے ہیں۔

2۔ بغیر تیز حرکتِ چشم نیند

اس کو ''خاموش نیند'' (quiet sleep) بھی کہتے ہیں۔ یہ نیند کی وہ قسم ہے جس میں ہم خواب نہیں دیکھتے۔ اس نیند میں انسان سوچتا بھی ہے لیکن عام طور پر یہ عمل سادہ اور حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ اس کے تین مراحل ہوتے ہیں:۔

پہلا مرحلہ: اس مرحلے میں ابھی آپ سونے کے عبوری عمل میں ہوتے ہیں۔ اس قسم کی نیند میں دماغ اور جسمانی اعضا کی مرمت وغیرہ نہیں ہوتی کیونکہ آپ جزوی طور پر جاگ رہے ہیں۔

دوسرا مرحلہ: یہ پہلے مرحلے سے زیادہ گہری ہوتی ہے۔ اس مرحلے میں آپ کے جسم کے پٹھے ڈھیلے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ نیند کا یہ مرحلہ جسم کی بحالی میں مدد کرسکتا ہے۔

تیسرا مرحلہ: یہ نیند کی بہت گہری کیفیت ہوتی ہے۔ اس نیند سے کسی کو بیدار کرنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں نیند جسم کی دن بھر کی مرمت میں مددگار بنتی ہے۔

نیند نہ آنے کے نقصانات

ماہرین طب کا کہنا ہے کہ نیند کی کمی کو معمول بنا لینا نہ صرف دماغ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتا بلکہ قوتِ مدافعت کم کر دیتا ہے۔ روزانہ چار گھنٹوں سے کم سونے سے وہ خلیات متاثر ہوتے ہیں جو انسان میں انہماک اور توجہ کا تعین کرتے ہیں۔ محققین کے مطابق کم نیند لینے والوں کی کارکردگی میں اوسطاً چالیس سے پینتالیس فیصد کمی آجاتی ہے۔

نیند کا نہ آنا بہت بڑا عذاب اور مصیبت ہے۔ بے سکون نیند یا بے خوابی انسانی دماغ پر منفی اثرات مرتب کرتی اور بے شمار جسمانی و دماغی بیماریوں کا موجب بنتی ہے جیسے دل، دماغ، معدہ و جگر کی بیماریاں، ڈپریشن، ذہنی تناؤ، چڑچڑاپن، ہائی بلڈ پریشر، فالج اور موٹاپا وغیرہ۔ نیند کی کمی سے انسان ہر وقت غنودگی کی حالت میں رہتا ہے۔ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ جسم و ذہن صحیح طرح سے کام نہیں کرتا لہٰذا روزمرہ کے کام متاثر ہوتے ہیں۔ انسان کی قوتِ برداشت کم ہوجاتی ہے اور طبیعت میں جھنجلاہٹ اور چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا ہے۔ ان عوامل کے

سبب انسان کی سماجی وخانگی زندگی متاثر ہوکر رہ جاتی ہے۔

مغربی ممالک میں ہر تین میں سے ایک فرد بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہے۔ سونے کے لیے نیند کی گولیاں اور منشیات کا استعمال عام ہے۔ صرف ۲۰۱۵ میں امریکیوں نے ۴۱ ارب ڈالر نیند کی ادویہ پر خرچ کیے جب کہ سونے کے لیے منشیات پر خرچ کی گئی رقم اس سے کہیں زیادہ ہے۔ مشرقی ممالک مثلاً پاکستان میں بھی رات کو دیر تک جاگنے اور صبح دیر سے اٹھنے کا رواج جڑ پکڑتا جارہا ہے۔ نتیجتاً زیادہ تر نوجوان بے خوابی اور نیند کی کمی کا شکار ہیں۔ اس سے نہ صرف ان کی جسمانی صحت خراب ہورہی ہے بلکہ ان کی تعلیمی کارکردگی پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔

امریکا کی ایروزونا یونیورسٹی کے پروفیسر شان بنکسٹیڈ نے نوجوانوں پر نیند کی کمی کے اثرات جانچنے کے لیے ایک تجربہ کیا۔ انہوں نے ۱۴ نوجوانوں کو تین ہفتوں تک ہر رات آٹھ گھنٹے کی بجائے پانچ گھنٹے سونے کے لیے تیار کیا اور ہر صبح ان کی جسمانی حالت کا جائزہ لیتے رہے۔ نتائج سے ظاہر ہوا کہ ان نوجوانوں کی طبیعت میں چڑچڑاپن اور افسردگی سرایت کرگئی۔ مزید انہوں نے پیٹھ کے درد کی بھی شکایت کی تھی۔

ہمارے ہاں نوجوانوں میں یہ بھی تصور پروان چڑھ رہا ہے کہ دن کے بجائے رات کو دیر تک جاگ کر پڑھنے سے وہ کامیاب ہوسکتے اور زیادہ اچھے طریقے سے پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے لیے مکمل نیند ضروری نہیں جبکہ دنیا کے کامیاب انسان بھرپور نیند پر زور دیتے ہیں۔ بلب ایجاد کرنے والے تھامس ایڈیسن پانچ گھنٹے لازمی سوتے تھے۔ بل گیٹس کے نام سے کون واقف نہیں جو امریکی بزنس مین اور کمپیوٹر پروگرامر ہیں۔ ان کا شمار دنیا کے دولتمند انسانوں میں ہوتا ہے۔ روزانہ رات سات گھنٹے کی نیند لینا ان کی زندگی کا معمول ہے۔ اسی طرح بارک اوبامہ بھی چھ گھنٹے کی نیند لازمی لیتے ہیں۔

ضرورت سے کم یا زیادہ سونا دونوں ہی بیماریوں کو دعوت دیتا ہے۔ امریکی واروک یونیورسٹی میں دل اور وبائی امراض کے پروفیسر فرینکو کیپوچیو نے دس لاکھ افراد پر دس سال تک تحقیق کی اور ان سے سونے کے معمولات کے بارے میں دریافت کیا۔ کچھ عرصے بعد جب ان افراد سے دوبارہ رابطہ کیا گیا تو پتا چلا کہ ان میں سے زیادہ تر افراد چل بسے ہیں۔ جو بالغ عام طور پر چھ گھنٹے سے کم یا آٹھ گھنٹے سے زیادہ سوتے ہیں' وہ ان لوگوں سے پہلے مرجاتے ہیں جو چھ سے آٹھ گھنٹے کی فطری نیند لیں۔

پرسکون نیند کے چند اصول

نیند کی کمی کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ نے کس قسم کی مصروفیات میں دن گزارہ ہے۔ بعض اوقات نیند کی کمی کا شکار لوگوں کی بستر میں لیٹے رہنے سے بھی آرام کی طلب پوری نہیں ہوتی۔ ذیل میں چند عادات ومفید مشورے پیش ہیں۔ امید ہے' یہ آپ کی گہری اور مکمل نیند کے لیے سودمند ثابت ہوں گے:

☆ اپنے سونے کے کمرے کو پرسکون بنائیں۔ کمرے میں اندھیرا ہو کیونکہ تیز روشنی سونے میں خلل ڈالتی ہے۔ نیز آپ کا بستر اور تکیہ آرام دہ ہونا چاہیے تاکہ آپ بستر پر لیٹتے ہی پرسکون نیند کے مزے لے سکیں۔

☆ اگر آپ کو نیند مشکل سے آتی ہے تو رات کو سونے سے قبل کسی اچھی کتاب کا مطالعہ کریں یا ہلکی موسیقی سنیں بجائے اس کے کہ موبائل یا ٹیلی ویژن پر مار دھاڑ والے پروگرام دیکھیں۔ تشدد، پریشان کن خبریں اور جاسوسی کہانیاں جو آپ کو تجسس یا پریشانی میں مبتلا کردیں' وہ آپ کے دماغ کو ایسے سگنل بھیجتی ہیں جس سے سونے میں دشواری ہوتی ہے۔

☆ ایسے تمام مشروبات جیسے چائے، کافی، سوفٹ ڈرنکس، چاکلیٹ جس میں کیفین ہوتی ہے، شام کے بعد ان کو استعمال کرنے سے گریز کریں کیونکہ آپ کے جسم کو متحرک کرکے نیند سے دور رکھنے میں یہ بھی بنیادی محرک ہوسکتا ہے۔

☆ میلاٹونین ہارمون ہمارے جسم میں جاگنے اور سونے کا حساب رکھتا ہے۔ اس ہارمون کے اضافے یا کمی سے نیند میں

بے ترتیبی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ایسی غذائیں استعمال کرنی چاہئیں جس سے جسم میں میلاٹونین کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ جیسا کہ انناس، کیلے، کینو، ٹماٹر، جو اور مکئی وغیرہ۔

☆ ٹیکنالوجی کو صرف دن کے اوقات تک محدود رکھیں۔ اگر آپ رات کے وقت موبائل، لیپ ٹاپ یا ٹیب وغیرہ استعمال کرنے کے عادی ہیں تو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آپ نیند کی کمی کا شکار ہیں۔ ماہرین کے مطابق موبائل، لیپ ٹاپ یا کسی بھی قسم کی روشنی والی ٹیکنالوجی استعمال کرنے سے انسان نیند کی کمی کا شکار ہوسکتا ہے۔ ان آلات سے نیلے رنگ کی روشنی خارج ہو کر ہمارے دماغ کو سونے سے روکتی ہے۔ سونے سے ایک گھنٹا قبل موبائل یا دیگر آلات کا استعمال ترک کر دیں۔ یہ پرسکون نیند کے لیے بہت اہم ہے۔

☆ بے وقت کی نیند سے گریز کریں خاص طور پر شام کے وقت۔ اپنے مقرر کردہ وقت پر ہی سوئیں تاکہ نیند کا شیڈول خراب نہ ہو۔

☆ سونے سے قبل کچھ نہ کچھ ضرور کھا کر سوئیں۔ آپ کا تجربہ ہوگا کہ خالی پیٹ نیند آنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ خصوصاً کاربوہائیڈریٹس والی غذا کیونکہ اس سے سیروٹونین بنتا ہے۔ یہ ایک ایسا کیمیکل ہے جس سے نیند آتی ہے۔ رات کا کھانا کھاتے ہی لیٹ جانا صحت مند عادتوں میں شمار نہیں ہوتا۔ جس قدر ممکن ہو رات کا کھانا جلد کھانے کی عادت بنائیں۔ ہو سکے تو کھانے کے بعد چہل قدمی کو بھی اپنے معمول کا حصہ لیں۔

☆ ہلکی ورزش۔ سہ پہر کے آخر میں یا شام کو روزانہ کیجیے۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کا سارا دن بیٹھ کر گزرتا ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ ہلکی پھلکی ورزش کو اپنے معمول میں ضرور شامل کریں۔

☆ پرسکون نیند کے لیے اپنے ذہن کو دن بھر کی ٹینشن اور پریشانیوں سے آزاد کریں کیونکہ سٹریس یا تناؤ کی حالت میں نیند بہت مشکل سے آتی ہے۔ زیادہ سوچنا اور ذہنی تناؤ نیند کی کمی کا باعث بنتے ہیں۔ اپنی سوچ کو مثبت بنائیں اور سونے سے قبل تمام پریشانیوں اور معاملات کو دماغ سے باہر نکال پھینکیں۔ لمبے اور گہرے سانس لے کر خود کو اگلے دن کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیجیے۔ ہر آنے والے دن کا سامنا آپ تب ہی کر سکیں گے جب ہشاش بشاش اور تازہ دم ہوں گے اور ایسا اچھی اور گہری نیند کے بغیر ممکن نہیں۔

☆ اگر نیند آنے میں دشواری ہو تو اپنے جسم کے پٹھوں کو ڈھیلا چھوڑ دیں اور ارادتاً خوشگوار اور اچھی باتیں سوچنی چاہئیں۔ عضلات کو ڈھیلا چھوڑنا بذاتِ خود فائدہ مند ہوتا ہے۔ اس سے انسان بتدریج نیند کی وادیوں میں کھو جاتا ہے۔

☆ سونے سے پہلے خوشبو کا استعمال بھی بعض لوگوں کے لیے فائدے مند ہے۔ خوشبو سے آپ خود کو تازہ دم محسوس کریں گے بالخصوص لیونڈر آئل۔ اس کی خوشبو سے انسان کے حواسوں پر نیند طاری ہونے لگتی ہے۔ اس تیل کے چند قطرے سونے سے قبل ماتھے اور کنپٹی پر لگا لیں۔ آپ رات بھر چین کی نیند سوئیں گے۔

☆ روشنی کی قدر کیجیے۔ جیسے ہی صبح جاگیں کوشش کیجیے کہ چند لمحات سورج کی شعاعوں میں گزار لیں کیونکہ علی الصبح سورج کی روشنی دیکھنے سے نہ صرف آپ تروتازہ محسوس کریں گے بلکہ آپ کے دماغ میں موجود قدرتی گھڑیال بھی یہ جان جائے گا کہ اسے کس وقت جاگنا اور کس وقت سونا ہے۔ ●●●

جواب

حضرت لقمان نے باوجود درازیٔ عمر کے کوئی مکان نہیں بنایا۔ ایک جھونپڑی میں وفات پا گئے۔ ملک الموت نے پوچھا: ''باوجود اتنی طویل زندگی کے آپ نے مکان کیوں نہیں بنایا؟''

حضرت لقمان نے فرمایا: ''جس کی تاک میں آپ رہیں تو اس کو مکان بنانے کی کب سوجھتی ہے؟''

اُردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے
اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

0300-4005579
urdudigest.pk
www.urdudigest.pk
subscription@urdudigest.pk

اُردو سے محبت کریں...... اُردو ڈائجسٹ پڑھیں

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے
دلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ---------------------------------- فون نمبر ----------------------
پتا ---------------------------------- ای میل ----------------------
میں ماہ ------ 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔
1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کردوں گا۔ یا
2۔ میں مطلوبہ رقم -------------- روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا
3۔ میں نے --------- روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر IBAN#-Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ یا
4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا
5۔ ہمیں 0300-4005579 پر ایس۔ ایم۔ ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔
تاریخ ---------------- دستخط ----------------

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن منیجر۔ 325,G-III جوہر ٹاؤن لاہور، پاکستان
فون نمبر: +92-42-35290734-8,+92-42-35290707

چارہ گروں کے درمیان

رنگ برنگ معالجوں کے چُنگل میں پھنسے ایک مریض کی ظریفانہ دُہائی

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

گزشتہ دو ماہ سے ہماری گردن میں شدید درد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے گردن کا معائنہ کر کے فرمایا ''مبارک ہو، اب آپ صراط مستقیم پہ گامزن ہو گئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' ہم نے گردن سہلاتے ہوئے سوال کیا۔

بولے ''آپ کی گردن کے مہرے سرک گئے ہیں۔ اب آپ کو کالر پہننا ہو گا جو گردن کو بالکل سیدھی اور اونچی حالت میں رکھے گا۔ بس ذرا چلنے پھرنے میں احتیاط برتیں۔ کہیں کوئی کھلا ہوا مین ہول آپ کو علاج سے بے نیاز نہ کر دے۔'' انہوں نے دوائیں بھی تجویز کیں جو اسی دن سے شروع کر دی گئیں۔

دوسری ملاقات میں انہوں نے حال پوچھا تو ہم نے عرض کیا ''صراط مستقیم پر چلنے کی اذیت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے'' کہنے لگے ''آپ کو فزیوتھراپی کی ضرورت ہے۔'' پھر ہم ایک فزیوتھراپسٹ کے ''ٹوٹل کنٹرول'' میں چلے گئے۔ وہ بڑے پیار سے ہماری گردن کو دائیں بائیں، اوپر نیچے گھماتے۔ بعد ازاں اسے ایک مشین میں کس کر کھینچتے لیکن مشین سے باہر نکلتے ہی گردن پھر ڈھے جاتی۔

ہم نے سرجن صاحب سے اس پریشانی کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا ''اب آپ میری حد سے نکل گئے ہیں۔ میں آپ کو نیورو سرجن کے پاس بھیج رہا ہوں۔'' ہمیں اس بات پر وہ سرجن یاد آ گئے جنہوں نے ایک مریض کے آپریشن کے بعد آپریشن تھیٹر چھوڑتے ہوئے کہا تھا ''بال بال بچا۔'' نرس نے گھبرا کر پوچھا ''سر، خیریت تو رہی؟'' بولے ''اگر میرا نشتر آدھا انچ بھی اِدھر اُدھر ہو جاتا تو آج میں اپنی اسپیشلیٹی سے باہر تھا۔''

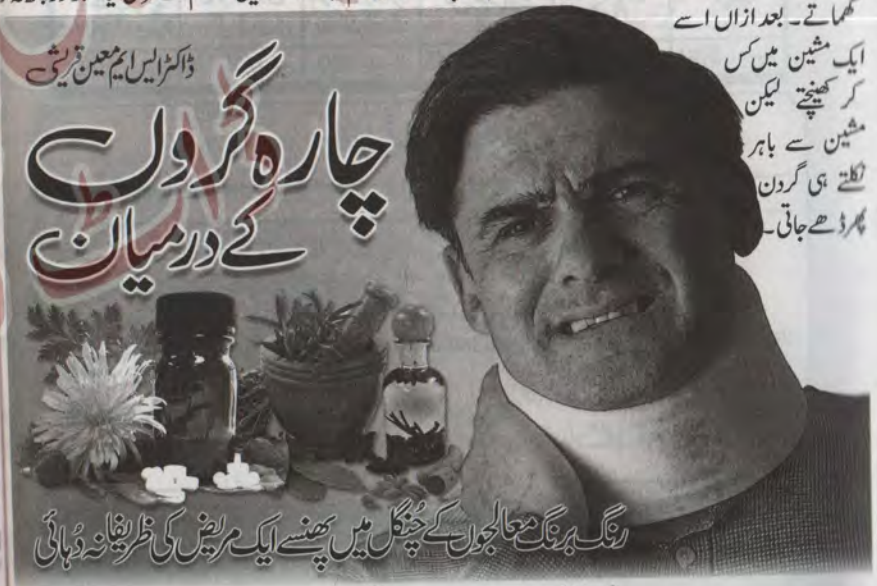

واقعی یہ اسپیشلائزیشن کا دور ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ تھوڑے عرصے بعد دائیں اور بائیں نتھنے کے ماہر الگ الگ دستیاب ہوں۔ آرتھوپیڈک سرجن نے ہمیں نیورو سرجن کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے معائنہ کر کے کہا ''میرے بھائی یہ ہڈی کا مسئلہ ہی نہیں، آپ کی گردن کی نس دب گئی ہے۔ کیا آپ دماغی کام بہت کرتے ہیں؟'' ہم نے عرض کیا ''جو اور کچھ نہ کر

سکے وہ کیا کرے؟'' ڈاکٹر صاحب نے ہمارے جواب کی بلاغت نظر انداز کرتے ہوئے دوائیں تجویز کر دیں اور فزیوتھیراپی بند کروا دی۔ اب ہم تھے، دوائیں تھیں، درد تھا، گھر تھا اور گھر والی۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن ہمیں اندازہ نہ تھا کہ ہمیں ایک زیادہ کڑی آزمائش سے گزرنا ہو گا جسے عرف عام میں عیادت کہتے ہیں۔ ایک ہفتہ بعد دوستوں نے عنایات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ہم نے حسب استطاعت عیادت کا جواب ''ضیافت'' سے دے کر مشرقی روایات کی پاسداری کی لیکن ان ہی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے ہمارے بہی خواہ ہمدردی میں حدِّ اعتدال سے گزر گئے۔

ایک صاحب نے حال سن کر فرمایا ''اللہ خیر کرے۔ یہ فالج کی علامات ہیں، مکمل علاج ضروری ہے۔'' ہمیں یہ تنبیہ سن کر جھرجھری آ گئی۔ اب ہم نے فیصلہ کر لیا کہ کسی کو صحیح صورت حال سے آگاہ نہیں کریں گے۔ سیاست دانوں کی طرح ''سب ٹھیک ہے'' کا ورد کریں گے اور چہرے سے تروتازگی کے (مصنوعی) تاثرات ظاہر کریں گے۔

اب جو احباب عیادت کے لیے آتے وہ ہمیں بھلا چنگا دیکھ کر مایوس ہوتے۔ ایک صاحب نے تو صاف کہہ دیا ''بڑی دور سے آیا ہوں۔ خیال تھا کہ آپ بستر پر ہوں گے مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا نکلا۔'' پھر باتوں باتوں میں کہنے لگے ''مجھے واپس چھڑوانے کا بندوبست ہو سکتا ہے؟'' عرض کیا ہم خود گاڑی ڈرائیو نہیں کر سکتے اور ڈرائیور چلا گیا ہے۔ یہ سن کر وہ برا سا منہ بنا کر چلے گئے۔

ایک رفیق کار نے مشورہ دیا کہ حکیم کو دکھا دو۔ ہم نے کہا اس وقت بھی محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ ارشاد ہوا ''ان ہاتھوں کو حکیم صاحب کی معجون سے مضبوط تر کیجیے۔'' موصوف دوبارہ آئے تو اپنے ساتھ ایک ڈبیا میں معجون بھی لیتے آئے جس کا نام کچھ اس قسم کا تھا جیسے پرانے زمانے کی طوائفوں کے نام ہوا کرتے تھے...... ہاں یاد آیا ''سورنجان۔'' ساتھ میں مالش کے تیل کی شیشی بھی تھی۔ فالج سے ڈرانے والے دوست کے مکمل علاج کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ حکیم کی دوا بھی شروع کر دی۔

ہمارے ایک بزرگ عیادت کے لیے آئے تو ڈانٹ کر کہنے لگے' میاں اس کا سب سے مؤثر علاج ہے گنڈا۔ ایک لمحے کے لیے ہم سمجھے کہ انہوں نے ''ڈنڈا'' کہا ہے۔ ہم نے سسکی بھری تو بولے' کل فجر کے بعد آپ کو اپنے پیر و مرشد کے پاس لے جاؤں گا۔ ہم نے سوچا محض دل بہلانے کے لیے یہ بات کہی گئی ہے لیکن وہ دوسرے دن علی الصباح آن دھمکے۔ کڑاکے کی سردی میں لحاف میں سے نکلنا اور چند منٹ میں تیار ہونا درد سے زیادہ دردناک تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ ان کا دل رکھنے کے لیے یہ مشقت بھی برداشت کر لی۔

گردن میں کالر فٹ کر کے دبکے دبکائے ہم صوفی صاحب کے آستانے پر پہنچے تو وہاں پہلے ہی بہت سے فریادی موجود تھے۔ ایک عورت کہہ رہی تھی ''صوفی صاحب میرے بچے کے جلاب بند نہیں ہوتے۔'' فرمانے لگے ''یہ تعویذ گھول کر پلاؤ ٹھیک ہو جائے گا۔'' دوسری نے بپتا سنائی ''صوفی جی میرا شوہر دوسری شادی کی دھمکی دیتا ہے۔'' اسے بھی وہی تعویذ دیتے ہوئے بولے ''اس کا پانی گھول کر پلاؤ دوبارہ نہیں دے گا۔'' ہم ابھی اس کثیرالجہتی تعویذ کی برکات پر غور کر رہے تھے کہ صوفی جی ہماری طرف متوجہ ہوئے۔

ہم نے چاہا کہ حال بتائیں لیکن ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے ''آپ کچھ نہ بولیے۔ آپ کی پیشانی بتا رہی ہے کہ گردن میں تکلیف ہے۔'' ہم نے آنکھ کے اشارے سے ان کی تشخیص کی تصدیق کی جس پر وہاں بیٹھے ہوئے ان کے عقیدت مندوں نے سبحان اللہ کا ورد شروع کر دیا حالانکہ گردن میں کسا ہوا کالر دیکھ کر یہ بات ایک بچہ بھی بتا سکتا تھا۔ صوفی جی نے ہمیں وہی کراماتی تعویذ گلے میں ڈالنے کے لیے دیا۔ ہم نے ان کی ''خدمت'' کرنی چاہی لیکن وہ ناراض ہو کر بولے ''میرے لیے حرام ہے کسی سے

ایک پیسا بھی وصول کرنا۔'' پھر جس گدی پر بیٹھے ہوئے تھے' اس کا کونہ اٹھاتے ہوئے فرمایا ''جسے کچھ دینا ہوتا ہے وہ خود گدی کے نیچے رکھ دیتا ہے۔ مجھے روپے پیسے کا لالچ نہیں' یہ سب رقم سالانہ نیاز کے کام آتی ہے۔''

ہم نے عہد کرلیا کہ اس قسم کا اظہار محبت کرنے والوں سے صاف کہہ دیں گے۔

عزیز اتنا ہی رکھو کہ دِل سنبھل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

لیکن اگلے روز جو صاحب عیادت کے لیے آئے انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہمارے ہی فون سے ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا وقت لے لیا۔ ہم نے لاکھ سمجھایا کہ کہیں معدے میں دواؤں کی عالمی جنگ نہ شروع ہو جائے لیکن ان کا استدلال تھا کہ ہومیو پیتھک علاج بے ضرر ہے، کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اب کوئی غور کرے، جو دوا (غلط استعمال پر بھی) نقصان نہیں پہنچا سکتی وہ بھلا فائدہ کیا پہنچائے گی؟ تاہم دوستی کا بھرم رکھنے کی خاطر ہم نے ہومیو پیتھک کی خدمت میں بھی حاضری لگا دی اور وہاں سے جھولیاں بھر کے دوائیں لے آئے۔

ایسا نہیں تھا کہ تمام ہی ''عیادت گزار'' دوائیں لا اور بتا رہے تھے۔ کچھ مہربان پھول اور صحت یابی کے کارڈ بھی لائے اور انہوں نے خاصی خوش ذوقی کا ثبوت دیا۔ مثلاً ایک دوست کے کارڈ پر یہ خواہش تحریر تھی: Get well soon (جلد صحت یاب ہوجاؤ) ان کے جانے کے بعد ہمارے باس تشریف لائے۔ ان کے کارڈ پر یہ حکم درج تھا: Get well immediately (فوراً صحت یاب ہو جاؤ) لغت میں soon اور immediately کے معنی ایک ہی ملیں گے لیکن دونوں کا فرق صاف ظاہر ہے۔

اپنے ایک دیرینہ کرم فرما کے اصرار پر ہم ایک اور آرتھوپیڈک سرجن کے پاس پہنچے۔ انہوں نے بہت محبت سے معائنہ کر کے آپریشن کروانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ یہ نیورو سرجن کا کیس ہی نہیں، آپ کا علاج صرف آپریشن ہے۔ آپ چاہیں تو آپ کی گردن کٹوانے کا بندوبست لندن میں ہوسکتا ہے۔ وہاں میرا گھر بھی ہے' آپ جب تک چاہیں اُس میں رہیں۔ اب ہم ڈاکٹر صاحب کو کیا بتاتے کہ لندن میں رہنے کے لیے ایک گھر کے علاوہ بھی بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔ انہوں نے فزیوتھراپی دوبارہ جاری کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

کرم فرماؤں کی عنایت سے آج کل ہم ڈاکٹر کی دوائیں بھی کھا رہے ہیں اور حکیم کی بھی۔ فزیوتھیراپی بھی کروا رہے ہیں اور ہومیو پیتھک دوا کا استعمال بھی جاری ہے۔ صوفی جی کا تعویذ گلے میں برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہماری بیگم نے اٹھا رکھی ہے اور اس سے بچنا ناممکن ہے۔ تمام معالجین کی آراء کا تجزیہ کریں تو صورت حال اس طرح بنتی ہے:

☆ نیورو سرجن کا کہنا ہے کہ یہ ہڈیوں کا کیس نہیں۔
☆ آرتھو پیڈک سرجن کا استدلال ہے کہ اس میں نیورو سرجن کا کوئی دخل نہیں۔
☆ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ متاثرہ حصوں پر تیل کی مالش ضروری ہے۔
☆ ڈاکٹروں نے تنبیہ کر رکھی ہے کہ مالش سے کیس بگڑ جائے گا۔
☆ فزیوتھراپسٹ کا خیال ہے کہ ہلکی ورزش اور گردن کھینچے بغیر فزیوتھراپی بے کار ہے۔
☆ آرتھو پیڈک سرجن کو اس سے اتفاق ہے لیکن نیورو سرجن اس کے مخالف ہیں۔
☆ ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا فرمان ہے کہ سب کچھ بند کر دو صرف میری دوائیں کھاتے رہو، فلاح پاؤ گے۔

ہماری حالت ان سب کے آگے ایسی ہے کہ...... مردہ بدست زندہ۔ شاید ایسی ہی کسی صورت حال کے لیے ہمارے دوست رضی اختر شوق (مرحوم) نے کہا تھا

ایک طرف میں جاں بلب تارِ نفس شکستنی
بحث چھڑی ہوئی اُدھر چارہ گروں کے درمیاں

یوں تو میٹھا ہر دور اور ہر علاقے میں خوراک کے پسندیدہ جز کی حیثیت سے دستر خوان کا حصہ رہا ہے لیکن موجودہ دور میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم مٹھاس میں ڈوب چکے۔ بچوں کی گولیوں' ٹافیوں سے لے کر چاکلیٹ، سوڈا اور کیک تک، میٹھایوں ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکا کہ بظاہر اسے ترک کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

ویسے تو ہر چیز کو اعتدال میں رکھ کر استعمال کرنا چاہیے مگر مٹھاس کا معاملہ خاص احتیاط کا متقاضی ہے۔ خاص طور پر سفید چینی، جسے ماہرین صحت سفید زہر سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ اس میں مصنوعی کیمیکلز کی آمیزش اسے اور زیادہ مضر صحت بنا دیتی ہے۔

یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا کی تازہ رپورٹ کے مطابق ایک عام آدمی اپنی روزمرہ خوراک میں چینی کے استعمال سے تقریباً تین سو حرارے حاصل کرتا ہے۔ جب کہ متمول افراد میں سے بیس فیصد روزانہ کی بنیاد پر سات سو اضافی حرارے اپنے جسم کا حصہ بناتے ہیں۔ یہ چینی سے بھرے ایک کپ کے برابر ہے۔

جیسے جیسے لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا' مختلف خطوں کے کھانے دوسری جگہوں میں بھی مقبولیت حاصل کرتے چلے گئے۔ معاملہ یہیں نہیں رکا بلکہ ان کھانوں میں نئی نئی اختراعات کی جانے لگیں۔ اب روایتی سلاد جیسی سادہ غذا کو بھی آرائش و زیبائش سے مزین کرنے کا رواج چل پڑا ہے لیکن طرفہ تماشا یہ کہ سجاوٹ کے لیے جو اجزا استعمال کیے جاتے ہیں' ان میں چینی وافر مقدار میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پاستا' سوس اور دہی بھی اپنی غذائی افادیت چینی کے ہاتھوں کھونے لگے ہیں۔ امریکن ہارٹ ایسوسی ایشن خواتین کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ چھ چائے کے چمچ روزانہ سے زیادہ چینی استعمال نہ کریں۔ اس پچیس گرام وزن کے برابر چینی سے حاصل ہونے والوں حراروں کی تعداد سو (۱۰۰) سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

جو مرد و زن حد سے زیادہ چینی کھانے لگیں' وہ بے چینی'

تھکن اور بے آرامی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ذہنی دباؤ بھی انھیں چمٹ سکتا ہے لیکن اوسط مقدار میں چینی استعمال کرنے والوں کے لیے اس کا ترک کرنا یا استعمال میں کمی کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ بس ذرا سی قوت ارادی اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ کوئی بھی نشہ چھوڑنے کے لیے ضروری ہے۔ جی ہاں چینی بھی ایک نشہ ہی ہے۔ گو یہ ایک آسان کام نہیں مگر صحت کو حاصل ہونے والے فوائد اتنے واضح ہیں کہ جیسے ہی مٹھاس سے جان چھوٹتی ہے، فوراً ہی انسان اپنی صحت بہتر ہوتی محسوس کرتا ہے۔ چند اہم فوائد مندرجہ ذیل ہیں:

آپ جوان نظر آنے لگیں گے:

انتھونی یوان کا کہنا ہے ''چینی گلایکیشن کا سبب بنتی ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے چینی کے سالمے ایک دوسرے سے مضبوطی کے ساتھ جُڑ کر ہماری جلد کے پروٹین غیر منظم کر ان کی لچک ختم کر دیتے ہیں۔ یہی پروٹین اور لچک دو ایسے عناصر ہیں جو ہماری جلد کو جوان اور کومل خصوصیات کا حامل رکھتے ہیں۔'' ان کا مزید کہنا ہے ''چینی ترک یا اس کا استعمال کم کرنے سے خون میں گلوکوز اور انسولین کی قاشیں بننے کا عمل بھی کم ہو جاتا ہے۔ عمر کے بڑھنے سے منسلک دائمی اور شدید سوزش بھی کم ہو جاتی ہے۔ چینی کا استعمال ترک کرنے کے محض چودہ دن کے بعد آپ اپنی جلد کی چمک دمک کا خود بھی نظارہ کر سکتے ہیں۔''

جے ڈینیکو لانٹونیو کا کہنا ہے ''اگر چینی کا استعمال ترک یا کم کر دیا جائے تو خون میں موجود نقصان دہ کلیسٹرول ''ایل ڈی ایل'' کا تناسب چند ہی ہفتوں میں دس فیصد کم ہو جاتا ہے۔ نیز ''ٹرائگلر ائڈس'' جو خون میں ایک قسم کی چربی ہے۔ بھی بیس تا تیس فیصد کم ہو جاتی ہے۔ اس باعث بلڈ پریشر ٹھیک رہتا ہے اور دل کے دورے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔''

نوعمری میں کیل مہاسے نکلنا ایک عام بات ہے۔ اس کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں لیکن ادھیڑ عمری میں نکلنے والے کیل مہاسوں کی ایک اہم وجہ چینی کا بے دریغ استعمال ہے۔ چینی زیادہ کھانے سے جسمانی نظام میں آنے والی تبدیلیوں کے باعث بافتوں میں سوزش کی شکایت پیدا ہونا مسلمہ حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ خون میں چکنائی اور چربی بڑھ جاتی ہے۔ امریکن جرنل آف کلینکل نیوٹریشن کی ایک تحقیق کے مطابق سوڈا نہ پینے والوں کو جب بارہ اونس کا ایک سوڈا کین روزانہ پینے کے لیے دیا گیا تو محض تین ہفتوں بعد ان کے جسم میں سوزش کی سطح ''ستاسی فیصد'' تک بڑھ گئی۔ تحقیق کنندہ کا کہنا ہے ''سوڈا اور دوسرے میٹھے مشروبات پینا چھوڑ دینے سے آپ چہرے کی جھریوں اور کیل مہاسے چھپانے کے لیے مہنگی قسم کی کریمیں خریدنے سے بچ جائیں گے۔''

اکثر لوگوں کو شکایت ہوتی ہے کہ ان کے دماغ میں دھند سی چھائی رہتی ہے اور وہ غیر حاضر دماغی اور سستی کی کیفیات کا شکار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی چینی کے استعمال میں زیادتی ہو سکتی ہے۔ جانوروں پر کی جانے والی ایک تحقیق سے یہ بات سامنے آ چکی کہ غذا میں چینی کی زیادتی سیکھنے اور یاد رکھنے کے عمل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ حد اعتدال سے زیادہ چینی کا استعمال دماغی خلیوں کے درمیان مواصلاتی رابطے کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔

آپ خوش رہیں گے:

چینی کھانے میں افراط اور ذہنی دباؤ کے مابین گہرے روابط ہیں۔ ماہر غذائیات میگن گلمور کہتی ہیں: ''ذہنی دباؤ اور چینی کے زائد استعمال کے درمیان تعلق کی وجہ یہ ہے کہ چینی دائمی سوزش پیدا کرتی ہے۔ یہ چیز دماغ کے افعال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جب آپ چینی کا استعمال ترک یا کم کر دیں، تو صرف ایک دو ہفتوں میں آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ذہن سے دھند چھٹ رہی ہو اور آپ کا مزاج بھی خوش گوار ہونے لگتا ہے۔'' تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ انسان چینی زیادہ کھائے، تو خون میں گلوکوز بڑھنے سے وہ ذہنی دباؤ کا نشانہ بن جاتا ہے۔

ایک اور امریکی ماہر غذائیات، لیھ کاوُف مین بتاتی ہیں ''اگر آپ اپنے خون میں گلوکوز کی قاشیں بننے کے عمل کو قابو میں رکھ سکیں تو اپنے مزاج کو بھی قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ آپ کسی ایسے بچے کا تصور کریں جو تہوار کے موقع پر بہت زیادہ ٹافیاں کھائے تو بعد میں وہ بہت چیخنے چلانے اور شور مچانے لگتا ہے۔ ٹافیاں کھانے سے اس کے خون میں گلوکوز کی سطح بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سو یہی معاملہ بڑوں کا بھی ہے۔''

آپ وزن گھٹا سکتے ہیں:

بوسٹن کے ہاورڈ اسکول آف پبلک ہیلتھ کے مطابق ایک عام آدمی اوسطاً بائیس چائے والے چمچے چینی روزانہ استعمال کرتا ہے۔ یہ تقریباً ساڑھے تین سو حراروں کے برابر ہے۔ کاوُف مین کہتی ہیں ''چینی ایک نشے کی مانند ہے۔ جب ہم اس کے استعمال میں کمی کریں، تو یوں ہم کم حرارے استعمال کرتے اور وزن گھٹانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے، غذائیت جب آپ چینی کے بجائے مکمل غذائیت بخش قدرتی خوراک کھاتے ہیں تو ہارمون قدرتی طور پر فعال ہو کر دماغ کو سگنل بھیجتے ہیں کہ آپ کافی کھا چکے لہٰذا چینی ترک کرنے سے آپ بغیر جدوجہد اپنا وزن گھٹا لیں گے۔ اکثر اوقات ہفتے کے اندر اندر ہی وزن میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔

زکام سے بچاؤ:

پہلے ذکر آ چکا، چینی دائمی سوزش کا باعث بنتی ہے۔ اس سے ہمارے مدافعتی نظام کی نزلہ زکام والے جراثیموں کے خلاف لڑنے کی صلاحیت کمزور پڑ سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ چینی کھانا بند کر دیں، تو پورے سال میں شاید ہی آپ بیمار پڑیں گی۔ یہ عمل الرجی اور دمہ کی علامات کم کرنے میں بھی مددگار بنتا ہے۔

''امریکن جرنل آف کلینکل نیوٹریشن'' کی رپورٹ کے مطابق صرف سو گرام چینی خون کے سفید خلیوں کی جراثیم کو ہلاک کرنے کی صلاحیت پچاس فیصد کم کر دیتی ہے۔ یہ کمی تقریباً پانچ گھنٹوں تک برقرار رہتی ہے۔

ذیابیطس کا خطرہ کم ہو جاتا ہے:

چینی کھانا چھوڑنے سے جسم کے اُن قدرتی نظاموں کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنا کام صحیح طریقے سے انجام دیں جو جسم سے فاسد مادہ نکالنے کے ذمہ دار ہیں۔ ماہر غذائیات، مارک الابنزا اس بات کی یوں وضاحت کرتے ہیں ''چینی ترک کرنے کے پہلے دو گھنٹوں میں ہی لبلبہ انسولین کی کم مقدار بنانے لگتا ہے۔ جگر بھی جسم میں جمع شدہ زہریلے مادے تحلیل کرنے کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ ان کا مزید کہنا ہے ''چینی کے مضر اثرات مکمل طور پر ختم کرنے کا عمل پانچ ہفتوں پر محیط ہو سکتا ہے مگر بالآخر جسم ان اثرات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔''

دراصل چینی کے استعمال سے جگر کے اردگرد فاضل چربی کی تہ بننے لگتی ہے۔ وہ انسولین بننے کے عمل میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔ یوں لبلبے کی کارکردگی متاثر ہو جاتی ہے۔

ماہرین کی رو سے چینی کھانے پر بننے والے ڈیڑھ سو حرارے پروٹین کے اتنے ہی حراروں کی نسبت ذیابیطس قسم دوم چمٹنے کا خطرہ گیارہ گنا زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ اس لیے ماہرین کہتے ہیں کہ کھانے کے بعد چینی والی اشیاء نہیں بلکہ خشک میوے کھائیے۔

لمبی عمر جینے کا راز:

چینی سے بنی غذا کھانے کے بعد خون میں بننے والا گلوکوز تحلیل کرنے کی خاطر ہمارا جسم زیادہ مقدار میں انسولین بناتا ہے۔ یہ عمل ہمارے اعصابی نظام کے خاص حصے کو فعال کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں دل کی دھڑکن اور خون کا دباؤ بڑھ جاتے ہیں۔ کاوُف مین کہتی ہیں ''بلند فشار خون دل کی بیماریاں جنم لینے کی اہم وجہ ہے۔ دیگر وجوہ میں ذیابیطس اور موٹاپا بھی شامل ہیں۔ غذا میں چینی کی زیادتی ان دونوں کو پیدا کرتی ہے۔ ایک تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جو لوگ زیادہ مقدار میں چینی استعمال

کریں، وہ دل کی بیماریوں سے جلد انتقال کر جاتے ہیں۔

مہکتی سانس اور خوبصورت مسکراہٹ:

میٹھا کھانے کی عادت اپنی جگہ لیکن جب بات آپ کی دلکش مسکراہٹ کی ہو تو؟ نیویارک کے دندان ساز، ساؤل پریسر کا کہنا ہے ''دانتوں کے اندر خلا پیدا کرنے میں چینی کا اہم کردار ہے۔ یہ منہ کے اندر جراثیم کے ساتھ مل کر تیزابیت کو جنم دیتی ہے۔ اس کے باعث وہ خلا جراثیم کی آماجگاہ بن جاتے ہیں اور دانت گلنا سڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔''

ان کا مزید کہنا ہے ''چینی کھانا چھوڑ دینے سے سانس کی بدبو بھی ختم ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ کہ جراثیم میٹھی اشیاء کھا کر ہی پلتے بڑھتے ہیں۔ اس لیے چینی کے ترک استعمال کے فوائد فوراً ہی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ گوان کے مستقل حصول میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس کے لیے ایسی غذا کھائیے جو آپ کے دانتوں کو صحت مند رکھنے میں مددگار بن سکے۔''

یاد رہے اگر آپ چینی کا استعمال چھوڑ دیں گے تو کچھ عرصہ تک آپ بدمزاجی کا شکار ہو سکتے ہیں لیکن ایک بار ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ہمیشہ کے لیے خود کو بہت بہتر محسوس کریں گے۔

پرسکون نیند:

اگر آپ رات کے وقت میٹھا کھانے کے شوقین ہیں تو پرسکون نیند سے محروم ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ہے مین کہتے ہیں ''اگر کسی کو رات کے وقت میٹھا کھانے کی عادت ہو تو وہ اعتدال اپنا کر اس کے بداثرات سے بچ سکتا ہے۔ سونے سے پہلے چینی یا میٹھے کا استعمال ذہنی تناؤ پیدا کرنے والے ہارمونز کو اضافی طاقت اور توانائی فراہم کر دیتا ہے۔ یہ عمل پھر کم خوابی باعث بنتا ہے۔ جب آپ چینی سے بنی اشیاء کھانا چھوڑ دیں تو دو تین روز کے اندر اندر آپ بچوں کی طرح پر سکون نیند کے مزے لینے لگتے ہیں۔''

ماہر غذائیات رابرٹ لسٹگ کا کہنا ہے کہ زیادہ میٹھا کھانے سے خون میں گلوکوز کی مقدار بڑھ جانے پر بے خوابی کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ تب نیند لانے کے لیے مالش یا اسی طرح کے دیگر ٹوٹکے آزمانے پڑتے ہیں۔ زائد چینی کا استعمال جسم میں ''کورٹیسول'' نامی ہارمون کو تحریک دینے کا موجب بنتا ہے جس سے نیند میں مداخلت ہونے لگتی ہے۔ چینی کا استعمال ترک کر دینے سے دن بھر آپ چاک و چوبند رہیں گے اور رات کو پرسکون نیند سوئیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ میٹھا یا چینی کھانے کے عادی افراد کے لیے اسے چھوڑنا امر محال ہے۔ چینی کھانا چھوڑنے کے بعد مزاج میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ مثلاً ذہنی دباؤ، غصہ و چڑچڑاپن قریباً دو ہفتوں تک طبیعت میں غالب رہتا ہے اگر آپ بہت زیادہ میٹھا کھانے کے عادی ہیں تو یہ کیفیت ایک ماہ تک بھی رہ سکتی ہے۔ یہاں تک کہ کم حراروں والی مصنوعی مٹھاس ''ایسپرٹیم'' بھی ایسے ہی منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ اسی لیے بہتر یہی ہے کہ چینی چھوڑنے کے دوران متبادل کے طور پر مصنوعی مٹھاس بھی استعمال نہ کیا جائے۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے ''چینی ترک کرنے سے سر درد، زکام جیسی علامات چمٹ سکتی ہیں اگر ایسا ہو تو انہیں ورزش کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔'' وہ تجویز کرتے ہیں ''تیز رفتار سے طویل فاصلے تک چلنا اس سلسلے میں مفید ہے کیونکہ اس سے دوران خون بہتر ہوتا ہے اور غذا آسانی سے جزو بدن بن جاتی ہے۔ جسمانی قوت مدافعت بڑھتی ہے۔ یوں انسان میں مثبت تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور اس کا ذہن ارتکاز کی قوت حاصل کر لیتا ہے۔

آیئے آج سے ہی عہد کریں کہ اگر ہو سکے تو چینی کو بالکل ہی ترک کر دیں گے۔ وگرنہ کم از کم اتنا تو ضرور کریں گے کہ اس کا استعمال کم سے کم کر دیں تا کہ اس سفید زہر کے مضر اثرات سے بچ کر صحت مند اور تندرست زندگی گزار سکیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔

توپ کاپی کی زیارت

آخری قسط

ڈاکٹر آصف محمود جاہ
(ستارۂ امتیاز)

توپ کاپی میوزیم کا خاص حصہ محل کے ایک خاص کونے میں بنایا گیا ہے اور اس کو خوبصورت اور شاندار بنانے کے لیے ممکنہ حد تک کوشش کی گئی ہے۔ صدر دروازے پر خوبصورت نقاشی والی قرآنی آیات کندہ ہیں۔ ہم عقیدت اور عجز و نیاز سے میوزیم کے اس متبرک حصے میں داخل ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا جس نے ایک دیرینہ خواہش پوری کر دی۔ میوزیم کے اس حصے میں انبیاء علیہ السلام، حضور پرنور حضرت محمد ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زیر استعمال اشیاء کا عظیم خزانہ موجود ہے۔

عجائب گھر کے ماہر ڈاکٹر طاہر نے بتایا ''ترک زبان میں کندہ ہے کہ جب تک یہ دنیا باقی رہے گی، ہم ان تبرکات کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ جونہی آپ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں تو لحن داؤدی میں تلاوت قرآن آپ کے کانوں میں پڑتی ہے۔ پرنور اور متبرک ماحول میں جب آپ کی نظر تبرکات مقدسہ پر پڑتی ہے تو بندہ ان تبرکات کو دیکھنے میں ایسا مستغرق اور فنا ہو جاتا ہے کہ اسے اپنا آپ یاد نہیں رہتا۔

ہم بھی جونہی اندر داخل ہوئے تو تلاوت قرآن اور تازہ ہوا کے جھونکے نے استقبال کیا۔ وہاں تو نوادرات، انبیاء، صحابہ کرامؓ کے زیر استعمال اشیاء کا ایسا نادر و نایاب خزانہ ہے کہ ایک ایک شے کو دیکھنے کے بعد تاریخ کا پہیہ گھومتا ہے۔ کبھی بندہ حضرت یوسفؑ کے عہد میں پہنچ جاتا ہے اور ان کے بھائیوں کو گندم کی بوریاں لیے صدارتی محل سے نکلتے دیکھتا ہے۔ کبھی حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ کے عہد میں چلا جاتا ہے اور عصائے کلیمی کے کمالات دیکھتا ہے۔ کبھی جنگ اُحد کا نظارہ کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عمار بن یاسرؓ اور جعفر طیارؓ کے زیر استعمال تلواریں دیکھ کر غزوات میں صحابہ کرامؓ کو دشمنانِ اسلام کو تہہ و تیغ کرتے دیکھتا ہے۔

آپ ﷺ کی زرہ، دندان مبارک اور مہر نبوت دیکھ کر اس کو بار بار آنکھوں میں لگانے اور بسانے کو جی چاہتا ہے اور بندہ غزوات میں آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے ہم رکاب ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ کی ڈاڑھی کے بالوں کو دل میں بسا لیتا ہے۔ سیدنا امام حسینؓ کے عمامہ کو دیکھ کر کربلا پہنچ جاتا ہے۔ حجر اسود کے خول کو دیکھ کر اپنے آپ کو حجر

اسود کو بوسہ دیتے ہوئے پاتا ہے اور میزاب رحمت کا نظارہ کرتے ہوئے ابرِ رحمت کے چند قطروں کا منتظر رہتا ہے۔

مختلف ادوار میں بیت اللہ کی چابیاں دیکھ کر بیت اللہ کا دروازہ کھلنے اور اندر جانے کا منتظر رہتا ہے۔ یہاں آ کر اپنا آپ فراموش ہو جاتا ہے کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہاں کیا کچھ نہیں؟ ایک مسلمان کا عقیدہ مضبوط کرنے کے لیے سب کچھ موجود ہے۔ آپ ﷺ کے نقش پا دیکھ کر دل کرتا ہے کہ ان میں غرق ہو جائے۔ آپ ﷺ کے پاؤں کی خاک بن جائے۔ اس کمرے کے وسط میں شیشے کے بڑے شوکیس میں بیت المقدس کا ماڈل رکھا ہے۔ یہاں ہی حضور اکرم ﷺ کی وہ انمول مہر آنکھوں کی ٹھنڈک اور روح کو سکون بخشتی ہے جو قیصر و کسریٰ کو لکھے گئے خطوط پر ثبت تھی۔ آپ ﷺ کے دستِ مبارکہ سے لکھا ہوا وہ خط بھی یہاں ایک فریم میں موجود ہے جو آپ ﷺ نے مصر کے بادشاہ کے نام لکھا تھا۔

علاوہ ازیں آپ ﷺ کا موئے مبارک، دانت مبارک، مقدس لباس اور اسلامی پرچم سونے اور چاندی کے صندوقوں میں بند ہیں۔ حضور ﷺ کی مقدس عبائے مبارکہ بھی یہاں موجود ہے جس کے متعلق تاریخ کی کتابوں میں لکھا گیا ہے:

''ایک مرتبہ حضرت کعبؓ بن زہیر نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں قصیدہ لکھا تو آپ ﷺ نے خوش ہو کر اپنی عبائے مبارکہ انعام کے طور پر عنایت فرمائی۔ حضرت کعبؓ بن زہیر جب تک زندہ رہے، عبائے مبارکہ کو سینے سے لگائے رکھا۔ ان کی وفات کے بعد خلفائے راشدین نے اپنی جان و مال سے بڑھ کر اس کی حفاظت کی۔ پھر وہی عبائے مبارکہ بنو امیہ اور بنو عباس سے نسل در نسل سفر کرتی ہوئی مصر کے بادشاہوں تک پہنچی۔ ۱۵۱۷ء میں جب عثمانی سلطان سلیم نے مصر کو فتح کیا تو وہ بہت سے مقدس تبرکات کے ساتھ اس مقدس عبا کو بھی استنبول لے آیا۔ یہ عبائے مقدسہ باہر سے کالی اون اور اندر سے بادامی رنگ کی ہے۔ غالباً اندر اونٹ کی اون سے بنائی گئی ہے۔

حضرت یحییٰؑ کی زیر استعمال اشیاء، حضرت یوسفؑ کا عمامہ، حضرت موسیٰؑ کا عصائے کلیمی، حضور ﷺ کے ڈاڑھی کے بال، جنگ احد میں ٹوٹنے والے آپ ﷺ کے دندان مبارک، آپ ﷺ کی زرہ مبارک، آپ ﷺ کے زیر استعمال تلواریں، حضرت فاطمہؓ کا خوبصورت جیولری بکس، بیت اللہ کی چابیاں، حجر اسود کا سونے کا خول، بیت اللہ میں لگا ہوا میزابِ رحمت، بیت اللہ کا دروازہ..... یہ سب چیزیں ایمانی روح کو تازہ کرنے کے لیے موجود ہیں۔ حضرت محمد ﷺ رسول اللہ کے ڈاڑھی مبارک کے بالوں کو بار بار نظر لگا کر دیکھا۔ ان کو دیکھنے کی سعادت پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ دل کر رہا تھا کہ ان مقدس نوادرات کے سامنے کھڑے کھڑے زندگی کی شام ہو جائے اور زندگی تمام ہو جائے۔

نوادرات دیکھتے دیکھتے ظہر کا وقت ہو گیا۔ عجائب گھر کے ایک کونے میں نماز باجماعت ادا کی جا رہی تھی۔ وہاں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ عجائب گھر کا ایک نوجوان اہل کار نماز کی امامت کر رہا تھا۔ اس سے مصافحہ کیا، گلے لگایا اور دعا دی۔ مسجد کے ساتھ ہی سامنے آبنائے باسفورس اور اس میں چلتے ہوئے جہاز نظر آ رہے تھے۔ شکیل نے بتایا کہ سامنے نظر آنے والا پل استنبول کو یورپی اور ایشیائی حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ہم اس وقت استنبول کے یورپی حصے میں ہیں جبکہ پل کے پار پرانا استنبول ہے جہاں ایشیائی کلچر کا رنگ غالب ہے۔

توپ کاپی پیلس میوزیم میں خوب گھومے۔ ایک ایک جگہ کو جی بھر کے دیکھا۔ اسماء نے بتایا کہ پچھلے دنوں جتنے بھی ترکی ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہوئے، ان سب کی ریکارڈنگ انہی جگہوں پہ ہوتی ہوگی۔ اس میوزیم میں کئی گھنٹے گذر گئے۔ گھوم گھوم کر خاصے تھک چکے تھے مگر آیا صوفیہ دیکھنا بھی ضروری تھا۔

ہم نے میوزیم کے باہر پوڈونگ نامی ریسٹورنٹ میں لذیذ ترکش کھانا کھایا۔ پچھلی میز پر ایک بزرگ ترک بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں پاکستانی ہونے کا پتا چلا تو بڑی گرم جوشی

سے ملے۔ کھانے اور چائے کی پیش کش کی۔ توپ کاپی میوزیم کے باہر کھانے پینے کے کئی ریسٹورنٹ ہیں مگر پوڈونگ ان سب میں ممتاز تھا۔ اندر لگے ہوئے اخباری تراشوں کے مطابق یہ ۱۹۵۷ء میں قائم ہوا اور یہاں بڑے بڑے لوگ کھانا کھا چکے جن میں اب ہم بھی شامل ہو گئے ہیں۔

ترکی میں سارے ہوٹل اور ریسٹورنٹس خوب صاف ستھرے اور اجلے ہوتے ہیں۔ صفائی ستھرائی کا اعلیٰ معیار ہے۔ مجال ہے کہیں کوئی گرد یا گندگی نظر آ جائے۔ کھانا بھی لذیذ اور مزیدار ہوتا ہے۔ اگرچہ ہمارے جیسا مسالے دار اور گھی/تیل میں لتھڑا ہوا بالکل نہیں ہوتا، اس لیے ترکی کے زیادہ تر لوگ سمارٹ اور صحت مند ہیں۔ پیدل چلنے کے عادی ہیں۔ اپنا کام وقت پر اور دل جمعی سے کرتے ہیں۔ کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور نہ خواہ مخواہ کسی کا دل دکھاتے ہیں۔ اس ریسٹورنٹ میں مزیدار اور لذیذ کھانے کھا کر طبیعت سیر ہو گئی اور ساری تھکاوٹ اُتر گئی۔

آیا صوفیہ کے باہر لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ تھکے ہوئے تو بہت تھے مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق قطار میں لگ گئے۔ تین چار گائیڈ ہم غیر ملکیوں کو دیکھ کر آگے بڑھے اور بڑی شستہ انگریزی میں کہنے لگے کہ ٹکٹ کے علاوہ تھوڑے سے لیرا ہمیں دیں، جلدی اندر لے جائیں گے۔ آیا صوفیہ کی سیر بھی کروائیں گے اور اس کی تاریخی اہمیت سے بھی روشناس کروائیں گے۔ شکیل نے کہا کہ میں پاکستانی مہمانوں کا گائیڈ ہوں تو وہ پرے ہوئے ورنہ ایک کے بعد دوسرا آتا اور ساتھ جلدی اندر لے جانے کی پیشکش کرتا۔

شکیل نے کچھ دیر تو قطار میں انتظار کیا۔ پھر پاکستانی سٹائل میں محافظ کو اپنا پریس کارڈ دکھایا تو اس نے نہ صرف آگے بڑھ کر وی آئی پی قطار میں کھڑا کر دیا بلکہ ٹکٹ مشین میں ڈال کر آگے کی طرف کیا اور کہا کہ پاکستانی دوستو! مزے کرو۔ آیا صوفیہ کو خوب دیکھیں جی بھر کے دیکھیں۔

آیا صوفیہ میں اندر داخل ہوتے ہی اس کی پرشکوہ بڑی عمارت دیکھ کر مبہوت رہ گئے۔ اتنی عالیشان عمارت کئی سو سال پہلے بنی۔ یہ عیسائیوں کا سب سے بڑا گرجا تھا۔ تاریخ کے مطابق یہ عظیم عمارت کئی دفعہ تباہ ہوئی اور پھر دوبارہ بنی۔ سلطان فاتح نے جب قسطنطنیہ کو فتح کیا تو معمار سنان نے پھر اپنی کاریگری دکھائی۔ آیا صوفیہ کی عمارت کو خوبصورت مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔

مسجد میں قرآنی آیات، اللہ اور رسول ﷺ کے نام مسجد نبوی کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین کے نام کی بڑی بڑی تختیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ مسجد کا محراب بھی موجود ہے لیکن عمارت میں جہاں جہاں حضرت عیسیٰؑ یا حضرت مریمؑ کی تصاویر تھیں، ان کو ایسے ہی رہنے دیا گیا۔ کئی سو سال

تک یہاں اللہ اور رسول ﷺ کا نام بلند ہوتا رہا۔ پھر کمال اتاترک کا دور آیا تو اس مسجد کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔

آیا صوفیہ دوبارہ مسجد بنے گی:

مسجد کا محراب ابھی تک باقی ہے۔ سلطان فاتح نے مسجد بناتے وقت یہ کہا تھا بلکہ بددعا کی تھی کہ جو اس مسجد کو ختم کرے گا اس پہ اللہ کی لعنت ہوگی۔ اس بددعا سے بچنے کے لیے مسجد کے ساتھ ملحقہ امام کے کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرا مسجد کے لیے مخصوص کر دیا گیا جہاں باقاعدہ نماز ہوتی ہے۔ کہیں بھی مسجد دیکھ کر اپنا بھی دل مچل جاتا ہے۔ اگرچہ ظہر کی نماز پڑھ لی تھی۔ وضو کر کے دو رکعت نماز نفل پڑھی۔ نیک سلاطین کی ارواح کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا کی۔ فاتح سلطان کو یاد کیا اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی۔

فاتح سلطان ایک عظیم انسان تھا جس نے نہ صرف قسطنطنیہ فتح کیا بلکہ اسلامی سلطنت کو مزید وسعت دی اور کئی یادگار اور شاندار مساجد تعمیر کروائیں۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ ترکی کے صدر نے اعلان کیا ہے کہ آیا صوفیہ کو جلد ہی باقاعدہ مسجد بنا دیا جائے گا۔ پرانی مسجد کی سائڈ پر اس سلسلے میں تعمیراتی کام بھی جاری تھا۔

اللہ کرے آیا صوفیہ میں پھر سے اللہ اور رسول ﷺ کا نام بلند ہو۔ یہاں مجھے سلطان فاتح مسجد کے عالم بابا جی یاد آ گئے جو بڑے خشوع و خضوع سے آیا صوفیہ کو دوبارہ سے مسجد بنانے کے لیے اللہ سے رو رو کر باآواز بلند دعا کر رہے تھے۔

سیاحوں کا ہجوم بیکراں:

توپ کاپی کی طرح آیا صوفیہ میں بھی سیاحوں کا ہجوم بے کراں تھا بلکہ یہاں میوزیم سے دو تین گنا زیادہ سیاح موجود تھے۔ ہر عمر اور رنگ و نسل و مذہب کے لوگ اپنے اپنے انداز میں اس عظیم عمارت کو دیکھ کر خراج تحسین پیش کر رہے تھے اور اتنی بڑی عمارت اور اس کی شان و شوکت دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔ عیسائی حضرات اپنے دور کے سب سے بڑے چرچ کو دیکھ کر یسوع مسیح کو یاد کر رہے تھے جبکہ مسلمان آیا صوفیہ کی دوبارہ مسجد کی صورت میں بحالی کی تمنا لیے اس کی فضاؤں میں دوبارہ پھر سے اذان اور نماز کی آواز گونجنے اور اسے سننے کے متمنی تھے۔ آیا صوفیہ کے ایک کونے میں لوہے سے بنا ہوا ستون تمنا (Wishing Column) بنا ہوا ہے جس کے اندر انگلی ڈال کر لوگ اپنے دل کی چھپی ہوئی تمناؤں کو پورا کرنے کے متمنی تھے۔ روایات کے مطابق اس کالم میں انگلی ڈال کر گھمائیں اور دل میں جو تمنا ہو، اس کے لیے دعا کریں، وہ تمنا پوری ہو جاتی ہے۔

آیا صوفیہ کی عظیم الشان عمارت اور تاریخ:

پتھروں کی عمارت کے چاروں طرف وسیع سبزہ زار ہیں۔ ان میں بڑے بڑے رنگین خوبصورت پھول بہار دکھاتے ہیں۔ یہ عمارت باہر سے مٹیالے پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ بلند مگر کھلے محرابی گیٹ سے اندر داخل ہوں تو ایک گیلری آتی ہے۔ اس گیلری میں سامنے سیاہ رنگ کی لکڑی کا بہت بڑا دروازہ ہے جو صدیوں سے بند پڑا ہے۔ بند دروازے کے دائیں بائیں اسی جسامت کے دو اور دروازے ہیں جس سے آیا صوفیہ میں آنے والے سیاح اندر داخل ہوتے ہیں۔ ان دروازوں سے اندر داخل ہوں تو بہت بڑا گول ہال ہے جس کی گول چھت کم از کم ساٹھ فٹ اونچی ہے۔ چھت پر کمال درجے کی نقاشی اور مینا کاری کی گئی ہے۔

ہال میں ایک طرف بارہ دری ہے جس پر نہایت دیدہ زیب سنہری نقش و نگار ہیں۔ مغرب کی طرف ایک چبوترے پر سنہری محراب ہے۔ ساتھ ہی بلند منبر ہے۔ دیواروں پر مختلف رنگوں کی خوبصورت ٹائلیں لگی ہوئی ہیں جن کے رنگ اور نقش و نگار ابھی ماند نہیں پڑے۔ ہال میں چاروں طرف پیتل کی بڑی بڑی پلیٹوں پر اللہ، محمد ﷺ، خلفائے راشدین کے اسمائے مبارک لکھے ہوئے ہیں۔

اس ہال میں ۳۰ فٹ کی بلندی پر تینوں طرف گیلری ہے

جس پر پہنچنے کے لیے باہر کی گیلری میں سے ڈھلوان راستہ اوپر جاتا ہے۔ شکیل نے بتایا کہ اس ڈھلوان راستے سے رومی بادشاہ رتھ پر سوار ہو کر گیلری تک جاتا تھا۔ چار صحت مند طاقتور گھوڑے اس رتھ کو کھینچتے تھے۔ رومی بادشاہ اوپر گیلری میں اپنی بیگمات کے ساتھ بیٹھ کر اپنے راہب (پادری) کا وعظ سنتا اور مذہبی رسومات ادا کیا کرتا تھا۔

آیا صوفیہ کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے وسطی دور میں اس جگہ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پیپل عبادت کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کا نام مقدس دیوی کے نام پر آیائے صوفیہ رکھا گیا تھا لیکن ۴۰۴ء میں ان عبادت گاہوں کو آگ لگ گئی اور وہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئیں۔ پھر ۴۱۵ء میں پہلے سے بڑی عبادت گاہ تعمیر کی گئی۔ یہ عبادت گاہ ایک سو سال سے زیادہ عرصے (۵۳۲ء) تک قائم رہی۔ قسطنطین اعظم نے برسر اقتدار آ کر حکم دیا کہ آیائے صوفیہ کی جگہ ایسی عالی شان اور دیدہ زیب پختہ عمارت تعمیر کی جائے جیسی حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک کسی نے نہ بنائی ہو اور نہ ہی مستقبل میں کوئی ایسی عمارت تعمیر کر سکے۔ اس نے اپنے زمانے کے بہترین معماروں، حساب دانوں، نگرانوں اور انجینئروں کا انتخاب کیا اور ان کو تعمیری سامان فراہم کیا۔ آخر ۵۳۸ء میں سب سے بڑی عبادت گاہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ دھرتی کے سینے پر کھڑی تھی۔ اس عمارت کی تعمیر کے لیے بہت سے ستون اور بڑے بڑے پتھر قدیم کھنڈرات اور دور کے پہاڑوں سے لائے گئے۔

قسطنطین اعظم نے اس معبد کی تعمیر کو اپنی انا اور عزت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اس لیے وہ خود معماروں کی نگرانی کرتا تھا اور انہیں مفید مشورے دیتا۔ یہ عمارت چھٹی صدی عیسوی میں بازنطینی سلطنت کا سب سے بڑا شاہکار تھی اور رومن فن تعمیر میں پہلا بڑا تجربہ تھا جس کی مثال دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھی۔ جب

استنبول میں اپنے کرم فرماؤں کے ساتھ

آیا صوفیہ کی عمارت مکمل ہوگئی تو بادشاہ شاہی رتھ پر سوار ہو کر بڑے کروفر کے ساتھ آیا اور اس قدر شاندار اور وسیع عمارت دیکھ کر غرور و تکبر میں حضرت سلیمانؑ سے یوں مخاطب ہوا:

''اے سلیمانؑ! آج میں تم سے بازی لے گیا ہوں۔ تمہارا کوئی بھی ہیکل اس عمارت کی برابری نہیں کرسکتا۔''

آیا صوفیہ کو جلد معبد میں تبدیل کر دیا۔ اس وقت گنبد بنانے کے لیے دیواریں ترچھی تعمیر کی گئی تھیں جو بہت زیادہ وزنی گنبد کا وزن برداشت نہ کرسکیں۔ اس لیے چند سال بعد ہی گنبد گر گیا۔ جب گنبد دوبارہ تعمیر کیا گیا تو اس کا سائز اور وزن کم کر دیا گیا اور دیواروں کو مزید ترچھا تعمیر کرنا پڑا لیکن یہ نیا تعمیر شدہ گنبد بھی دسویں صدی عیسوی میں پھر زمین بوس ہو گیا۔ اس کی نئے سرے سے تعمیر کے بعد بھی ہر سال اس عمارت کی مرمت پر لاکھوں کی رقم خرچ ہو جاتی تھی۔ آخر تنگ آ کر بازنطینی حکومت کے آخری دور میں اسے کھنڈر کی صورت میں چھوڑ دیا گیا۔

آیا صوفیہ کا مسجد بننا:

جب سلطان محمد فاتح نے استنبول فتح کیا تو اس نے نہ صرف اس کی مرمت کروائی بلکہ اس زمانے کے مشہور معماروں اور مصوروں سے گنبد کے نیچے نقاشی اور مینا کاری سے بھی مزین کروایا۔ علاوہ ازیں ہال میں محراب اور باہر چاروں کونوں میں خوبصورت بلند و بالا مینار تعمیر کروا کے اس عمارت کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں مشہور زمانہ ماہر تعمیرات سنان نے سلطان سلیمان کے حکم سے آیائے صوفیہ کی مرمت اور آرائش میں اضافہ کیا۔ اس نے عمارت کی مضبوطی کے لیے دیواروں کے ساتھ پشتے تعمیر کیے جن کی وجہ سے یہ عظیم عمارت آج بھی قدیم شان و شوکت کے ساتھ کھڑی ہے۔

انیسویں صدی میں سلطان عبدالمجید اول نے ایک بار پھر آیا صوفیہ کی مرمت اور تزئین کروائی اور عمارت کی اصلیت کو بحال کیا۔ سلطان فاتح کے دور سے لے کر آیا صوفیہ استنبول کی جامع اولیٰ یعنی سب سے بڑی مسجد رہی۔ یہاں اللہ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت کی آوازیں صدیوں تک گونجتی رہیں۔ رشد و ہدایت کے سلسلے چلتے رہے۔ یہاں کے مدرسے سے ہزاروں علما، فارغ التحصیل ہو کر پورے یورپ میں اسلام پھیلانے کے لیے نکلتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے اس کی مرمت میں دلچسپی ظاہر کی۔ اس نے گنبد کے نیچے لوہے کا فریم لگوایا اور تقریباً ایک ہزار سات سو سال اس عمارت کو مسجد پر استعمال ہونے کے بعد ۱۹۳۴ء میں میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب پھر سے ترکی کے صدر جناب طیب اردوان اس بے مثال عمارت کو مسجد بنانے کے خواہاں ہیں۔

سیاحوں میں مغربی لباس میں ملبوس ترک عورتیں شامل تھیں اور حجاب میں ملبوس خواتین بھی۔ کچھ پاکستانی اور بھارتی سیاح بھی نظر آئے۔ دیارِ غیر میں اپنی شکل اور عادات والا ہم زبان مل جائے تو بندہ بہت خوش ہو جاتا ہے اور جھٹ سے اسے ملنے اور بات کرنے کی تمنا ہوتی ہے۔ فیصل آباد سے آئے ہوئے دو نوجوان بھی ملے جو یہاں کی پاکستان کمیونٹی کو اکٹھا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔

شام کو آیا صوفیہ سے واپسی ہوئی۔ آیا صوفیہ کے مسجد والے حصے کو باڑ لگا کر اگرچہ بند کر دیا گیا ہے لیکن سامنے منبر رسول ﷺ اور مسجد کے محراب اصلی حالت میں موجود ہیں۔ ترکی طرزِ تعمیر کی طرح دیواروں پر قرآنی آیات مبارکہ کی کندہ کاری کی گئی ہے۔ اللہ، محمد ﷺ اور چاروں خلفاء راشدین کے نام علیحدہ علیحدہ خوبصورت رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ مسجد موجود ہے مگر یہاں برسوں بیت گئے' اللہ اور رسول ﷺ کا نام بلند نہیں ہو رہا۔ قرآن پاک کی تلاوت آیا صوفیہ کے در و دیوار میں نہیں گونج رہی۔ اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر پابندی لگانے والے ختم ہو جاتے ہیں لیکن عظمتوں اور رفعتوں والے اللہ اور رسول ﷺ کے نام باقی رہتے ہیں۔ سلطانوں اور صدروں کو لوگ بھول جاتے ہیں لیکن انسانیت کی فلاح کرنے والوں کے نام باقی رہتے ہیں۔ (ختم شد)

فیس بک ایجاد کرنے والے نے تو شاید اس کو کسی اصلاحی مقصد کے لیے ہی بنایا ہوگا مگر ہماری پاکستانی عوام نے بالعموم اور دنیا کے دیگر معاشروں نے بالخصوص فیس بک کو محبت کا لنڈا بازار بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایسا بازار جہاں پر روز نت نئی محبتیں پروان چڑھتی ہیں۔ پھر ان محبتوں کو بالکل مفت میں آگے بیچ دیا جاتا ہے۔

نبیلہ خان

کسی زمانے میں اترن کو استعمال کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اترن کے ملبوسات پہننا صرف غریب غربا کا نصیب ٹھہرتا تھا۔ یہی معاملہ محبت کا بھی ہوتا تھا۔ ایک محبوب سے ہی پوری زندگی کے عہد و پیمان باندھے جاتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی کسی محبت میں رقیب روسیاہ کا کردار بھی سامنے آتا تھا مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، لیلیٰ مجنوں جیسی عظیم الشان داستانیں رقم کی گئیں مگر آج کے دور میں فیس بک نامی کتاب میں آپ کو رنگا رنگ محبتیں، رنگا رنگ لطافتیں، شرارتیں، ضیافتیں سب بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ محبوب کو بغیر دیکھے ہی عشق بلاخیز میں ہر شخص مبتلا ہے۔ رنگ و نسل، شکل و صورت کی آج کے دور میں کوئی وقعت ہی نہیں رہی۔

مزے کی بات کہ ہر شخص ہر دوسرے دن 'سچی محبت' میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بڑی شدت سے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس محبت کے بغیر تو زندگی ادھوری تھی، بے لذت، بے عنوان تھی مگر کچھ دن بعد احساس جاگتا ہے کہ نہیں، اس میں بھی کوئی کمی ہے اور اس کمی کے احساس کو مکمل کرنے کے لیے ایک بار پھر ''People You May Know'' سے کو کھنگالا جاتا ہے۔ ایک دو دن کی تلاش کے بعد پھر ''درِ نجف'' دریافت کر کے عشق بلاخیز کی آبیاری کی جاتی ہے۔ بات چیت، پسند ناپسند، موبائل فون نمبر کے تبادلے، تصویروں کے مطالبے، ویڈیو کالز کے ذریعے دیکھنے کی خواہشیں، پھر ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے کی چاہتیں، قربتوں میں سکون پانے کی باتیں اور ایک بار پھر سے سمندر کی جھاگ کی طرح بیٹھتی محبتیں۔

آج فیس بک کے زمانے میں ایک محبت سو افسانے کی باتیں تقریباً ناپید ہو چکی ہیں۔ آج کے دور میں سو محبتیں ہزار افسانے والے فارمولے کو مانا جاتا ہے۔ پہلے تو کپڑوں اور استعمال کی دیگر اشیاء کو بطور اترن استعمال میں لایا جاتا تھا۔ آج انسانی محبتوں کو بطور اترن استعمال میں لایا جانے لگا ہے۔ ہر کوئی اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق اس لنڈا بازار سے اپنی پسند کے مطابق اترنیں پسند کر کے بڑے فخر اور خوشی سے اپنی ذات کو مستفید کرنے پر خوش اور مطمئن رہتا ہے۔

محبت کے اس لنڈا بازار میں بآسانی اور نہایت کم قیمت پر آپ کو محبت مل سکتی ہے۔ کہیں تو اس کی قیمت پچاس روپے کا ایزی لوڈ ہے اور کہیں ایک وقت کی ٹی پارٹی، لنچ یا ڈنر کی صورت۔ ہماری نوجوان نسل اس لنڈا بازار سے کم قیمت میں اپنی تمام ضرورتیں بآسانی پوری کر رہی ہے۔ اس کے مضمرات کو سوچے اور سمجھے بغیر۔

سہرا

خدیجہ مستور

اولاد پہ جان چھڑکنے والی ماں کا دل افروز فسانہ، اُسے ایک عجب امتحان نے آن گھیرا تھا

کل ساجد میاں کا نکاح تھا مگر خوشی کے بجائے ان کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ اپنی دونوں بہنوں سے بار بار کہہ رہے تھے..... ''اے بڑی بجیا آپ نے اچھی طرح سُن لیا، میرا بستر ہمیشہ کی طرح اماں بی کے کمرے میں بچھا رہے گا۔ اسے کوئی نہیں ہٹائے گا اور آپ بھی سُن لیں چھوٹی بجیا۔ اب آپ میرا بستر اُٹھوانے کی بات نہیں کریں گی، کیا سمجھیں آپ؟''

''تو کیا تم اب بھی دودھ کی بوتل نہیں بھولے؟'' چھوٹی بجیا کی کترنی جیسی زبان چلتی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگتیں اور ساجد میاں دانت پیس کر رہ جاتے۔ گھر میں ایسی دھما چوکڑی مچی تھی کہ کوئی کسی کی بات نہ سمجھ رہا تھا نہ سُن رہا تھا۔ رشتے ناتے کی بھاوجوں اور خاندان کی ڈھیروں لڑکیوں کا جمگھٹ ڈھول پیٹ پیٹ کر گائے چلے جا رہا تھا۔ ''پڑھ کے الحمد جو چہرے پہ سجایا سہرا.....''

اپنا سہرا سُن کر بھی ساجد میاں کی آنکھوں کی وحشت کم نہ ہوئی۔ ایسا لگتا کہ سہرا گلاب کے پھولوں کے بجائے کانٹوں سے گوندھا گیا ہے اور وہ کانٹے ان کی آنکھوں میں چُبھ رہے ہیں۔ موٹی موٹی بادامی پتلیوں والی بے چین آنکھیں گھوم پھر کر اپنی اماں بی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ تھکی ہوئی، نڈھال، لُٹا لُٹا سا چہرہ، پیروں پر لحاف ڈالے اپنے بستر پر بیٹھی تھیں مگر جب لڑکیاں لہک کر گاتیں۔ ''ڈور کر سہرے کی اماں نے بلائیں لے لیں'' ارے اماں نے بلائیں لے لیں..... تو ان کے بچے کھچے ہلتے ہوئے دانت سہرے کی لڑی کی طرح ہونٹوں پر بکھر جاتے۔

''میں کتنی بار کہوں کہ اب آپ تھک گئی ہیں، ذرا دیر کو سو جایئے۔ میں بھی لیٹ جاتا ہوں۔'' ساجد میاں اپنے بستر پر بیٹھ کر جوتوں کی ڈوریاں کھولنے لگے۔

''لو بھلا، میں کیسے سو جاؤں، ابھی تو بہت سے کام پڑے ہیں۔ چھوہاروں کے تھال پوشوں پر گوٹا ٹانکنا ہے۔ سہرے اور پھولوں کے زیور کا آرڈر دلوانا ہے۔ سہرا گھٹنوں سے نیچا نہ ہو، لڑکیاں تو بس گانے بجانے میں جُتی ہوئی ہیں۔''

اب بھلا اماں بی سے کون کہتا کہ جس طرح تمام کام ان کی دونوں بیٹیوں نے اپنی مرضی سے کر لیے تھے اسی طرح رات کو تھال پوشوں پر سنہری گوٹے کے بجائے روپہلی گوٹا ٹانک دیا تھا۔ سہرے کا آرڈر بھی دیا جا چکا تھا، ایسا سہرا جو قدموں کو چھوئے۔ اماں بی کی اس بات کو کون مانتا تھا کہ پھول پیروں تلے آئیں تو پھولوں کی بے حُرمتی ہوتی ہے۔

''سب کام ہو جائیں گے اماں بی۔ آپ پہلے ہی حکم دے چکی ہیں۔ دن کے دو بج رہے ہیں۔ اب آپ ذرا دیر

آرام کیجیے، اے بڑی بجیا۔'' انہوں نے زور سے آواز دی۔

''اے بڑی بجیا۔ کوئی نہیں سُنتا۔ اے چھوٹی بجیا۔ اللہ کے واسطے تھوڑی کے لیے ڈھول اُٹھا دیجیے۔ اماں بی کو سو جانے دیجیے۔''

''کوئی نہیں سوئے گا، ڈھول نہیں اٹھواؤں گی۔'' چھوٹی بجیا نے چیخ کر جواب دیا۔ اب ساری آوازوں میں ان کی آواز سب سے اونچی تھی..... ''دوڑ کر اماں نے سہرے کی بلائیں لے لیں۔ ارے بہنوں نے بلائیں لے لیں۔ پڑھ کے الحمد جو چہرے پہ سجایا سہرا.....''

''مت رو کو بیٹے..... گانے دو۔ یہ میری آخری خوشی ہے نیند کا کیا ہے جب فرصت ملے گی سو جاؤں گی۔'' اماں بی نے بڑی محبت سے ساجد کو دیکھا اور پھر بستر پر لیٹ کر پاؤں پھیلا دیے۔ ساجد میاں جھپٹ کر اُٹھے اور کمرے کے سب دروازے بند کر دیے۔ اب آوازیں جیسے کہیں دُور سے آ رہی تھیں۔

''بس اب آپ سو جائیں۔'' ساجد نے اماں بی کی طرف سے کروٹ لے لی۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اماں بی اگر دوپہر کو نہ سوئیں تو ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ڈسپنسری سے ایک ڈیڑھ بجے ضرور گھر آ جاتے۔ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ جب تک وہ خود بھی اپنے بستر پر نہیں لیٹیں گے اماں بی کو نیند نہیں آئے گی۔

''جنریشن گیپ'' کے اس شدت پسند زمانے میں بہت سے لوگ ساجد میاں کو حیرت سے دیکھتے۔ شاید انہیں مہذب ملکوں کے وہ بوڑھے یاد آ جاتے جو چھتری سفید بالوں والے سروں پر پرانی وضع کے ہیٹ رکھے راہوں میں پڑی ہوئی بنچوں پر پہروں بیٹھے رہتے ہیں۔ ترستی ہوئی نگاہوں سے دُنیا کی ہما ہمی کو دیکھتے ہیں۔ پھر جانے ان کے جی میں کیا خیال آتا ہے کہ ہیٹ آنکھوں پر کھینچ کر اونگھنے لگتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ تم اتنی دیر سے یہاں کیوں بیٹھے ہو اور اب تم اپنے بیٹوں کی دُنیا میں چھپ کر کیا خواب دیکھ رہے ہو۔

''ساجد''..... اماں نے ہولے سے پکارا

''جی اماں بی''۔ ساجد میاں نے اماں بی کی طرف کروٹ بدل لی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ اب تمہارا پلنگ یہاں سے اُٹھوا کر اسٹور میں رکھوا دوں؟ اب اس کی یہاں کیا ضرورت ہے۔'' اماں بی اپنی بھرّائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''چھوٹی بجیا نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔ بڑی بجیا نے بھی یہی فرمایا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ یہ پلنگ یہیں بچھا رہے گا۔ آپ بھی سُن لیں، اس پلنگ کو یہاں سے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔'' ان کی آواز میں بے حد دُکھ تھا۔

''ارے پگلے یہ بستر تو تیری ذات سے سجا ہوا تھا، تیری وجہ سے میں اکیلی نہیں تھی۔ رات ہوتے سوتے کسی وقت آنکھ کھُل جاتی تو.....'' اُن کی آواز بھرّا گئی۔

''یہ بستر اسی طرح سجا رہے گا اماں، میں کہاں جا رہا ہوں بھلا؟ آپ ایسی باتیں مت سوچیے''۔ ساجد میاں نے اماں بی کی طرف سے کروٹ بدل لی۔ گردن تک لحاف اوڑھا اور پھر تکیے کے نیچے رکھے ہوئے ململ کے سفید جھاگ جیسے دوپٹے کو چہرے پر ڈال لیا۔ یہ ان کے سونے کا اعلان تھا۔

☆☆☆☆☆

ساجد جب چھوٹے سے تھے تو برسات کے موسم میں مکھیوں کے گچھے ان کے منہ پر آ آ کر بیٹھتے، اماں بی پریشان ہو کر اپنے سر سے ململ کا دوپٹہ اتار کر ان کا چہرہ ڈھانک دیا کرتیں۔ مگر اتنا زمانہ گزرنے کے بعد ان کی یہ عادت نہ چھوٹی۔ اماں کا دوپٹہ آنکھوں پر ڈالے بغیر انہیں نیند نہ آتی۔

منہ چھپا کر وہ تو اپنے حساب سے سوتے بن گئے مگر انہیں کیا پتا تھا کہ اماں بی مارے حیرت کے آنکھیں پھاڑے انہیں کس طرح دیکھ رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کمرے کی ہر چیز گھوم رہی تھی۔ دل پر عجیب سا ہول طاری تھا۔ انہوں نے

اُٹھ کر ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا تو دروازے تک پہنچنے کا راستہ نہ ملا۔ جیسے بھول بھلیاں میں پھنس گئی ہوں۔ اتنی بڑی بات سُننے کے لیے بھی تو ہمّت چاہیے۔ وہ ہڑبڑا کر ساجد میاں کے پلنگ سے ٹکرائیں۔

''کیا ہے اماں بی؟'' وہ جیسے کُود کر کھڑے ہو گئے اور ڈولتی ہوئی اماں بی کو اپنے بازوؤں میں تھام کر بستر پر بٹھا دیا۔

''یہ آپ کدھر جا رہی تھیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ سو جائیے۔''

''نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا لڑکیوں کے پاس جا بیٹھوں مگر بیٹے! تم تو میرا سایہ بن گئے ہو۔''

''بس اب آپ نہیں اٹھیں گی۔'' ساجد میاں نے اماں کو لِٹا کر لحاف اوڑھا دیا۔ انہوں نے بھی ساجد کو دکھانے کے لیے جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیں مگر نیند خاک آتی۔ وہ ایک سوال سوچے جا رہی تھیں۔ لو بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا بستر پہلے کی طرح کیسے سجا رہ سکتا ہے؟ اتنی بڑی بات اس نے کہی کیسے؟ اگر کسی کو یہ بات معلوم ہو جائے تو پھر..... سب گھنے گھنے طعنے دیں گے۔ اماں سے اتنی ہی محبت ہے تو پھر شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

طعنوں کے خیال ہی سے اماں بی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اتنی سردی میں پسینے چھوٹ گئے۔ اماں بی تکیے میں منہ چھپا کر چپکے چپکے رونے لگیں..... ''میرے بچے، میرے لعل، ماں صدقے، ماں تیری محبت پر سے واری۔'' ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔

چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اماں بی کے شوہر عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اماں بی نے محلے کی لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھا پڑھا کر بچوں کو پالا۔ دونوں لڑکوں کو پڑھایا..... اور لڑکیوں کا جہیز جوڑا۔ جیسے تیسے لڑکیوں کی شریف گھرانوں میں شادیاں کیں۔ اماں بی جیسی نیک اور سمجھدار بی بی کے سارے خاندان میں دھوم مچی تھی۔ ماں اگر مصیبتوں سے ذرا بھی گھبرا جائے تو یتیم بچے بہک جاتے مگر اماں بی نے تو بچوں کو کبھی یتیمی کا احساس ہونے ہی نہ دیا۔

دونوں لڑکوں کی تعلیم پر اتنی توجہ دی کہ وہ کتاب کا کیڑا بن گئے۔ ماجد میاں بڑے تھے۔ چھٹی جماعت سے وظیفہ لینا شروع کیا تو ساجد میاں بھی مقابلے پر اُتر آئے۔ ماجد میاں نے ایف ایس سی نان میڈیکل کا امتحان دیا تو پھر وظیفے کے مستحق قرار پائے۔ ساجد نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن پائی۔ خاندان والے مبارک سلامت کا شور مچاتے اور جی ہی جی میں کڑھتے بھی۔ وہ اپنے منٹڈے بیٹوں کو گلے گلے تک نعمتیں ٹھنساتے مگر کوئی بھی امتحان میں سیکنڈ ڈویژن سے آگے نہ جاتا۔ یہاں یہ حال کہ دال روٹی اور کبھی کبھار گائے کا گوشت کھانے والے ہوا پر اُڑے جا رہے تھے۔

ماجد انجینئرنگ کالج میں تیسرے سال کا امتحان دے رہے تھے کہ ساجد نے ایف ایس سی میڈیکل میں ٹاپ کیا اور آرام سے میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔ اس دن اماں بی نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں سارا دن عبادت میں گزارا۔

وقت جب اُمیدوں اور آرزوؤں سے بھرپور ہو تو گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ماجد نے انجینئرنگ کالج سے آخری سال کا امتحان دیا اور اوّل آ کر سب کو حیران کر دیا۔ انہیں انگلینڈ جانے کے لیے سرکاری وظیفہ بھی مل گیا۔ سارا خاندان اماں بی کی اس خوش نصیبی پر ٹوٹ پڑا۔ جو کبھی دو پیسوں کی مدد کے روادار نہ تھے، مٹھائیوں کے ڈبے اُٹھائے چلے آ رہے تھے، مگر اماں بی کی عجیب حالت تھی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ''میں نہیں جانے دوں گی۔ بیٹیاں پرائی ہو گئیں۔ یہی دونوں لڑکے میری زندگی کا سہارا ہیں۔ میرے بڑھاپے کی لکڑی ہیں۔ میں کسے تھام کر چلوں گی۔''

سب حیران تھے کہ گھر آئی دولت کو کوئی اس طرح بھی ٹھکراتا ہے۔ سب کو ان کی دانائی پر شبہ ہونے لگا۔ سب انہیں خود غرض سمجھنے لگے۔ بیٹیوں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ آپ

ماجد بھائی کے روشن مستقبل کو لات مار رہی ہیں۔ ماجد اماں بی کو لپٹائے بڑی مظلومیت سے بیٹھے تھے۔ وہ اماں بی کے انکار پر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اماں نے روتے روتے ایک بار غور سے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور آنسو پونچھ لیے۔

''جائے گا، میرا بیٹا ضرور جائے گا۔'' انہوں نے سب کے سامنے بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کیا۔ ''میں تو یوں ہی رو رہی تھی، بس یوں ہی۔''

ماجد میاں جب جانے لگے تو سب نے محسوس کیا کہ ماجد اپنے بھائی کو رخصت کرنے ہوائی اڈے پر بھی نہیں گئے۔ وہ گھر بیٹھے اماں بی کو لپٹائے ان کے آنسو پونچھتے رہے۔ اس کے بعد تو وہ جیسے اماں بی کا سایہ بن گئے۔ اپنا بستر اماں کے بستر کے قریب بچھا لیا۔ کالج اور پھر گھر۔ رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ اماں بی کے خراٹے انہیں ذرا بھی پریشان نہ کرتے۔ کبھی کبھی سوتے میں وہ روتیں۔ ماجد کو آوازیں دیتیں تب وہ کتابیں چھوڑ کر اٹھتے۔ اماں بی کے سینے پر سر رکھ کر انہیں جگاتے۔ ان کے آنسو پونچھتے اور اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے انہیں نیند کی گولی کھلا دیتے۔

کبھی کبھی اماں بی پوچھتیں ''جب تم یہاں کی پڑھائی ختم کر لو گے تو کیا پتا تم کو بھی سرکار وظیفہ دے دے۔ تم پڑھائی میں ہمیشہ اچھے رہے ہو۔ تم نے ہمیشہ وظیفہ لیا ہے۔''

ساجد میاں ہنس پڑتے۔ کہتے ''اماں بی میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں ایسے وظیفوں پر تھوکتا بھی نہیں۔''

پھر بھی شک کی سِل اماں بی کے سینے کو کچلتی رہتی۔ بہنوں نے ساجد کو جب اس طرح اماں کی پٹی سے لگا دیکھا تو سلگ اٹھیں۔ ''کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ مہینوں ساجد بھائی کی صورت نہیں دکھائی دیتی۔ اماں بی آپ نے انہیں لونڈیا بنا کر گھر بٹھا لیا ہے۔ اللہ حافظ ہے جو امتحانوں میں بھی پاس ہوں.....''

اماں بی ساری باتیں خاموشی سے سہہ جاتیں اور اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیتیں۔ بیٹیوں کو یہ بھی نہ دکھائی دیتا کہ ان کی اماں کتنی لٹ گئی ہیں۔ ماجد کی جُدائی نے انہیں ایک دم سے بوڑھا کر دیا ہے۔ جب ماجد کے خط آتے تو پہروں انہیں آنکھوں سے لگائے بیٹھی رہتیں۔

دو سال بعد ماجد وطن واپس آئے تو تحفوں سے لدے پھندے تھے۔ دونوں بہنیں بھائی سے مرعوب ہو کر جیسے بچھی جا رہی تھیں۔ اِترا اِترا کر خاندان والوں کو تحائف دکھا رہی تھیں اور اماں بی کو ماجد اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ جی چاہتا اٹھا کر پلکوں پر بٹھا لیں۔

اعلیٰ تعلیم کے بعد ماجد کو ملازمت تو مِل گئی مگر وہ میاں بجھ سے گئے۔ آٹھ نو سو روپے ان کے بھاویں تلے نہ آتے پھر بھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔ سارا دن جانے کن چکروں میں پھرا کرتے اور شام کو گھر آتے تو اماں بی کی گود میں سر رکھ کر اپنے شاندار مستقبل کی باتیں کرتے رہتے۔ اماں بی ان باتوں کو سُن کر نہال ہوتی رہتیں۔ وہ بڑے چاؤ سے ساجد کو بھی ان باتوں میں شامل کرنا چاہتیں مگر وہ سر جھکائے پڑھنے میں مصروف رہتے۔

ماجد کبھی کبھی ساجد پر اعتراض کرتے۔ ''یار یہ تم سر جھکائے بس پڑھتے ہی رہتے ہو۔ کسی وقت باہر بھی نکلا کرو۔ دُنیا کو دیکھو اور سمجھو۔''

''باہر گھومے تو پڑھے خاک۔ پتا ہے کتنی مشکل پڑھائی ہے۔ ڈاکٹر بننا کوئی آسان کام تو نہیں۔ تم کو کیا معلوم، تمہاری جدائی نے مجھے کتنا کمزور کر دیا ہے۔ جب میرا بیٹا ڈاکٹر بن جائے گا تو پھر میرا علاج کرے گا۔'' اماں بی چاؤ سے کہتیں۔

ایک سال ملازمت کرنے کے بعد ماجد نے بڑے آرام سے اماں کو بتایا کہ وہ واپس انگلینڈ جا رہے ہیں۔ یہاں ان کے علم کا جو معاوضہ ملتا ہے، وہ اس سے کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو سکتے۔ چند لمحوں تک اماں بی پر سکتے کی سی کیفیت طاری رہی مگر جب ماجد نے ان کی گود میں سر رکھ کر ان کی

اجازت چاہی تو وہ بڑی مشکل سے ہاتھ اُٹھا کر ان کے سر پر رکھ سکیں۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے جسم و جاں کا ایک ایک چیپ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا ہے۔

ماجد نے بڑے لاڈ سے اماں بی کے گلے میں جھول جھول کر انہیں سمجھایا۔ ''اماں بی صرف چند برسوں کی بات ہے۔ وہاں سے میں آپ کو اتنا کچھ کما کر بھیجوں گا کہ آپ ماضی کے سارے دُکھ بھول جائیں گی۔ یہ تین کمروں کا پُرانا مکان کوٹھی میں بدل جائے گا۔ بس آپ ایک اچھی سی بہو ڈھونڈ رکھیے گا اور.....'' وہ اور جانے کیا کچھ کہتے رہے مگر اماں بی نے کچھ بھی نہ سُنا۔ ان کے کانوں میں جیسے کہیں بہت دور سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر چند دن بعد ماجد چلے گئے۔ دونوں بہنوں اور بہنوئیوں نے ڈھیر ساری فرمائشوں اور خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ اس وقت کسی نے بھی پلٹ کر یہ نہ دیکھا کہ اماں بی آنگن کی پرانی کائی لگی دیوار سے ٹیک لگائے کیوں چُپ چاپ کھڑی تھیں۔ کسی کو یہ نظر نہ آیا کہ وہ اس دُکھیا کی طرح سر سے پاؤں تک جل رہی ہیں جو نہ تو کوئلہ ہوئی نہ راکھ۔

جب ساجد، بھائی کو رخصت کر کے لوٹے تو انہوں نے اماں بی کو لپٹا لیا۔ بولے ''اماں بی، میں جو ہوں آپ کے پاس۔''

محبت کے ٹھنڈے چھینٹوں نے ان میں اتنی جان ڈال دی کہ وہ آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں اور ساجد کا سر اپنے سینے سے لگا کر ماجد کو دعائیں دینے لگیں۔ ''اللہ کرے میرا بیٹا وہاں خوش رہے۔ اس کا مستقبل چاند اور تاروں کی طرح روشن رہے اور تم میرے بیٹے مجھ سے کبھی جُدا نہ ہونا۔''

پندرہ بیس دن بعد ماجد کا خط آیا تو اماں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''ارے کتنا بے وقوف ہے، مجھے یاد کر کے روتا ہے۔ کوئی ہمیشہ تو وہاں نہیں رہے گا۔ ایک دو سال بعد آ جائے گا۔''

سارا دن خط کو چومتی اور بار بار پڑھتی رہیں۔ ایک سال کے اندر اندر ماجد نے اماں بی کو اتنا کچھ بھیجا کہ انہوں نے پانچ کمروں کی چھوٹی سی کوٹھی بنوالی۔ پھر کمروں کی تقسیم بھی کر دی۔ سب سے بڑا کمرا ماجد کا۔ اس سے چھوٹا ساجد کا، اس سے چھوٹا ان کا اپنا۔ کوٹھی بنانے کے بعد وہ چپکے سے ماجد کی دُلہن کی بَری کا سامان خریدنے لگیں۔ اب ان کی خواہش تھی کہ ماجد جلد واپس آ جائے۔ وہ ہر ایک سے کہتی رہتیں۔ ''مامتا کوٹھیوں میں رہے یا محلوں میں، بچّے جُدا ہوں تو سب کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔''

سارا خاندان ان کی یہ باتیں سُن کر بڑا بڑاتا ''توبہ کیسی ناشکری ماں ہے۔ ماجد یہاں رہتا تو کون سے سونے کے انڈے دیتا۔ کیا رکھا ہے یہاں۔''

کبھی کبھی ساجد جواب دے بیٹھتے۔ ''کیا نہیں ہے یہاں! درختوں کو پالو پوسو اور جب وہ پھل دیں تو دوسرے ملکوں میں کھانے کو بھیج دو۔ واہ کیا بات ہے۔''

بہنوں نے یہ باتیں سُنیں تو نچے جھاڑ کر ساجد کے پیچھے پڑ گئیں۔ اَب دیکھیں گے تم ڈاکٹر بن کر کیا کرو گے۔ آج کل ایم بی بی ایس کو کون پوچھتا ہے۔ کسی سڑی سی گلی میں ڈسپنسری کھولو گے اور سارا دن بیٹھے مکھیاں مارا کرو گے۔ پیسے والے تو بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں۔''

''اچھی بات ہے، اس گلی کی مکھیاں تو مر جائیں گی۔'' ساجد ہنستے تو بات ٹل جاتی۔

ایک سال تک ماجد کا خط نہ آیا۔ اماں بی کی آنکھوں میں انتظار کی آندھیاں آتیں مگر کوئی خط اُڑ کر نہ آتا۔ وہ ساجد سے کچھ نہ کہتیں۔ وہ اسے پریشان نہ کرنا چاہتی تھیں۔ آخری امتحان میں ایک دو مہینے رہ گئے تھے۔

آخر آندھی تھمی۔ ماجد کا خط آ گیا۔ لکھا تھا کہ اُس نے وہاں شادی کر کے وہیں کی شہریت اختیار کر لی ہے۔ شادی کے وقت اسے اماں بی بہت یاد آئیں۔ وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر ایلس نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر تسلّی دی تو قرار آ گیا۔

آخر میں لکھا تھا کہ آپ کی بہو آپ سے ملنے کو بے چین ہے۔

اماں بی خط پڑھنے کے بعد دیر تک اکیلی بیٹھی کانپ کانپ کر روتی رہیں۔ انہیں ایلس کی ذات سے نفرت ہو گئی۔ شام کو دونوں بیٹیاں اماں بی کے پاس آئیں۔ وہ رنجیدہ تھیں۔ دونوں ایلس کو بُرا بھلا کہہ رہی تھیں۔ اماں بی نے پہلی بار بیٹیوں پر طنز کیا:

''اُس کا مستقبل بن گیا۔ اب تم لوگ خوش ہو، تمہاری خواہشیں پوری ہو گئیں۔''

بڑی بیٹی تو اس وقت چپ ہو گئی مگر چھوٹی بیٹی کس طرح چُپ رہتی۔ ''کوئی ہم نے سکھا کر بھیجا تھا کہ وہاں پھیکے شلجم سے شادی کر لینا، وہیں کے ہو رہنا۔ آخر دُنیا علم سیکھنے جاتی ہے۔ لوگ اسی طرح ترقی کرتے ہیں۔ آپ کو تو بس الزام رکھنا آتا ہے۔''

اس دن پہلی بار ساجد نے اپنی چھوٹی بجیا کو ڈانٹا۔ ''کسی وقت تو آپ اپنی زبان کو قابو میں بھی رکھا کریں۔''

''کیوں قابو میں رکھوں؟ ماجد یہاں ہوتے تو شادی نہ کرتے۔ کون سا اماں کے پہلو سے لگے بیٹھے رہتے۔ اب تم نہ کرنا شادی، ہاں۔''

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اماں بی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ''جب ساجد شادی کرے گا تو.....تو.....؟''

رات کو جب اماں بی کی بیٹیاں اپنے گھر چلی گئیں تو اماں بی چپکے سے بکس روم میں گئیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑے بکس کا تالا کھولا اور ماجد کی دُلہن کے لیے جو بَری بنائی تھی اسے کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر بکس بند کر کے جب وہ تالا لگانے لگیں تو جیسے سارے جسم کی طاقت ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ''اب یہ تالا کبھی نہیں کھُلے گا۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑائیں اور پھر بڑے سکون سے آ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئیں۔

جس روز ساجد نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے آخری سال کا امتحان دیا تو اماں بی سارا دن اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں کرتی رہیں کہ ان کا بیٹا اچھے نمبروں سے پاس نہ ہو۔ اسے اب کوئی وظیفہ نہ ملے مگر چند ماہ بعد نتیجہ نکلا تو ان کی دُعاؤں کے برعکس تھا۔ سارا خاندان مبارکبادوں سے جھولیاں بھرے سارے گھر میں دندناتا پھر رہا تھا۔

''میں تو کہتی ہوں اماں بی! ساجد کو سرجری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ماجد کے پاس بھیج دیجیے۔ اب تو وہاں اپنا گھر بھی ہے۔ ایلس ایسی بُری بھی نہیں اگر بُری ہوتی تو ماجد بہنوں کو کس طرح پوچھ سکتا تھا۔ ابھی اس نے بچوں کو روپے اور کپڑے بھجوائے تھے۔'' بڑی بیٹی نے نظریں جھکائے جھکائے اماں بی کو مشورہ دیا۔ اس وقت کلرک شوہروں کی بیویوں والی ازلی مظلومیت ان کے چہرے پر برس رہی تھی۔ اگر ساجد بھی چلا جاتا تو دونوں بہنوں کے حق میں بہت اچھا ہوتا اور پھر انہیں یہ بھی پتا تھا کہ ماجد کے مقابلے میں ساجد بہنوں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

''اماں بی اگر مائیں اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر نہ کریں گی تو پھر کون کرے گا؟'' چھوٹی بیٹی نے ماں کو گم سم دیکھ کر بڑی بہن کا ساتھ دیا۔

اماں بی سامنے بیٹھے ہوئے ساجد کی آنکھوں میں عجیب طرح سے جھانک رہی تھیں۔

''چھوٹی بجیا، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں یہیں کسی گلی میں ڈسپنسری کھولوں گا۔ میں یہاں رہ کر آپ بہنوں کی زیادہ خدمت کروں گا۔'' ساجد نے اس طرح کہا کہ اس کے لہجے کا طنز نمایاں تھا۔

دونوں بہنیں اس طرح بپھر گئیں جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''مت جاؤ ہمیں کیا، جب تمہاری ڈسپنسری پر مکھیاں بھنکیں گی، تو پھر پوچھوں گی۔'' بڑی بجیا کھسیانی ہو رہی تھیں۔

''تم آگے بڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ تیئس چوبیس سال کے پورے آدمی ہو اور ننھے بچوں کی طرح اماں کی

ڈٹی سے ڈٹی جوڑ کر سوتے ہو۔ بات اس طرح کرتے ہو جیسے اپنی بہنوں کے اَن داتا ہو۔ ارے بھیا تم ترقی کرو گے تو ہم خوش ہوں گے اور بس۔" چھوٹی بجیا کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو رہا تھا۔

ساجد کے کچھ کہنے سُننے سے پہلے ہی دونوں بہنیں ناراض ہو کر چلی گئیں۔ اماں بی خاموش بیٹھی سب کا مُنہ تکتی رہ گئیں، ویسے بھی اب ان میں اتنی طاقت کہاں رہ گئی تھی کہ جلدی سے اُٹھ کر روٹھی ہوئی بیٹیوں کو منا لیتیں۔ ماجد کی جُدائی ڈائن بن کر انہیں چاٹ گئی تھی، اس پر یہ فکر کہ اگر ساجد کی ڈسپنسری نہ چلی تو.....؟

ساجد میاں کی ڈسپنسری اور ان کے ہاتھ کی شفا ایسی مشہور ہوئی کہ جو عزیز دار چھوٹے ڈاکٹروں کے پاس بھی نہ جاتے، وہ بھی مفت علاج کروانے دوڑ پڑے۔ اماں بی کے سینے پر دھری ہوئی شک کی سِل بھی آخر کو سرک گئی۔ پھر بھی رات کو سوتے سوتے ایک بار ہاتھ بڑھا کر ساجد کے سر کو چھو تیں اور پھر اس احساس کے ساتھ سو جاتیں کہ وہ ان کے پاس ہے۔

خواب آور دوائیں کھانے کے باوجود کبھی کبھی انہیں رات دیر سے نیند آتی۔ وہ سوچتیں کہ اب ساجد کی شادی کر دیں، مگر اس خیال ہی سے وہ اُلجھ کر رہ جاتیں کہ تنہائی اور بڑھاپا ان سے کیا سلوک کرے گا۔ ساجد بھی ماجد کی طرح بدل تو نہیں جائے گا۔ خاندان والے طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ بیٹیاں ان کے مُنہ پر کہہ گئی تھیں کہ اماں بی ساجد کی شادی نہیں کریں گی۔ اسے کو لہجے سے لگائے لگائے بوڑھا کر دیں گی۔ انہوں نے بڑی صفائی سے کہا تھا کہ جب ساجد اپنے ہم عمروں کو چار چار بچوں کا باپ دیکھتا ہوگا تو کیا سوچتا ہوگا۔ یہ سب کچھ سُننے کے بعد بھی وہ جیسے بہری بن جاتیں۔

بہت مدّتوں کے بعد ماجد اور ایلس کا خط آیا۔ ایلس کا خط پا کر انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے بڑی صاف اُردو میں پہلی بار اپنی ساس کو خط لکھا تھا۔ ماجد کے خط میں خاص بات یہی ایک تھی کہ وہ اپنی اماں بی کو بہت یاد کرتا ہے۔ وہ بہت مصروف تھا، اس لیے خط نہ لکھ سکا..... اور ایلس نے لکھا تھا:

"اماں بی..... کل جب ماجد کو کاموں سے فرصت ملی تو وہ آپ کو یاد کر کے بہت رویا۔ وہ ضد کر رہا تھا کہ فوراً اپنی اماں بی سے ملنے جائے گا۔ وہ اس وقت یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ بہت جلد پھر باپ بننے والا ہے۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ وہ لوگ جن کا حال ان کی دسترس سے باہر ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصّہ نہیں اور وہ لوگ جن کا مستقبل انتظار کر رہا ہے، آخر انہیں ایک دوسرے کی جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اور....."

اماں بی نے خط لفافے میں بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ سارا خط پڑھنے کی ہمّت جواب دے گئی تھی۔ وہ دیر تک تکیے میں منہ چھپا کر روتی رہیں۔ چہرے کی جھریوں کی تہوں میں لکھی ہوئی مستقبل کو جنم دینے والی ماضی کی داستان آنسوؤں سے دُھلتی رہی۔

رات جب ساجد اماں بی کے ململ جیسے سفید دوپٹے کو آنکھوں پر لپیٹے سونے کی کوشش کر رہے تھے تو اماں بی نے ان کو آہستہ سے پکارا۔ "ساجد بیٹے؟"

"ارے آپ ابھی تک سوئی نہیں اماں بی؟"

"بیٹے..... میں سوچ رہی تھی کہ اب تمہاری شادی کر دوں۔"

"شادی؟" ساجد میاں حیرت کدہ بن گئے۔ وہ بیٹھ کر اماں بی کا مُنہ تکنے لگے۔ وہ تو شادی کا خیال ہی دل سے نکال چکے تھے۔ شادی کے خوب صورت تصوّر میں انہوں نے کتنی راتیں گزاری تھیں۔ کتنے خوابوں میں ایک سے ایک خوب صورت دُلہن نتھ اور ٹیکا چمکاتی، ان کے سینے کو روندتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔

"تم حیران کیوں ہو رہے ہو بیٹے؟" اماں بی تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

"اماں، میں شادی نہیں کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کی محبت میں کوئی اور حصّے دار بنے۔" انہوں نے بہت صاف

آواز میں جواب دیا۔

"بیٹے، وہ لوگ جن کا حال ان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصّہ نہ ہو، ان کے مقابلے میں وہ لوگ جن کا مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہو، انہیں آخر ایک دن ایک دوسرے سے جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میرا کیا آج ہوں، کل نہیں ہوں۔"

"اماں بی..... یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" ساجد میاں کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔

"سو جا پگلے، مجھے اب نیند آ رہی ہے۔" لیٹ کر اماں بی نے لحاف سر تک کھینچ لیا اور پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ لیمپ کا سوئچ آف کرنے کے بعد ساجد کب تک اسی طرح بیٹھے رہے۔

چھوٹی بجیا بند دروازوں کو پیٹ رہی تھیں۔ ساجد نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

لڑکیاں زور زور سے گا رہی تھیں:

"بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی۔"

"بھئی حد ہے۔ شام ہونے والی ہے اور ماں بیٹے مزے سے سو رہے ہیں۔ ابھی تو دُلہن کا کمرا سجانا ہے۔ اماں بی، ماجد کا کمرا سجا دوں۔ سب سے بڑا اور شاندار ہے۔" چھوٹی بجیا کمرا سجانے کے خیال سے ہی سُرخ پڑی ہوئی تھیں۔

"نہیں بیٹی، ساجد والا کمرا ہی سجاؤ۔ ماجد جب بھی تم لوگوں سے ملنے آیا تو اپنے کمرے میں ٹھہرے گا۔"

"ان کا کیا پتا اماں بی۔ اگر بھابی کے ساتھ آئے تو آٹھ دس دن کو آئیں گے۔ اکیلے آئے تو آپ کے کمرے میں رہیں گے۔" چھوٹی بجیا رنجیدہ ہو گئیں۔ اللہ قسم وہ کمرا سب سے زیادہ شاندار ہے۔ ایسا سجے گا ایسا.....

"ٹھیک ہے مگر اس کا کمرا مت سجانا۔ وہ ماجد کا کمرا ہے۔ کسی کی چیز نہیں چھیننے بیٹی۔ گناہ ہوتا ہے۔" اماں بی کی آواز بھرّا گئی۔

"کیا فضول باتیں ہیں چھوٹی بجیا۔ جو کچھ اماں بی کہیں وہی کیجیے۔ اماں بی آپ خیال نہ کیا کیجیے چھوٹی بجیا تو ہمیشہ کی ضدی ہیں۔"

"لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا
آجا سامنے، بہہ جا سامنے، کولوں تے روس کے نہ لنگھ ماہیا"۔

☆☆☆☆☆

جب اماں بی دُلہن کو رخصت کروا کے لائیں تو وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھیں، مگر آرسی مصحف اور مُنہ دکھائی کی رسم کے بعد جب دلہن کو اُس کے کمرے میں لے گئے تو ان کے دل پر ایک دَم سناٹے نے جیسے یلغار کر دی۔ اب ساجد بھی چلا جائے گا۔ آج انہوں نے اُسے بھی کھو دیا۔ کوئی جذبہ ان کا دل نوچ لے رہا تھا۔ ادھر سارے دن کی تھکن انہیں آنکھیں نہ کھولنے دے رہی تھی۔

ساجد کی نظریں مسلسل اماں بی کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ اپنے بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور جب رشتے کی بھاوجیں انہیں لینے آئیں تو وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ "میں ابھی نہیں جاؤں گا۔ اماں بی بہت تھک گئی ہیں۔" جب بھاوجیں حیرانی سے رخصت ہوئیں تو انہوں نے اماں بی کو سہارا دے کر آرام سے لٹا دیا۔ پھر الماری سے نیند کی دوا نکال کر دو گولیاں کھلائیں۔ پھر ان کے پائنتی بیٹھ کر سُوجے ہوئے پیر آہستہ آہستہ مَلنے لگے۔

"بڑی بجیا، آج یہاں اماں بی کے پاس میرے بستر پر آپ لیٹ جاتیں۔" انہوں نے بڑی اُمید سے بڑی بجیا کو دیکھا۔

"میں یہاں آرام سے چپر کھٹ پر لیٹ جاؤں تو میری سہیلیاں بُرا نہیں مانیں گی۔ وہ سب بے چاریاں قالینوں پر لڑھکتی رہیں۔" بڑی بجیا نے سمجھانے کے انداز سے کہا۔

"تو پھر آپ چھوٹی بجیا۔" وہ گھگھیا رہے تھے۔

"اللہ، ساجد تم نے تو میری اماں بی کو دودھ پیتا بچہ بنا دیا ہے۔ اماں بی تو آج اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر آرام سے سوئیں گی۔"

کچھ دیر بعد بھاوجیں پھر چلی آئیں۔ انہوں نے قہقہے لگاتے ہوئے ساجد کو پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا اور وہ تھے کہ اماں بی کو بے بسی سے دیکھے جا رہے تھے۔

''ارے جاتے کیوں نہیں بیٹے۔ میں تو سو رہی ہوں، میری تو تھکن سے آنکھ بھی نہیں کھل رہی۔''

''ابھی نہیں جاؤں گا۔ میں چلا جاؤں گا۔'' انہوں نے بھاوجوں سے خود کو چھڑا کر پھر اماں کے پاؤں پکڑے اور آہستہ آہستہ دبانے لگے۔

بھاوجیں کچھ ناراض سی ہو کر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ اماں بی سچ مچ ذرا دیر میں خراٹے لینے لگیں۔

☆☆☆☆☆

رات کے ڈھائی بجے کے قریب وہ کچھ سوتی کچھ جاگتی سی تھیں کہ انہوں نے عادت کے مطابق ہاتھ بڑھا کر ساجد کے اوپر رکھ دیا۔ پھر ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ گئیں۔ پاؤں دباتے دباتے یہ پگلا یہیں سو گیا۔ انہوں نے سوچا اور جلدی ٹٹول کر لیمپ کا سوئچ آن کیا۔

''کیا کہیں گے سب، یہاں سو گیا ہے۔'' انہوں نے لحاف کھینچ لیا۔ گاؤ تکیے پر اس طرح لحاف پڑا تھا کہ اماں بی کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ ''اس نے سوچا ہوگا کہ اماں بی رات کو ایک بار اس پر ہاتھ رکھتی ہیں۔ وہ ہاتھ رکھیں گی اور پھر سو جائیں گی۔ رات جانے کس وقت آ کر یہ کارروائی کر گیا ہے۔''

سوچتے سوچتے وہ برابر مسکرا رہی تھیں۔ انہوں نے سرہانے سے گلاس اُٹھا کر پانی پیا، پھر گاؤ تکیے کو چوم کر اسی طرح رکھ کر لحاف ڈال دیا۔ لیمپ بجھایا اور پھر لیٹ گئیں۔ ماجد تو اپنے مستقبل کی خوشی میں ماضی کے سرہانے تکیہ رکھنا بھی بھول گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہیں جلدی سے دوپٹے کے آنچل سے پونچھا، کروٹ لے کر بڑے پیار سے گاؤ تکیے پر ہاتھ رکھ کر چند منٹ اسے ٹٹولتی رہیں اور پھر آرام سے سو گئیں۔

●●●

مال کا صدقہ

ثعلبہ بن حاطب نے سید عالم ﷺ سے درخواست کی کہ اُس کے لیے مال دار ہونے کی دُعا فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے ثعلبہ تھوڑا مال جس کا تو شکر ادا کرے اُس بہت سے بہتر ہے، جس کا شکر ادا نہ کر سکے۔ دوبارہ پھر ثعلبہ نے حاضر ہو کر یہی درخواست کی اور کہا اُسی کی قسم جس نے آپ ﷺ کو سچا نبی بنا کر بھیجا کہ اگر وہ مجھے مال دے گا تو میں ہر حق والے کا حق ادا کروں گا۔ حضور ﷺ نے دُعا فرمائی اللہ تعالیٰ نے اُس کی بکریوں میں برکت فرمائی اور اتنی بڑھیں کہ مدینہ میں اُن کی گنجائش نہ ہوئی تو ثعلبہ اُن کو لے کر جنگل میں چلا گیا اور جمعہ و جماعت سے بھی محروم ہو گیا حضور ﷺ نے اُس کا حال دریافت فرمایا، تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ اُس کا مال بہت کثیر ہو گیا ہے اور اب جنگل میں بھی گنجائش نہ رہی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ثعلبہ پر افسوس پھر حضور ﷺ نے زکوٰۃ کے تحصیل کرنے والے بھیجے لوگوں نے اُنہیں اپنے اپنے صدقات دیے جب ثعلبہ سے جا کر اُن سے صدقہ مانگا اُس نے کہا یہ تو ٹیکس ہو گیا جاؤ میں سوچ لوں۔ جب یہ لوگ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں آئے تو حضور ﷺ نے اُن کے کچھ عرض کرنے سے پہلے دو مرتبہ فرمایا ثعلبہ پر افسوس تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر ثعلبہ صدقہ لے کر حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے قبول فرمانے کی ممانعت فرما دی وہ اپنے سر پر خاک ڈال کر واپس ہوا پھر اس صدقہ کو خلافت صدیقیؓ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لایا تو انہوں نے بھی اُسے قبول نہ فرمایا۔ پھر خلافت فاروقؓ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لایا اُنہوں نے بھی قبول نہ فرمایا اور خلافتِ عثمانی میں یہ شخص ہلاک ہو گیا (مدارک)

پارہ ۱۰: صفحہ ۲۳۹: التوبہ رکوع: ۱۵ ف ۸ بحوالہ کنز الایمان

پاکستان میں جاری وساری آڑھتی راج

عاصم محمود

کسانوں سے لے کر صارفین تک کے حقوق کو پامال کرنے والے فرسودہ ظالمانہ نظام کی چشم کشا داستان

چالیس سالہ محمد اکرم ضلع قصور میں آٹھ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ وہ اپنی زمین میں چاول، گندم، مکئی اور آلو اگاتا ہے۔ جب فصل بونے کا وقت آئے، تو عموماً اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی کہ وہ بیج، کھاد، کیڑے مار ادویہ اور دیگر سامان خرید سکے۔ چناں چہ وہ علاقے کے اس شخص سے رقم ادھار لیتا ہے جو کسانوں کو قرضے دیتا ہے۔ اس شخص کو آپ کوئی بھی نام دے دیجیے...... دلال، بچولیا یا مڈل مین۔

محمد اکرم نجی یا سرکاری بینک سے بھی قرضہ لے سکتا ہے۔ مگر تب خطرہ ہوتا ہے کہ قرضہ نہ اتارنے کی صورت میں بینک اس کی زمین پر قبضہ کر لے گا مگر دلال بھی عموماً کسی خطرناک حیوان سے کم نہیں ہوتا۔ وجہ یہ کہ دلال عام طور پر اپنی رقم پر غریبوں بے بس کسان سے ہوشربا سود لیتا ہے۔ یہ ۴۰/۶۰ سے ۱۵۰ فیصد سالانہ تک ہو سکتا ہے۔ یہ دلال کی مرضی ہے کہ وہ کس کسان سے کتنا سود لے۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ جب فصل پک جائے، تو رواج یہ ہے کہ دلال ساری فصل خرید لیتا ہے۔ یہ سودا منڈی کے ریٹ سے کم رقم پر ہوتا ہے۔ دلال پھر فصل مارکیٹ ریٹ پر منڈی لے جا کر فروخت کر دیتا ہے۔ وہ پھر حاصل شدہ رقم میں سے اپنے سود اور قرضے کی رقم منہا کرتا ہے۔ جو رقم باقی بچے...... خوش قسمتی سے اگر بچ جائے تو وہ کسان کے حصے میں آتی ہے۔

بعض اوقات دلال کوئی بہانہ کر کے قرضے کی رقم واپس نہیں لیتا۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسان اس کے جال میں پھنسا رہے۔ کسان ناخواندہ اور بے شعور ہو، تو عموماً دلال اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یوں بیچارا کسان تا عمر قرضوں کے بوجھ تلے دبا رہتا ہے اور دلال کے ظلم سے بچ نہیں پاتا۔

محمد اکرم کا شمار چھوٹے کسانوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان میں چھوٹا کسان وہ ہے جو ۱۰ ایکڑ سے کم زمین رکھے۔ حالیہ مردم شماری کی رو سے پاکستان میں کم از کم بیس کروڑ لوگ آباد ہیں۔ ان میں سے چار کروڑ افراد کسان ہیں اور ان کسانوں میں سے تقریباً ۶۰ فیصد یعنی دو کروڑ چالیس لاکھ چھوٹے کسان کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔

چھوٹے کسانوں کو معمولی مت سمجھیے، خاص طور پر پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں یہ شعبہ زراعت میں ریڑھ کی ہڈی جیسی حیثیت رکھتے ہیں...... وہ زراعت جس کا پاکستان کے جی ڈی پی میں ۲۴ فیصد حصّہ ہے۔ یہی زراعت ہماری نصف افرادی قوت کو روزگار مہیا کرتی ہے۔ جب کہ اسی زراعت کی بدولت وطن عزیز کو سب سے زیادہ زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ حکومت پاکستان چھوٹے کسانوں کی ترقی و بہبود کے لیے خاطر خواہ اقدامات کرتی مگر یہاں الٹا حساب ہے ہر کسی نے انہیں دلالوں، بچولیوں اور آڑھتیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق ہر سال چھوٹے بڑے کسانوں کو فصلیں بوتے وقت ایک ہزار ارب

روپے کے قرضے درکار ہوتے ہیں۔ نجی و سرکاری بینک کسانوں کو صرف ۳۰۰ ارب روپے فراہم کرتے ہیں۔ بقیہ ۷۰۰ ارب روپے کا بندوبست کسان خود کرتے ہیں۔

چھوٹے کسان مقامی دلالوں سے قرضے لیتے ہیں۔ یہ دلال بڑے زمین دار بھی ہوسکتے ہیں۔ فصل خواہ کتنی ہی اچھی ہو اور منڈی میں اجناس کی جتنی مرضی رقم ملے، قرض دہندہ ہونے کے باعث چھوٹے کسانوں کو کم ہی مالی فائدہ ہوتا ہے۔ انہیں بس اتنی رقم مل جاتی ہے کہ روزمرہ اخراجات پورے ہوسکیں۔ اصل مالی فائدہ دلال کو ہوتا ہے جو امیر سے امیر تر ہوجاتا ہے۔ اکثر اوقات وہ تقریبات مثلاً شادی بیاہ کی خاطر بھی کسانوں کو قرضے دیتا ہے۔

غریب اور بے شعور چھوٹے کسانوں کی حالت دیکھیے کہ وہ ان ظالم دلالوں کو اپنا مائی باپ سمجھتے ہیں۔ ان کے خلاف کوئی تعلیم یافتہ شخص باتیں کرے، تو اُسے خاموش کروا دیتے ہیں۔ دراصل صدیوں سے چلے آرہے دلالی کے اس نظام نے گہری جڑیں پکڑ لی ہیں۔ اس نظام کو ختم کرنے کے لیے بہت محنت کی ضرورت ہے یا ان دردمند تعلیم یافتہ پاکستانیوں کی جو چھوٹے کسانوں کو امیر دلالوں کے جال سے آزاد کروانا چاہتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل چند پاکستانیوں نے ریکلٹ (Ricult) پاکستان کے نام سے ایک کمپنی کی بنیاد رکھی۔ یہ پاکستانی کاروبار کرنے کے ساتھ ساتھ جذبہ خدمت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس کمپنی کا مشن یہ ہے کہ پاکستان کے چھوٹے کسانوں کو دولت مند دلال سے نجات دلائی جائے۔

یہ کمپنی چھوٹے کسانوں کو صرف ۲۲ فیصد مارک اَپ پر قرضے فراہم کرتی ہے یہی نہیں، انہیں مارکیٹ ریٹ سے کم قیمت پر بیج، کھاد، کیڑے مار ادویہ وغیرہ فراہم کی جاتی ہیں۔ مزید برآں کمپنی کسان سے فصل نہیں لیتی بلکہ اس کی راہنمائی کرتی ہے کہ وہ اچھی قیمت پر اُسے کن لوگوں یا کمپنیوں کے ہاتھ فروخت کرسکتا ہے۔ ریکلٹ پاکستان نے فوجی فرٹیلائزر، گارڈ گروپ اور دیگر زرعی کمپنیوں سے معاہدے کر رکھے ہیں۔ یوں یہ ممکن ہوسکا کہ وہ چھوٹے کسانوں کو کم قیمت پر زرعی سامان فروخت کرسکے۔

ریکلٹ پاکستان نے شروع میں ضلع قصور کو اپنا ٹارگٹ بنایا۔ اس ضلع کی سات یونین کونسلوں میں ۴۵ ہزار چھوٹے کسان آباد ہیں نیز اسی ضلع کی زمین بھی زرخیز ہے لہٰذا کسانوں کو اچھی خاصی آمدن ہوجاتی ہے۔ کمپنی کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ ہر چھوٹے کسان کو قرضہ نہیں دیتی..... پہلے مختلف امتحانات کی مدد سے جانچا جاتا ہے کہ درخواست دینے والا کسان کیا قرضے کی رقم واپس کردے گا۔ یہ طریق کار کامیاب رہا ہے۔ قرضوں کی واپسی کی شرح ۱۰۰ فیصد ہے۔

یہ منفرد کمپنی رفتہ رفتہ اپنا دائرہ کار پورے پاکستان میں پھیلانا چاہتی ہے چونکہ اس کا مقصد نیک ہے لہٰذا پھیلاؤ تیزی سے جاری ہے۔ کمپنی چھوٹے کسانوں کو اپنی قسمت کا مالک خود بنانا چاہتی ہے تاکہ وہ مقامی دولت مند دلال کے اثر سے نجات پالیں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوجائیں۔

دلال کی دوسری قسم

کئی چھوٹے کسانوں کو دلال کی ایک اور قسم سے بھی نمٹنا پڑتا ہے۔ یہ وہ دلال ہیں جو چھوٹے بڑے کسانوں سے فصل خرید کر منڈی میں لے جاتے ہیں۔ بیشتر کسان اپنی فصل، سبزی یا پھل اپنی زمین پر ہی فروخت کردیتے ہیں۔ وہ اجناس ٹرکوں، ٹرالوں پر سوار کرکے منڈی لے جانے کے نرخوں سے بچنا چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کھیت سے لے کر صارف کی پلیٹ تک پہنچتے ہوئے بیشتر خوردنی اشیاء کئی ہاتھوں سے گزرتی ہیں۔ یہ عمل خوردنی اشیاء کی قیمت کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ اس عمل میں بھی دلال سب سے زیادہ منافع کماتا اور فائدے میں رہتا ہے۔ جب کہ عموماً چھوٹا کسان گھاٹے میں رہتا ہے اور اُسے

اپنی محنت کا مناسب پھل نہیں مل پاتا۔

مثال کے طور پر آلو ہی کو لیجیے۔ دلال چھوٹے کسانوں سے آلو کی کوالٹی کے مطابق سبزی ۲ تا ۴ روپے فی کلو خریدتا ہے۔ وہ پھر ٹرکوں میں لاد کر اپنا مال شہر کی منڈی لے جاتا ہے۔ وہاں وہ اپنا سارا مال ۵ سے ۷ روپے فی کلو فروخت کر ڈالتا ہے۔

منڈی میں کمیشن ایجنٹ دلال اور ہول سیلر کے درمیان سودا کرواتا ہے۔ عموماً وہ اس سودے میں دونوں سے چھ چھ فیصد کمیشن وصول کرتا ہے۔ اکثر اوقات ہول سیلر کمیشن ایجنٹ ہی کا کارندہ ہوتا ہے۔ اب ہول سیلر کوالٹی کے اعتبار سے مال کی چھانٹی کرواتا ہے۔ اچھا مال مہنگے داموں فروخت ہوگا۔

اب پرچون فروش پھیری والے اور دکان دار ہول سیلر سے بہ مطابق کوالٹی آلو ۸ روپے تا ۱۴ روپے فی کلو خریدتے ہیں اگر دکان پوش ایریا میں ہے، تو وہاں آلو ۲۰ روپے کلو کے حساب سے فروخت ہوں گے۔ جب کہ پھیری والے اور عام دکاندار آلو ۱۶ تا ۱۸ روپے فی کلو کے حساب سے فروخت کریں گے۔

یہ دیکھیے کہ اس سارے عمل میں آلو کی فی کلو قیمت ۲ تا ۴ روپے سے بڑھ کر ۱۸ تا ۲۰ روپے جا پہنچی ہے۔ یہ قیمت میں ۴۰۰ تا ۹۰۰ فیصد اضافہ ہے اور اس منافع کا ۹۵ فیصد حصہ دلالوں یا بیچ میں آنے والے لوگوں کی جیبوں میں جاتا ہے۔ اگر کسان اپنا مال خود آکر مارکیٹ میں فروخت کریں، تو کہیں زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ دلالوں کی مافیا چھوٹے کسانوں کو آزادانہ کام نہیں کرنے دیتی اور ان کی راہ میں مختلف طریقوں سے پتھر اٹھاتی ہے۔ اسی لیے بیچارا چھوٹا کسان مستقل دلال نما گدھوں کے پنجوں میں پھنسا بلبلاتا رہتا ہے۔

ماضی میں پنجاب اور سندھ کی صوبائی حکومتیں دلالوں کا اثر و رسوخ ختم کرنے کی کوششیں کرچکی ہیں مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم ریکلٹ پاکستان جیسی کمپنیاں جو ''کاروبار اور انسانی بھلائی ساتھ ساتھ'' کے نعرے پر یقین رکھتی ہیں اگر چھوٹے کسانوں میں مقبول ہوگئیں، تو پاکستان کے شعبۂ زراعت میں مثبت انقلاب آسکتا ہے۔ یہ کمپنیاں چھوٹے کسانوں کو زراعت کے جدید تکنیکی طریقے بھی سکھانا چاہتی ہیں جن سے پیداوار میں اضافہ کرنا ممکن ہے۔

کچھ عرصہ قبل سوشل میڈیا والوں نے پھیری والوں اور عام دکان داروں کے خلاف بائیکاٹ مہم چلائی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ لوگ مہنگا پھل فروخت کرتے ہیں مگر درج بالا حقائق سے یہ عیاں ہے کہ خصوصاً غریب پھیری والے دلالی کے ایک طویل سلسلے میں سب سے آخر میں آتے ہیں۔ مہنگائی کرنے کے اصل ذمے دار دولت مند دلال و آڑھتی ہیں۔ پھیری والوں کو اگر منڈی ہی سے مہنگا سودا ملے گا تو وہ اس کو سستے داموں کیسے فروخت کردیں؟

روتے کیوں ہو؟

''کیا اس ٹرین میں کوئی ٹکٹ چیکر آتا ہے؟'' میں نے برلن میں سفر کرتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی میرا ٹکٹ کیوں چیک کرے گا؟'' جرمن دوست نے حیران ہوکر کہا۔

''فرض کرو، تم ٹکٹ نہیں لیتے۔ پھر؟''

اس نے فرض کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

''کیا تم نے اپنے ملک میں کبھی بلا ٹکٹ سفر کیا ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''کئی بار'' میں نے اعتراف کیا۔

''میں تمھارے ملک کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ بولا ''لیکن اگر تم دو روپے کی کرپشن کرتے ہو تو تمھارے لیڈر دو سو اور اب کی کرپشن کرتے ہوں گے۔''

(مرسلہ: فوزیہ کبیر)

میرے ابا پروفیسر تھے اور اماں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک روایتی خاتونِ خانہ، خاندان میں دُور

سعدیہ جبار

میں ایک فوجی کی ماں

اُمید کے دیے روشن کرنے والا پاکیزہ جذبات سے مملو قصہ

دُور تک کسی کا بھی فوج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے میں اچانک میرے لیے ایک فوجی کا رشتہ آگیا۔ موصوف پاک فوج میں کپتان اور جہلم میں تعینات تھے۔ میں اُن دنوں تھرڈ ائیر میں تھی۔ بمشکل اٹھارہ سال عُمر تھی۔ جونہی یہ رشتہ چھان پھٹک کے بعد منظور کیا گیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ لگا کہ اَب زندگی حسین نہیں حسین تر ہو جائے گی۔

اس دوران سسرال والوں نے مطالبہ کر دیا کہ کپتان صاحب چھٹی پر آئے ہوئے ہیں اور نکاح کر دیا جائے تاکہ اُنہیں سرکاری گھر لینے میں آسانی رہے۔ یوں آناً فاناً نکاح بھی ہو گیا۔ نکاح کے بعد لگتا تھا کہ کسی دن اچانک اُن کا فون آئے گا یا وہ کوئی محبت بھرا خط لکھیں گے۔ ایک دِن اُن کا خط مِلا۔ بہت ہی اشتیاق سے خط کھولا۔ سلام دُعا کے بعد عرض تھا کہ اَب تم ایک فوجی کی بیوی ہو، پھر فوجی کے فرائض، جذبۂ شہادت کی آرزو اور ایک فوجی کی بیوی ہونے کے ناتے میرے فرائض تحریر تھے۔

کپتان صاحب کو کورس کے لیے کوئٹہ جانا پڑ گیا پھر تو ہر خط اور فون پر اپنی ٹریننگ کے ہی قصے ہوتے۔ اِسی طرح چھ مہینے گزر گئے۔ کورس مکمل ہوتے ہی ہماری رُخصتی کا فیصلہ ہو گیا۔ اُنہی دنوں اُن کی پوسٹنگ ٹل میں ہو گئی اور شادی کے پانچ دِن کے بعد ہی وہ اپنی ڈیوٹی روانہ ہو گئے۔ میں دوبارہ دِن گننے لگی۔ ساس، سُسر انتہائی اچھے اور پیار کرنے والے تھے۔ روزانہ کیپٹن جاوید کی بہادری اور شجاعت کے قصے سُننے کو ملتے۔ جاوید مجھے ہر فون پر بہادر اور دلیر بننے کو کہتے۔

تب احساس ہوا کہ پاک فوج اِسی لیے دنیا بھر میں مشہور ہے مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دو ماہ بعد جب جاوید آئے تھے تو ہم نے لاہور جانے کا پروگرام بنایا۔ ہم لوگ اپنی گاڑی پر لاہور جا رہے تھے کہ گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی اور جاوید موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ شاید اِسی لیے وہ مجھے بہادری اور دلیری سے زندہ رہنے کا دَرس دیتے رہتے تھے کہ اب مجھے تنہا ہی مشکلات کا مقابلہ کرنا تھا۔

وہ وقت بہت ہی سخت تھا۔ ایک شخص جو آپ کا سب کچھ ہو، جدا ہو جائے اور سبھی ارمان آئینے کی طرح کرچی کرچی ہو جائیں تو صرف اللہ کی مدد اور ہمت سے ہی وقت کٹتا ہے۔

یہ میری زندگی کا سب سے مشکل وقت تھا مگر الحمدللہ یادوں کے سہارے گزر گیا۔ اُس وقت میری عُمر بمشکل اُنیس سال تھی۔ عدت کے بعد خاندان والے مجھے نکاحِ ثانی کے لیے مجبور کرنے لگے لیکن دِل مانتا ہی نہیں تھا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ میں نے کچھ عرصے بعد دُوسری شادی کر ہی لی۔ دِل میں اب یہ خواہش تھی کہ اگر اللہ رب العزت نے اولاد نرینہ دی تو اُسے فوجی بناؤں گی۔ پہلی اولاد بیٹی ہوئی۔ اللہ کا شُکر ادا کیا۔ دوسری دفعہ اللہ نے بیٹا عطا کر دیا مگر ہائے ری قسمت بچہ انتہائی کمزور اور لاغر تھا۔ ایک ہفتے تک انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا۔ پھر کچھ سنبھلنے پر میری گود میں ڈالا گیا۔

مجھے آج بھی وہ وقت یاد آتا ہے۔ وہ انتہائی کمزور، لمبے سے سَر والا چھوٹا سا لاغر بچہ تھا۔ تب مجھے احساس ہوا تھا کہ فوجی تو درکنار یہ نارمل زندگی گزار لے تو بڑی بات ہو گئی۔ نام طلحہ رکھا گیا اور دِن رات اُس کی زندگی اور صحت کے لیے دُعا کی جانے لگی۔ رَب سوہنا بڑا عظیم ہے۔ ماشاءاللہ وقت کے ساتھ ساتھ طلحہ کی صحت بہتر ہونے لگی پھر بھی اپنے ہم عمر بچوں کی نسبت وہ کمزور تھا۔ گرمی اور سردی کا اثر زیادہ لیتا اور اکثر و بیشتر بیمار اور چڑچڑا رہتا۔ جوں جوں بڑا ہوا اللہ کے فضل و کرم سے صحت بہتر ہونے لگی اور تعلیمی میدان میں بھی کامیابیاں سمیٹنے لگا۔

مجھے لگتا تھا کہ میرا یہ خواب شاید پورا نہ ہو کہ طلحہ فوجی بن جائے۔ وہ انتہائی کمزور اور سُست تھا۔ خیر میاں صاحب کو اُس کی تعلیمی کامیابیاں دیکھ کر لگا کہ بیٹے کو کم از کم ڈاکٹر تو ضرور بننا چاہیے۔ پھر کیا تھا، بچہ اور کتابیں لازم و ملزوم ہو گئیں۔ طلحہ نے میٹرک اعزازی نمبروں سے پاس کیا تو مقامی کالج میں اُسے مفت داخلہ مِل گیا۔ اللہ کے فضل سے ایف ایس سی کا امتحان بھی اعزازی نمبروں سے پاس کر لیا اور میڈیکل کالجوں میں داخلے کے لیے انتظار ہونے لگا۔

ایک شام اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے کچھ دوست انٹرنیٹ کی سہولت میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے گھر آ رہے ہیں تاکہ وہ پاک فوج میں شمولیت کی آن لائن درخواست دے سکیں۔ مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اُن بچوں کے ساتھ ساتھ موصوف نے بھی پاک فوج کے شعبۂ میڈیکل میں درخواست دے ڈالی۔ چند دن گزرنے کے بعد طلحہ نے مجھے بتایا ''اماں! میرا فوج کے لیے ٹیسٹ ہے۔ یہ سن کر مجھے خاصی حیرانی ہوئی مگر میں نے اُس کی حوصلہ شکنی نہ کی اور اُسے جسمانی ٹیسٹ کے لیے جانے دیا۔ آخرکار مرحلہ وار کامیابیاں سمیٹتے ہوئے آرمی میڈیکل کالج پہنچ ہی گیا۔

مجھے اندازہ ہی نہ تھا کہ فوج کی تربیت اتنی سخت ہو گی۔ شروع کے دو مہینے تو نہ کوئی اتا نہ پتا، نہ ٹیلیفون کی سہولت تھی۔ اگر رابطہ کرنا پڑا تو ایک لمبا مرحلہ اور انتظار۔ اللہ اللہ کر کے دو مہینے بعد بچے کو ہم سے ملنے کی اجازت ملی۔ جب وہ گھر آیا تو یقین مانیے، کم از کم بیس کلو وزن کم ہو گیا تھا۔ رنگ انتہائی کالا اور کمزور شکل۔ میری تو جان ہی نکل گئی لیکن بچہ انتہائی خوش اور مستقبل کے حسین سپنے لیے ہوئے تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ماشاءاللہ فوجی تربیت میں تو نرمی آ گئی مگر جذبۂ شہادت اور وطن کے لیے کچھ کر گزرنے کی لگن پختہ ہو چکی تھی۔ اللہ کی شان وہ بچہ جو انتہائی کمزور اور سست تھا، بفضلِ تعالیٰ انتہائی فرض شناس، چاق و چوبند اور نڈر ہو چکا۔ میری جب اُس سے بات ہو یا وہ چھٹی پر آئے تو کہتا ہے کہ دُعا کریں میں ایک کامیاب فوجی بن کر ملک و قوم کے لیے کوئی عظیم کارنامہ انجام دوں۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ سلام پاک فوج، سلام اِس کے جوانوں پے اور سلام اُس سوچ اور جذبے کو جو سب کچھ بھُلا دیتا ہے اور صرف فرض یاد رہتا ہے۔

آفرین ہے اُن ماؤں پر جن کے بچے راہِ حق میں شہید ہوئے اور اُنہوں نے ہمت و حوصلہ نہ ہارا۔ میں نے تو صرف یہ جانا، فوجی صرف فوجی ہے اور اُس کا فرض تمام محبتوں پر غالب ہے۔

پاک فوج زندہ باد

●●●

جب ہمیں کسی کے انتقال کر جانے کی خبر ملے، تو بعض اوقات کسی نہ کسی عزیز رشتے دار سے یہ جملہ ضرور سننے کو ملتا ہے: ''افسوس، وہ اچانک چلے گئے''..... ''ابھی ان کے مرنے کے دن تو نہیں تھے''۔ وہ ''اچانک چلا گیا یا اچانک چلی گئیں''۔

ہمارے ہاں اس قسم کے تعزیتی جملے عام طور پر سننے کو ملتے ہیں۔ بات کچھ صحیح بھی لگتی ہے! کوئی مرد یا خاتون رات کو ٹھیک

وہ اچانک چلے گئے

رضی الدین سید

اندھے اور بہرے بن جانے والے انسانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتی بلند آہنگ منادی

ٹھاک سوئے اور صبح اچانک بستر پر مردہ حالت میں پایا جائے تو بلاشبہ یہی کہنا پڑتا ہے ''وہ اچانک چلا گیا یا اچانک چلی گئی''۔ اب بھلا اس موقع پر اس کے سوا اور کیا جملہ ادا کیا جائے؟

لیکن تبصرے اور حادثے کو ایک پہلو سے اور بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ سورہ فجر (نمبر ۸۹) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ترجمہ: ''بے شک تمہارا رب تمہاری گھات میں لگا ہوا ہے''۔

سوال یہ ہے کہ آیت میں اللہ نے گھات کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟، اور یہ ''گھات'' آخر کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ گھات اس خفیہ مقام (کوٹھری، چوکی، یا چھوٹا سے کمرے) کو کہتے ہیں جہاں کوئی شکاری چھپ کر بیٹھے اور اپنے شکار کا اس طرح انتظار کر رہا ہو کہ وہ آئے تو بالکل بے خبری میں اسے اچانک جا دبوچے، پنجۂ خونخوار میں یکا یک جھپٹ لے۔ گھات میں بیٹھا ہوا شکاری تو اپنی خفیہ کمین گاہ سے سب کو دیکھتا ہے لیکن خود اسے کہیں سے کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ شکاری کے نزدیک دشمن کو بے خبری میں دبوچنے کے لیے گھات کا حیلہ بہت کارآمد ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ سورۃ میں اپنے آپ کو ایسی عظیم ہستی قرار دیا ہے جو انسانوں کو یکا یک دبوچ لیتی ہے۔ گویا یہ گھات لگانے کا واشگاف اعلان ہے۔ بہت واضح الفاظ میں بتا دیا ہے ''تمہارا رب تمہاری گھات میں لگا ہوا ہے''۔ خفیہ طور پر وہ تمہاری تمام حرکتوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

یہ کہ کس طرح بے باکی سے تم اس کی دنیا میں فساد پھیلا رہے ہو کس جرأت و ڈھٹائی سے تم اس کے قوانین کا مذاق اڑاتے چلے جاتے ہو؟ اور کس بے شرمی سے لوگوں کے حقوق غصب کرتے رہتے ہو؟ اللہ کے قوانین پر عمل درآمد کے بارے میں، اس کے ناقابل تغیر ارادوں کے متعلق، حشر میں حساب کتاب لیے جانے، اس کے دربار میں گناہوں سے آلودہ پہنچنے اور دہکتی آگ کے شعلوں میں پھینک دیے جانے کے بارے میں اللہ، قرآن اور رسولوں، سب نے تمہیں پہلے ہی بہت کچھ آگاہ کر دیا تھا۔ سو سلامتی و ضمانت کا راستہ تمہارے لیے یہی تھا کہ دنیا میں رہتے ہوئے بہت بچ بچا کر چلتے، پاکیزگی کی سیدھی راہ اختیار کرتے، دوسروں کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی عاقبت نہ خراب کرتے، اور مال و اولاد کو اپنے

لیے فتنہ نہ بناتے وغیرہ۔

لیکن اس کے باوجود تم سدا اندھے بہرے بنے ہی زندگی گذارتے رہے، ایسے جیسے ہم نے تمہیں کوئی تنبیہہ کی ہی نہیں تھی۔ جیسے ہم تمہارے رب تھے ہی نہیں، جیسے دنیا بس کھیل کود کے لیے ہی بنائی گئی تھی۔ سو اب یہ ہماری باری آئی ہے۔ اب ہم تمہیں تمہاری بغاوت، سرمستی اور تمہارے تکبر کا بدلہ دیں گے۔ ہم تمہیں گردن سے اچانک جا دبوچیں گے۔ وہاں سے جہاں سے تم کو بھی تمہاری کچھ خبر نہ ہوگی۔ ہمارے خفیہ واہنی شکنجے سے تم اس طرح یکا یک اوپر چلے آؤ گے کہ کسی کو یقین ہی نہیں آئے گا کہ ان سب کے درمیان سے تم ایک دم کیسے غائب ہو گئے؟

''وہ اچانک چلے گئے..... بھائی صاحب کیا بتاؤں، اچھے بھلے تھے۔ ابھی ابھی تو مارکیٹ گئے تھے!'' سب حیران ہو کر یہی تبصرہ کریں گے۔

آئے دن ہم دیکھتے ہیں کہ سڑک پر چلتے چلتے کوئی اچانک دھڑام سے زمین پر گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ گیا۔ ''اس دنیا کا آدمی اچانک اُس دنیا میں چلا گیا!'' کوئی فضا بسوں کے حادثے میں جیتے جاگتے ایک دم جان ہار گیا۔ کسی جہاز کا حادثہ ہوا اور اچھے کھاتے پیتے لوگ ہنستے بولتے آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئے، زندگی کی بازی ہار گئے!

کسی خاتون کو بیک وقت دو تین صدمے پہنچے، بے ہوشی طاری ہوئی اور ہسپتال پہنچتے پہنچتے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ گئی۔ نہ دوا دارو، نہ علاج معالجہ، نہ ڈاکٹر آپریشن۔ بس کھیل ختم!

زمین کو روندنے والے اب بے حس و حرکت ٹھنڈے پڑے ہیں! چاہے اب کوئی کچھ بھی کر لے، کتنی ہی تدبیریں اختیار کر لے، کتنے ہی اثر و رسوخ استعمال کر لے، جزا و سزا دینے والے رب نے جس انسان کا شکار کرنا تھا، وہ تو بے خبری میں شکار ہو ہی چکا!

سو تمہارے رب کا یہ قول پورا ہوا، قولِ فیصل ''بے شک تمہارا رب تمہاری گھات میں لگا ہوا ہے''۔ وہ تمہیں ایسی جگہ سے پکڑے گا جہاں سے تمہیں گمان بھی نہ ہوگا۔ وہ ہر وقت تمہاری گھات میں لگا ہوا تھا لیکن تم بھلا کب کسی کی نصیحت پر دھیان دیتے تھے؟ کب کسی آیت پر متوجہ ہوتے تھے؟

پھر یہی ایک اعلان نہیں، اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ مزید یہ بھی ارشاد فرمایا ہے، ترجمہ: ''نگاہیں اس کو پا نہیں سکتیں لیکن وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔'' (الانعام ۱۰۳:۶)۔

سورۂ نور میں ارشاد کیا ''اور جو لوگ منکر ہیں، ان کے اعمال کی حقیقت یہ ہے جیسے کوئی سراب ہو جسے پیاسا آدمی پانی سمجھے۔ یہاں تک کہ پیاس بجھانے کے لیے جب وہ وہاں پہنچے تو اس کا حساب پورا چکا دیا، اور اللہ کو حساب چکانے میں دیر نہیں لگتی'' (النور۔ ۳۹:۲۴)۔

ان دونوں مقامات پر اللہ نے انسان کو بالکل بے خبری میں پکڑے جانے کی خبر دی ہے۔ وہ تو سب کو دیکھ رہا ہے لیکن اسے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ کیونکہ وہ پوشیدہ ہے، سامنے نہیں ہے اور دنیا کی زندگی کو اصل زندگی (آبِ حیات) سمجھنے والے خوشی خوشی دوڑتے ہوئے جب چشمے تک پہنچتے ہیں تو پتا لگتا ہے کہ وہاں پانی نہیں، سراب تھا، دھوکا تھا اور اسی باعث پیاس کی شدت کے سبب وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہیں جان دے دیتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ زندگی ایک دم تمام نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں جو انسان بلکہ ذی حس آئے سبھی کی تقدیریں پیدائش کے وقت ہی لکھ دی جاتی ہیں۔ یہ تقدیر مقام، جگہ، عمر اور وجہ موت پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنے مقررہ وقت پر ہی اللہ کے حضور حاضر ہوتا ہے۔ خواہ ہمارے لحاظ سے وہ ابھی اس کے جانے کا وقت نہ ہو۔ خواہ وہ ہمیں اچانک ہی کیوں نہ لگے۔

''وہ اچانک چلے گئے، بالکل دیکھتے دیکھتے ہی قبر میں جا کے لیٹ گئے''۔ یہ بڑے درد بھرے جملے ہیں جو ہم دن رات لوگوں سے بولتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود کبھی اپنے افعال کی طرف نگاہ نہیں کرتے! کبھی نہیں سوچتے کہ پیکرِ خاکی میں ملفوف یہ ہمارا جسد، اللہ جانے کہاں دم توڑ دے؟ ''نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے!''

نماز میں موبائل فون کا بجنا

عادل صلاحی

ایک اہم سوال کا عالمانہ جواب

سوال: آج کل لوگ جہاں بھی جاتے ہیں اپنا موبائل فون ساتھ لے جاتے ہیں۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو ان میں بیشتر لوگ اپنے موبائل فون سیٹ بند کر دیتے ہیں یا انہیں ''سائلنٹ'' حالت میں کر دیتے ہیں۔ (تاکہ ان کی گھنٹیوں کی آواز نہ آئے) لیکن ایسا ہونا ناگزیر ہے کہ کچھ لوگ اپنا موبائل سیٹ بند کرنا بھول جاتے ہیں، خصوصاً اس وقت جب وہ تاخیر سے آتے ہوں اور نماز باجماعت شروع ہو چکی ہو۔ اب نماز میں شامل ہو جانے کے بعد اگر ان کے موبائل فون پر کوئی کال آئے اور موبائل کی گھنٹی بجنے لگے تو یہ لوگ پریشان ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی یہ تجویز ہے کہ ایسے فرد کو موبائل سیٹ ہاتھ میں تھامے بغیر اس کا سوئچ بند کر دینا چاہیے۔ کیا ایسا کرنا، جائز ہوگا؟

جواب: اس سوال میں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ موبائل بند کرنے کے لیے جو نقل و حرکت کرنی پڑے گی یا نمازیوں کی توجہ ہٹ جائے گی اس پر تشویش ظاہر کی گئی ہے، لیکن ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام، انسانوں کے ساتھ پیش آنے والی صورتِ حال سے بحث کرتا اور انسانی کوتاہیوں اور بھول چوک کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ لوگوں کو پریشان کن اور مشکل صورتِ حال سے دوچار نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے چیزوں کو ہمارے لیے آسان بنانے کی غرض سے ہمیں بہت ساری رعایتیں دی ہیں۔ جب بھی دو متبادل چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کا موقع آیا، رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ آسان راستے کو منتخب فرمایا، سوائے اس کے کہ اس میں کوئی ناجائز بات ہو۔

جو فرد نماز کی حالت میں ہو اور اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگے تو اسے اپنے موبائل کا سوئچ بند کر دینا چاہیے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ اسے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل سیٹ باہر نکالنا ہوگا، اس کی طرف دیکھنا ہوگا تاکہ درست بٹن دبا سکے تو ایسا ہی ہونے دیں۔ اسے ایسا فوراً کرنا چاہیے تاکہ اس کی وجہ سے جو خلل پڑ رہا ہے وہ دیر تک برقرار نہ رہے۔ ایسا کرنے سے اس کی نماز متاثر نہ ہوگی۔ اس کی نماز بدستور درست رہے گی اور کوئی حرج نہ ہوگا۔

آپ متبادل صورت پر غور کریں۔ موبائل سیٹ کی گھنٹی بجتی رہے۔ کچھ موبائل سیٹس میں ایسی ترتیب رکھ دی جاتی ہے کہ گھنٹی کی آواز رفتہ رفتہ بلند ہوتی جاتی ہے، چنانچہ اگر موبائل فون کی گھنٹی کو بجنے دیا جائے جب کہ نماز باجماعت جاری ہو تو واقعی بہت بڑا خلل پڑے گا۔ مزید یہ کہ جب فون کال کا جواب نہیں دیا جائے گا تو فون کرنے والا یہ سمجھے گا کہ شاید اس نے غلط نمبر ملا دیا تھا۔ وہ ذرا سا وقفہ دے کر دوبارہ نمبر ملائے گا۔ یہ صورتِ حال ہمیں کہاں لے جائے گی، خصوصاً جب دو یا تین موبائل کی گھنٹیاں ایک کے بعد ایک بجنے لگیں۔

عملی نقطۂ نظر سے اس صورتِ حال سے یہی حکم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس فرد کا موبائل ایسے وقت بجنے لگے جب وہ نماز کی حالت میں ہو تو اس فرد کو نماز توڑے بغیر اپنے موبائل کا سوئچ فوراً بند کر دینا چاہیے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ اسے زیادہ نقل و حرکت کرنی پڑے گی، مثلاً موبائل، لباس کی اندرونی جیب میں رکھا ہوا ہو، تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں۔

(بحوالہ کتاب اسلام طرزِ فکر، جلد سوم) ●●●

انعام

راہ سے بھٹکے خاوند کا سبق آموز مداوا

ایک دن بیگم بڑے ڈھنگ سے اُسے سیدھے راستے پر لے آئی

اخلاق احمد

محمد شفیق کی زندگی میں محبت اس وقت آئی جب ایک ہی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں مسلسل بیس سال کا پی رائٹنگ کرتے کرتے وہ بے حال ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی سرکاری اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتے پڑھاتے اور دمے سے لڑتے لڑتے بیزار ہو چکی تھی۔ وہ خود کو اڑتالیس سال کی عمر میں ستر سال کا بوڑھا سمجھنے لگا تھا۔

اس وقت تک اُس کا خیال تھا کہ وہ نوعمری سے پختہ عمر ہونے تک متعدد کامیاب محبتیں کر چکا۔ ان کے نتیجے میں، جو محمد شفیق کے خیال میں کامیاب تھیں اور محبتیں بھی، وہ زندگی بھر سرشار اور مطمئن اور مسرور رہا تھا۔ اسے ان نظموں اور غزلوں کے کچھ مصرعے بھی اب تک یاد تھے جو ابتدائی محبتوں کے دوران یا ان کے ختم ہو جانے کے بعد اس نے کہی تھیں۔ ان کی وجہ سے اس کو محدود ذہانت والے دوستوں کے حلقے میں بڑا تخلیق کار سمجھا جاتا تھا۔

وہ سپاٹ زندگی بسر کر رہا تھا مگر اس خوش گمانی میں تھا کہ یہ ایک بھرپور زندگی ہے لہٰذا وہ ہفتے میں ایک دو بار دوستوں کے ساتھ شام کا وقت ایک کافی ہاؤس میں گزارتا جہاں سب مل کر دوسروں کی غیبت کرتے اور چائے کے ساتھ قیمے کے سموسے منگواتے۔ گھر پر وہ اپنے بچوں کو ذرا فاصلے پر رکھتا۔ بیوی پر دمے کا دورہ پڑتا تو منافقانہ فکرمندی ہمیشہ ظاہر کرتا۔ یہ وہ وقت تھا، جب محبت اس کی زندگی میں چلی آئی۔

محمد شفیق ٹی وی ڈرامے لکھنے والی شہناز کو یوں پڑھتا گیا جیسے وہ کسی دلچسپ کتاب کو پڑھتا تھا، صفحہ صفحہ، سطر سطر۔ شہناز چینی کھانے شوق سے کھاتی تھی۔ رات بارہ بجے سے ڈھائی بجے تک اپنے ناول پر کام کرتی۔ غصے میں اس کی ستواں ناک سرخ ہو جاتی۔ وہ شوخ رنگ کے ملبوسات پہنتی جو دہلی کالونی میں رہنے والی ایک بے نام ڈریس ڈیزائنر تیار کرتی تھی۔ وہ اپنے اکاؤنٹنٹ شوہر عارف سے، جو جدہ میں کسی گمنام فرم میں ساڑھے چھ ہزار ریال کی تنخواہ پر کام کرتا تھا، بیزار ہو چکی تھی اور چند ماہ میں اسے خلع کا نوٹس بھجوانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

محمد شفیق چھوٹی چھوٹی باتوں، جوابوں، سوالوں اور تبصروں سے شہناز کے بارے میں جانتا گیا۔ اس کی پسند و ناپسند، عادتوں، پسندیدہ موضوعات، ملیح چہرے پر مسکراہٹ لانے کے حربوں غرض ہر چیز سے واقف ہوتا گیا۔ وہ زندگی کے اگلے برسوں میں آزاد رہنا چاہتی تھی یا کسی ایسے وسیع القلب مرد کے ساتھ جو تخلیقی صلاحیت رکھتا، زندگی کو جانتا اور خود اس کو سمجھتا ہو۔

''کیا میرا اتنا بھی حق نہیں۔'' وہ اپنی کاجل بھری آنکھیں محمد شفیق پر مرکوز کر کے کہتی اور وہ صرف سر ہلا پاتا۔

محمد شفیق کے شب و روز بدل گئے۔ شہناز کا ٹی وی سیریل بہت کامیاب نہیں رہا پھر بھی ان کی روزانہ ملاقاتیں جاری رہیں۔ ایک روز اس کی بیٹی نے کہا ''بابا! آپ نے تو ہمارے ساتھ رات کا کھانا کھانا چھوڑ ہی دیا۔''

محمد شفیق جوتے اتارتے اتارتے رک گیا۔ کسی جرم کے احساس نے اسے لمحہ بھر کو لاجواب کر دیا۔ جواب اس کی بیوی نے دیا۔

''بابا کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں گڑیا۔ وہ تمھارے لیے دن رات کام کرتے ہیں۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو، تمھیں یہ بات سمجھنی چاہیے۔'' مگر کمرے میں، روشنی بجھانے اور محمد شفیق کی طرف کروٹ لینے کے بعد اس نے کہا ''کہہ تو وہ ٹھیک رہی تھی۔ ایسی بھی کیا مصروفیت ہو گئی ہے کہ ہر روز کھانا کھا کر آتے ہیں۔'' محمد شفیق چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے ہوٹل کا کھانا برا لگتا ہے۔ مجبوری میں کھاتا ہوں۔ ڈاکٹر کہہ چکا کہ معدہ خالی نہیں رہنا چاہیے۔''

وہ سو گئی مگر محمد شفیق جاگتا رہا۔ ایک سپاٹ، بے رنگ زندگی گزارنے والا محمد شفیق، جس کی جھولی میں آسمان سے ایک خزانہ آ گرا تھا، اپنے اندر ایک بے کلی، اضطراب، خوف پھیلتا محسوس کرتا تھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ جو اس کے گرد سیاروں کی طرح گردش کرتے لوگ ہیں اور آس پاس پھیلی زندگی ہے، یہ سب کچھ ایک خواہش، اشارے سے اس طرح ختم نہیں ہو سکتا جیسے وہ کمپیوٹر اسکرین سے اشتہاری سلوگن، جنگلز اور مغربی اشتہارات سے چرائی ہوئی کاپی کے لفظ منتخب کر کے ڈیلیٹ کر دیتا ہے۔

ہر سمجھدار آدمی کی طرح اسے بیوی سے زیادہ معاشرے کا خوف تھا۔ بیوی کو اس نے ہمیشہ اتنی ہی اہمیت دی تھی جتنی وہ اپنی نئی قمیص کو یا شارجہ میں رہنے والے اپنے خوشحال بھائی یا بڑھتی مہنگائی کو دیتا تھا۔ چار پانچ دن بعد محمد شفیق، شہناز سے گفتگو کرتے کرتے کسی بہانے سے اسی موضوع پر آ گیا۔ رشتے، بیوی، بچے، ذمہ داریاں، کشمکش، مشکل فیصلے، سماجی اور نفسیاتی الجھاؤ۔ براہ راست اپنے معاملے پر بات کرنے کے بجائے وہ گھما پھرا کر پورے معاشرے کی بات کر رہا تھا۔

پسندیدہ مراکشی چائے کا ایک گھونٹ بھر کر، جس کی کڑواہٹ کم کرنے کے لیے کم از کم ایک چمچ شہد ڈالا جاتا تھا، شہناز نے اس سڑک کی جانب نگاہ کی جو آگے ساحل کی طرف جاتی تھی اور کہا ''پتا نہیں۔ میں تو ان چیزوں کو جذبات کی عینک سے نہیں دیکھتی۔ جذبات کی عینک سے دیکھو تو باقی دنیا اہم ہو جاتی ہے۔ آدمی خود اہم نہیں رہتا۔ میرے لیے سب سے زیادہ اہم خود میری ذات ہے۔ میری زندگی اور میری خوشی ہے۔ یہ زندگی بس ایک بار ملتی ہے، ایک بار۔ چاہے اپنی مرضی سے جیو، چاہے دوسروں کی مرضی سے پوری عمر گزار دو۔''

محمد شفیق نے اپنی زندگی پر نگاہ ڈالی اور سر ہلایا۔

''اور یہ معاشرہ کیا ہوتا ہے؟'' شہناز نے کہا۔ ''رشتے کیا ہوتے ہیں؟ ہر چیز آدمی کی اپنی ذات سے بندھی ہے۔ آدمی کے بغیر یہ رشتے، دوستیاں، معاشرہ سب صفر ہیں۔ جو لوگ ہزاروں میل دور جا کر بس جاتے ہیں، وہ کیا اپنا معاشرہ ساتھ اٹھا کر لے جاتے ہیں؟ ایک بم دھماکے میں جس آدمی کا پورا خاندان فنا ہو جاتا ہے وہ کیا باقی زندگی کسی معاشرے یا رشتے کے بغیر گزارتا ہے؟ سب باتیں ہم نے خود بنائی ہیں۔ ساری

اصطلاحات ہم نے خود تخلیق کی ہیں اور پھر ان کی پوجا شروع کر دی ہے۔''

محمد شفیق کو شبہ ہوا کہ وہ اپنے زیر تکمیل ناول کی لائنیں بول رہی ہے مگر بس ایک نامکمل سا شبہ۔

''اکتالیس برس کی ہو چکی ہوں میں۔'' شہناز کی نظریں نیچے، ساحل کی طرف جانے والی سڑک پر جمی تھیں جہاں گزرنے والی گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ''اور اب سمجھ میں آئی ہے یہ بات کہ خوشیاں حاصل کرنے اور اپنی مرضی کی زندگی پانے کے لیے خود قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ ورنہ یہ بنجر، بے رنگ زندگی کسی بھیانک خواب کی طرح چلتی رہتی ہے۔''

اس رات محمد شفیق کو سونے کے لیے نیند والی گولی کی مدد لینی پڑی جو بیوی میز کی دراز میں ہمیشہ رکھتی تھی۔ دفتر میں اگلا دن بھی ایسے ہی گزرا اور اس سے اگلا دن بھی۔ ایک مسلسل بے کلی ختم نہ ہونے والا اضطراب۔ محمد شفیق کا دل کسی چیز میں نہ لگا۔ اس نے رف نف شوز کے ٹی وی کمرشل کی کاپی پانچ بار لکھنے کی کوشش کی اور ہر بار اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔ ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ جوتوں کے اس اشتہار کو یوں لکھے کہ ساری دنیا حیران رہ جائے ''رف نف شوز پہنیے، خود قدم اٹھائیے ورنہ یہ بنجر، بے رنگ زندگی کسی بھیانک خواب کی طرح چلتی رہے گی۔''

تیسرے دن اسے اچانک خضدار جانا پڑا، کراچی سے چار سو کلومیٹر دور۔ کسی کلائنٹ کی فرمائش تھی کہ اس کے پروڈکشن پلانٹ کا ایسا بروشر شائع کیا جائے جس سے ثابت ہو جائے کہ ایسا معیاری پروڈکشن پلانٹ نہ کبھی پہلے بنا تھا اور نہ آئندہ بن سکے گا۔

خضدار میں انھیں ایک دن کے بجائے دو دن رکنا پڑا۔ فیکٹری شہر کے مضافات میں تھی جہاں موبائل فون کے سگنل نہیں پہنچ پاتے تھے۔ اردگرد سناٹا تھا اور شام ڈھلتے ہی ایسی ہولناک تنہائی آسمان سے اترتی کہ ذرا سے کھٹکے پر بھی دل لرز جاتا۔

تیسری صبح تھکن اور نامکمل نیند سے بے حال محمد شفیق کو گاڑی نے اس کے گھر کے دروازے پر اتارا تو اس کے بدن کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ دل میں ایک گہری نیند کی خواہش کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اندر گھسا تو اس کی بیوی سامنے لاؤنج میں کھڑی تھی۔

''ارے.....!'' محمد شفیق نے حیرت سے کہا..... ''تم اسکول نہیں گئیں۔''

''نہیں.....'' اس کی بیوی نے تلخی سے کہا۔

ایک گھاگ شوہر کی طرح محمد شفیق نے اپنی بیوی کے لہجے میں چھپے غصے کو دیکھ لیا اور اندازہ لگایا کہ وہ اس کی دو دن کے بجائے تین دن بعد آمد پر ناراض ہے۔ محمد شفیق کو تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ زندگی بھر اس نے اپنی بیوی کو کچھ نادیدہ حدود کا پابند رکھا تھا۔ لیکن اس روز اس کی بیوی کے تیور بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔ محمد شفیق کو احساس ہونے لگا کہ معاملہ سنگین ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر وہی سنجیدگی طاری کر لی جو اس بات کا اشارہ ہوتی تھی کہ اس وقت وہ کوئی فضول بات سننا نہیں چاہتا۔

اس کی بیوی نے کہا..... ''یہ شہناز کون ہے؟''

ذہنی طور پر منتشر اور تھکن سے چُور محمد شفیق کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ''شہناز.....!'' اس نے کہا..... ''کون شہناز؟''

''یہ بھی تمھیں میں بتاؤں کہ کون شہناز.....؟'' اس کی بیوی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

محمد شفیق کے تمام اعصاب کسی جھٹکے سے بیدار ہو گئے۔ بدن میں لہو کے ساتھ ایڈرینالین دوڑنے لگی۔ وہ ایک ہوشیار، چوکنے جانور کی طرح خوفناک حملے کا دفاع کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ زندگی بھر اسے احترام سے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرنے والی بیوی بغاوت پر آمادہ نظر آتی تھی۔

''اگر تم مسز شہناز عارف کی بات کر رہی ہو۔'' محمد شفیق نے اپنی آواز دھیمی مگر مضبوط رکھی۔ ''تو وہ ایک لکھاری ہیں۔ ٹی وی ڈرامے لکھتی ہیں۔ ناول نگار ہیں مگر یہ کون سا طریقہ

ہے شوہر سے بات......''

''بھاڑ میں گیا طریقہ......'' اس کی بیوی نے کہا۔ ''اور اس کے ساتھ شوہر بھی۔ یہ بتاؤ کہ تم اس سے شادی کا پروگرام بنا رہے ہو......؟''

''کیا مطلب ہے اس بات کا؟'' محمد شفیق نے اپنی آواز ذرا سی بلند کی۔ بس، ذرا سی بلند۔ ٹی وی اشتہارات کے وائس اوور کی ریکارڈنگ کروانے والے فنکاروں سے اس نے یہ گُر سیکھا تھا۔ آواز کی پچ بہت بلند نہ ہو اور کھرج ذرا سی بڑھا دی جائے تو تاثر گہرا ہو جاتا ہے۔

بیوی نے ایک گہری سانس لی، یوں جیسے اچانک پھٹ پڑنے کی خواہش پر قابو پا رہی ہو۔ پھر اس نے کہا ''وہ یہاں آئی تھی، تمھاری مسز شہناز عارف۔''

محمد شفیق آواز کے زیر و بم کو استعمال کرنے کا سارا کھیل پل بھر میں بھول گیا۔ ''یہاں آئی تھی......!'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''مگر کیوں......؟'' ہزاروں ممکنہ مناظر خدشات بن کر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔

بیوی نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا ''کیونکہ تمھارا موبائل فون بند تھا۔ وہ تمھارے لیے پریشان تھی۔ وہ تمھیں فون کر رہی تھی۔ پھر اس نے دفتر سے گھر کا نمبر لیا اور مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا کہ وہ شہر سے باہر ہیں مگر وہ سوال پر سوال کرتی رہی۔ پھر ڈھونڈتی ڈھونڈتی وہ گھر آ پہنچی۔''

محمد شفیق نے دیکھا، بیوی بار بار مٹھیاں بھینچ رہی تھی، کھول رہی تھی۔ ''جو کچھ اس نے یہاں کہا، اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ وہی کیا، جس کی وہ مستحق تھی۔''

''کیا کیا تم نے......؟'' محمد شفیق نے غصے سے کہا۔ ''تمھارا دماغ تو خراب نہیں......؟''

''شادی تم کرنا چاہتے ہو اور دماغ میرا خراب ہے؟'' بیوی نے چلّا کر کہا۔ ''تم مجھے جانتے نہیں ہو محمد شفیق کیونکہ تم نے مجھے جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ میں وہ بھی ہوں جو تمھیں نظر آتی ہوں اور وہ بھی، جو نظر نہیں آتی۔ سمجھ رہے ہو؟ میں وہ ہوں، جس نے تمھارا یہ گھر بنایا۔ جس نے تمھیں آٹے دال، سبزی، گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رکھا۔ میں نے تمھیں گرم روٹی کھلائی اور تنگی میں گزارہ کیا اور تمھاری شوہرانہ رعونت کو ہمیشہ پیار سے تھپکی دی۔''

محمد شفیق کے کانوں کی لویں سرخ ہو چکی تھیں۔ یہ عورت، یہ معمولی استانی، نویں دسویں کی لڑکیوں کو میر، داغ اور علامہ اقبال کے شعروں کی انٹ شنٹ تشریح کروانے والی، ہر صبح چائے میں پاپے ڈبو کر کھانے والی عام سی عورت اس پر حاوی آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے مسلسل ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

''بند کرو یہ بکواس۔'' محمد شفیق نے گرج کر کہا۔

بیوی کے لیے جیسے اس کی گرجدار آواز کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ اس نے محمد شفیق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''تم پچیس برس کے نہیں ہو محمد شفیق، پچاس برس کے ہونے والے ہو۔ دو دو بچوں کی مائیں تمھیں انکل کہنے لگی ہیں۔ پچھلی بار تمھارا شوگر لیول بہت بلند اور کولیسٹرول بالکل سرحد پر تھا۔ تمھارے بال ڈائی کیے ہوئے ہیں مگر سامنے سے تم گنجے ہو چکے اور اپنا پیٹ دیکھا ہے تم نے؟ تمھارا خیال ہے کہ کوئی عورت تمھاری وجاہت سے اتنی متاثر ہو سکتی ہے کہ تم سے شادی کرنے کے لیے مچل جائے۔ تم سٹھیا گئے ہو۔ بڑھاپے میں شوق نے تمھیں اتنا اندھا کر دیا ہے کہ تم یہ بھی نہیں دیکھ سکتے کہ وہ عورت اپنے شوہر سے جان چھڑانے کے لیے تمھیں وقتی طور پر استعمال کر رہی ہے۔ تم ایک عارضی بندوبست ہو، ایک عبوری انتظام۔''

محمد شفیق نے اپنے چہرے پر غصے کے تاثرات برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہو۔ جیسے وہ کسی ویرانے میں بے بس پڑا ہوا ہے اور اس کے سینے پر سوار بیوی تیز دھار والے خنجر سے

پے در پے وار کر رہی ہو۔ غیر اہم دکھائی دینے والی بیوی۔ ہمی، بے آواز بیوی!

محمد شفیق کے دل پر پہلی بار خوف کسی سیاہ بادل کی طرح چھانے لگا۔ اس نے اپنے جسم و جاں کی پوری قوت استعمال کر کے بلند آواز میں کہا۔ ''تم پاگل ہو گئی ہو۔ مجھے اتنا غصہ نہ دلاؤ کہ میں کوئی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں۔''

''تم قدم اٹھاؤ گے......؟'' وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں ت بھری تھی۔ ''تم نہیں جانتے کہ جس دن میں نے کوئی دم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا، اس دن کیا ہوگا۔ تم اس عمر میں سارے دفتر کے سامنے اپنی بیوی کا ہنگامہ برداشت نہیں کر ۔ قانونی نوٹسوں کا سامنا نہیں کر سکتے جو خلع اور نان نفقے کے لیے تمھارے نام آئیں گے اور جن کی ایک ایک کاپی تمھارے ہر جاننے والے کو ملے گی۔ میں تمھیں برباد کر سکتی ہوں محمد شفیق، کیونکہ اس جنگ میں ہر شخص میرے ساتھ کھڑا ۔ اس احمق باپ کے ساتھ نہیں جو اپنی جوان ہوتی بیٹی کا ڈھونڈنے کے بجائے خود شادی کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہو م کچھ نہیں کر سکو گے۔ تم ایک بزدل، کم ہمت آدمی ہو۔ بے خواب دیکھنے والے۔ بے روزگار ہونے کے خوف سے ہی نوکری سے چمٹے رہنے والے۔ تخلیقی صلاحیتوں سے مال ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم کچھ ۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ تمھارے بغیر آرام سے زندگی سکتی ہوں، مگر تم...... تم اس اچھی بھلی زندگی کے بغیر ایک صفر رہ جاؤ گے۔ بے حیثیت، غیر اہم، صفر۔''

محمد شفیق کا رنگ زرد پڑ چکا تھا اور ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ کہے بغیر مڑا اور اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے وہ کچھ دیر تک تصور کرتا رہا کہ وہ کسی پرسکون ل کی سطح پر چھوٹی سی کشتی میں لیٹا ہوا ہے اور وہ کشتی ہلکی وں کی بدولت دھیرے دھیرے ڈول رہی ہے۔ پھر نہ کب وہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ باہر سے اس کی بیٹی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اسکول سے آ چکی تھی اور شاید اپنی ماں کو جوشیلے انداز میں کوئی واقعہ سنا رہی تھی۔ محمد شفیق نہا دھو کر باہر نکلا۔

بیٹی نے اسے دیکھتے ہی کہا: ''بابا! مڈٹرم امتحان میں دوسری پوزیشن آئی ہے میری۔''

''بہت خوب......'' محمد شفیق نے مسکرا کر اس کا ماتھا چوما۔

باورچی خانے سے بیوی کی آواز آئی۔ ''کھانا لگاؤ میز پر لیکن پہلے میز صاف کر لینا۔''

جتنی دیر میں کھانے کے برتن آئے، کھانا آیا، اس کی بیٹی اور پھر بیوی آئی، اتنی دیر محمد شفیق دائیں طرف کی کھڑکی سے نظر آنے والے جامن کے درخت کو دیکھتا رہا جس کی بڑی بڑی ٹہنیاں اکثر اپنے ہی وزن سے ٹوٹ جاتی تھیں۔

بیٹی نے کہا: ''اوہو...... آج تو بابا کے لیے اروی گوشت بنا ہے!''

''آرام سے کھانے دیا کرو بابا کو......'' بیوی نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تین دن پتا نہیں کیا کیا کھاتے رہے ہیں۔''

محمد شفیق نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ ہمیشہ جیسی ہی تھی، پرسکون، مدھم، نرم خو۔

''کھانا تو خیر مل جاتا تھا۔'' محمد شفیق نے کہا۔ ''فیکٹری میں ہی پکتا تھا وہاں لیکن مرچیں بہت ہوتی تھیں ہر کھانے میں۔''

''ایسا کھانا کھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔'' بیوی نے سر جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا۔

''تو کیا کرتا؟'' محمد شفیق نے کہا۔ ''تین دن فاقہ تو نہیں کر سکتا تھا۔''

''بابا کو دکھائی رپورٹ کارڈ؟'' بیوی نے بیٹی سے کہا۔

''ابھی کھانے کے بعد دکھاتی ہوں۔'' بیٹی مسکرائی۔

''انعام دینا پڑے گا بابا کو۔''

محمد شفیق اطمینان سے کھانا کھانے لگا۔

زبان پر انارکلی کا نام آتے ہی ذہن میں کئی قصے، کہانیاں اور افسانے گردش کرنے لگتے ہیں۔ تاریخ سے زیادہ ادب نے اس نام کو زندہ اور ذہنوں میں جاگزیں رکھا۔ یہ ایسی گتھی ہے جسے کوئی نہیں سلجھا سکتا۔

تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ انارکلی محض ایک افسانوی کردار ہے جس کا کبھی کوئی وجود نہ تھا تو دوسری جانب لاہور میں اسی انارکلی کی ۹x۲ فٹ قبر اور اس پر بنا شاندار مقبرہ اس خیال کو رد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں پنجاب آرکائیوز کے افسر تحقیق محمد عباس چغتائی کا کہنا ہے' برصغیر میں جس طرح دیگر امرا اور شہزادوں کی ناکام محبت والی کہانیاں بغیر کسی دستاویزی ثبوت اور تحقیق کے بیان کی جاتی ہیں' ایسی ہی کہانیوں میں سے ایک انارکلی کا قصہ ہے جسے شہزادہ سلیم سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

انارکلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک خوبصورت کنیز تھی اور شہنشاہ اکبر کے حرم میں شامل۔

اس کا اصل نام نادرہ بیگم یا شرف النساء تھا۔ اس کی خوبصورتی اور سرخی مائل رنگت کی بنا پر اکبر نے اسے انارکلی کے خطاب سے نوازا۔ اس کے والد کا نام اعجاز تھا جو تجارت کرتا تھا۔ ہندوستان جاتے ہوئے جب وہ کابل سے گزرا تو اس کی ڈاکوؤں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی جس میں وہ جاں بحق ہو گیا۔

معلومات

ایسے میں کابل کے گورنر راجا مان سنگھ نے نادرہ بیگم کو ڈاکوؤں سے چھڑا کر اکبر کے دربار میں بھجوا دیا۔ اپنی خوبصورتی کے باعث یہ بادشاہ کی منظورِ نظر کنیزوں میں شامل ہو گئی۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اکبر کی جے پوری مہارانی نے اس کا رقص دیکھا تو اسے ''انارکلی'' کا خطاب دیا۔

یہ دور وہ تھا جب شہزادہ سلیم تخت کا وارث تھا اور تمام کنیزیں اس کے قریب ہونا چاہتی تھیں لیکن روایت ہے کہ خوبرو سلیم انارکلی پر فریفتہ ہو گیا۔ حرم کی دوسری کنیزیں اس بات سے بہت حسد کرتی تھیں۔ ایک رات جب قطعہ لاہور کے شیش محل میں محفل موسیقی برپا تھی اور شہنشاہ اکبر اپنے تمام درباریوں سمیت موجود تھا تو انارکلی نے شہزادے کو مسکرا مسکرا کر اشارے کیے۔ اس بات پر بادشاہ اکبر غضب ناک ہو گیا اور اسی جرم کی پاداش میں اسے اینٹوں کی دیوار میں چنوا دیا گیا۔ اس سازش کے پس پردہ دوسری کنیزوں کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔

یہ تو تھی سیدھی سادی عام سی کہانی مگر اس میں پراگندگی اور بازاری پن فرانس کے ایک سیاح ولیم فنچ نے پیدا کیا۔ فنچ

اس علاقے میں ۱۶۱۱ء میں اس وقت آیا جب انارکلی کی موت کو صرف بارہ سال گزرے تھے۔ وہ شہزادہ سلیم اور انارکلی کی ناکام محبت کا افسانہ یوں گھڑتا ہے کہ انارکلی اکبر کی داشتہ اور رقاصہ تھی اور اکبر کا بیٹا دانیال اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔

دوسری جانب شہزادہ سلیم اپنی سوتیلی ماں کے متعلق دل میں میل رکھتا تھا۔ جب اکبر کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے غصے میں آ کر اپنی بیوی کو دیوار میں چنوا دیا جس پر بعد میں جہانگیر نے بادشاہ بنتے ہی بطور ثبوت محبت ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کروا ڈالا۔

بعد ازاں ۱۶۲۶ء میں ایڈورڈ ٹیری اور ہربرٹ نامی سیاح بھی ہندوستان آئے۔ ہربرٹ نے بھی فنچ کے قصے کو دہرایا کہ شہزادہ سلیم اپنی سوتیلی والدہ پر فریفتہ تھا۔ جب اکبر کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے شہزادے کو مکے مارے اور برا بھلا کہا۔ شہزادے نے تو معافی مانگ کر جان کی امان پائی لیکن انارکلی اس کے عتاب سے نہ بچ سکی اور اسے دیوار میں زندہ گاڑ دیا گیا۔

کم و بیش سبھی مورخین اس بات سے متفق ہیں کہ فنچ، ہربرٹ اور ٹیری کے قصے لغو، بے ہودہ اور بے بنیاد ہیں۔ اول تو مغل تاریخ میں کہیں بھی اس قسم کے کسی واقعے کا اشارہ نہیں ملتا۔ عہد اکبری کے مورخین اور بعد ازاں جہانگیری دور کے مورخین جو سچ لکھنے میں ذرا بھی نہ چوکتے اور ان میں سے بعض ان بادشاہوں کے مخالف بھی تھے لیکن انہوں نے ایسے کسی واقعے کا خفیہ اشارہ بھی نہیں کیا چہ جائیکہ وہ اس انسانیت سوز واقعے پر مہر بلب رہتے جس میں ایک بے گناہ کو زندہ، دیوار میں گاڑ دیا گیا۔

دوسری بات یہ کہ ۱۵۹۹ء جو انارکلی کی وفات کا سال ہے، اس سال اکبر دکن کی مہمات پر اور جہانگیر رانائے چتوڑ کی مہم پر تھا۔ اسی دوران جہانگیر کی بغاوت اور الٰہ آباد پر قبضے کا واقعہ سامنے آیا۔ ایسے میں دونوں باپ بیٹا عرصہ تک ایک دوسرے سے مل ہی نہ پائے۔ مزید برآں جس شیش محل میں انارکلی کے اشارے کنایوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے' وہ اس زمانے میں موجود ہی نہیں تھا۔ اس کی تعمیر ۳۲-۱۶۳۱ء میں شاہ جہاں نے کروائی تھی۔ پھر یہ کہنا کہ اس کا مقبرہ قلعے میں تھا' سفید جھوٹ ہے کیونکہ یہ مقبرہ تو قلعے سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔

اب تک کی کھدائیوں اور تحقیق سے مقبرے میں کوئی دیوار یا اس کے آثار بھی نہیں ملے۔ کچھ افسانہ طراز کہتے ہیں کہ شیش محل کے واقعے کے بعد اکبر بہت سیخ پا ہوا تھا لیکن انارکلی کی ماں نے اپنے پرانے احسانات کا واسطہ دے کر جو اس کے خاوند نے شہنشاہ ہمایوں پر کیے تھے' اپنی بیٹی کی جان بخشی کروائی۔ اکبر نے انارکلی کو زندان سے فرار ہونے کا موقع دے دیا تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں ماں بیٹی اچھرہ کے مقام پر موجود جنگلات میں روپوش رہیں۔ تاہم اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر سے انارکلی کی ملاقات ہوئی۔ اس کی وفات پر بعد ازاں انارکلی کا مقبرہ جہانگیر نے محبت کے اظہار کے طور پر بنوایا۔ یوں انارکلی یہاں دیوار میں چنی نہیں گئی بلکہ دفن ہے۔

یہ کہانی بھی بڑی عجیب اور تضادات سے بھری ہوئی ہے اسی لیے مورخین اسے بھی محض خیالی قصہ قرار دیتے ہیں۔ گویا اب تک کی تحقیق اور مطالعے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انارکلی کا قصہ محض لوگوں کی ذہنی اختراع ہے جسے زیب داستان کے لیے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا گیا ہے۔

کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ انارکلی ایک کنیز ضرور تھی اور اسے شاہی حرم میں اہم مقام حاصل بھی تھا تاہم شہزادہ سلیم کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اکبر جب دکن کی مہمات پر تھا تو انارکلی کسی مرض کی وجہ سے وفات پا گئی۔ اس کی موت پر دو خدمت گزار کنیزوں نے اس خوف سے خودکشی کر لی کہ بادشاہ ناراض ہو گا اور انارکلی کی موت کو ان کی خدمت میں کمی پر منتج کرے گا۔

پہلے انارکلی کی قبر عام سی تھی لیکن بعد میں اکبر نے اس پر مقبرہ تعمیر کروایا۔ یہ روایت بھی غلطیوں سے پُر ہے اور مقبرے

کے انداز تعمیر نیز پتھر پر لکھے الفاظ اس روایت کی نفی کرتے ہیں بیشتر مورخین کا کہنا ہے کہ یہ قصہ انگریزوں نے مغلوں کو بدنام کرنے کے لیے گھڑا تھا بلکہ یہ تک کہا جاتا ہے کہ قبر کا پتھر بھی ممکن ہے انگریزوں نے سازش کے تحت تیار کروایا ہو۔ قبر کے سنگی پتھر پر فارسی شعر درج ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: آہ! اگر میں اپنے محبوب کا چہرہ ایک مرتبہ اور دیکھ سکتا تو قیامت تک خدا کا شکر ادا کرتا رہتا۔

علاوہ ازیں تعویز پر قبر بنوانے والے کا نام ''مجنوں سلیم اکبر'' کندہ ہے۔ مقبرے کی تعمیر کی ابتدا اور تکمیل کی تاریخیں بھی درج ہیں۔ تاہم مقبرے کی عمارت یا قبر کے تعویز میں کہیں بھی مدفون شخصیت کا نام تحریر نہیں۔ یہاں یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ جہانگیر نے خود کو یہاں سلیم اکبر کے نام سے کیوں متعارف کروایا جب کہ وہ اس وقت ہندوستان کا شہنشاہ اور اپنے مکمل نام نورالدین محمد جہانگیر پاشاغازی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ان باتوں نے ہی انارکلی کی ذات اور جہانگیر کے ساتھ منسوب اس کے رومان کو مشکوک بنا دیا ہے۔

یہ بات طے کر لینے کے بعد کہ انارکلی فرضی کردار ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پنجاب سول سیکرٹریٹ میں پرشکوہ مقبرہ کس کا ہے؟ اگر ولیم فنچ کی کہانی کو دیکھیں تو یہ مقبرہ دانیال کی ماں اور اکبر کی بیوی کا بتایا جاتا ہے۔ تاہم مولانا علم الدین سالک، ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر ایم اے چغتائی کی تحقیق کے مطابق یہ مقبرہ شہنشاہ جہانگیر کی بیگم صاحب جمال کا ہو سکتا ہے جو ۱۵۹۸ء کو لاہور میں فوت ہوئی تھی۔ بہرحال مقبرے میں کوئی بھی شخصیت دفن ہو لیکن یہ بات طے ہے کہ یہاں کوئی شاہی ہستی ہی آسودہ خاک ہے۔

غیر ملکی سیاحوں ژاکو ماں پرنس، میسن اور ہیوگل نے بھی اپنے سفرناموں میں اس عمارت کو مغلیہ مقبرہ قرار دیا ہے۔ مغل دور میں مقبرہ انارکلی کے گرد وسیع باغات اور خوبصورت عمارات تھیں۔ دارشکوہ اپنی تصنیف سکینۃ الاولیا میں لکھتا ہے کہ حضرت میاں میر باغ انارکلی کے اس گنبد میں جایا کرتے تھے جو جنوبی دیوار کے کونے میں ہے۔ دارا شکوہ قدیم مصنفوں میں پہلا مصنف ہے جس نے انارکلی کا نام پہلی بار تحریر کیا۔ مغلوں کے ابتدائی عہد کے مقابر میں انارکلی کے مقبرے کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کی عمارت کبھی بہت شاندار ہو گی بلکہ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ بہت حد تک تاج محل سے ملتی جلتی عمارت ہے۔

اس کا گنبد دو منزلہ ہے۔ عمارت ہشت پہلو ہے۔ ہر کونے پر خوبصورت برجیاں موجود ہیں۔ مقبرے کا اندرونی قطر ۷۵ فٹ ہے۔ گنبد دوہرا ہے اور اس کے اندر جانے کے لیے باقاعدہ راستہ ہے۔ گنبد میں چار کھڑکیاں بھی ہیں۔ مقبرے سے متصل وسیع و عریض باغات اور دیگر عمارات بھی ہوں گی۔ چوبرجی سے مقبرہ انارکلی تک کوئی دوسری عمارت نہ تھی۔ البتہ دریائے راوی مقبرے کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ مقبرے سے متصل عمارتیں ختم ہونے لگیں اور باغات اجڑنے لگے۔ سکھ عہد میں اس کے باغیچے تباہ کر دیے گئے۔ رنجیت سنگھ نے اس کا سنگ مرمر والا چبوترہ اتروا لیا۔ صرف قبر کا تعویز چھوڑ دیا کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام کندہ ہیں لہٰذا رنجیت سنگھ نے اسے اپنے لیے بے مصرف تصور کیا۔ اسی طرح کا تعویز مقبرہ آصف جاہ اور مقبرہ جہانگیر کا ہے۔ یہ تعویز سکھوں نے بے کار تصور کرتے ہوئے انہیں نقصان نہیں پہنچایا (یہ بذات خود اللہ تعالیٰ کے ناموں کا اعجاز ہے) سکھوں نے ان عمارتوں کی اینٹیں نکال کر فروخت کر دیں۔ رنجیت سنگھ کے بیٹے کھڑک سنگھ کی ولی عہدی کا جشن کئی روز تک اسی انارکلی باغ میں منایا جاتا رہا۔

۱۷۸۰ء میں ایک سکھ سردار سوبھا سنگھ نے مقبرے کو پولیس چوکی کے طور پر استعمال کیا۔ بعدازاں کھڑک سنگھ نے یہاں رہائش اختیار کر لی۔ کھڑک سنگھ کی ماں مہارانی نکائن کی لاش کو بھی اسی باغ میں نذر آتش کیا گیا۔ اس کی سمادھی بھی

مقبرے سے متصل تھی۔ اٹلی کا ایک نامی گرامی جرنیل ونتورہ نپولین کی شکست کے بعد ۱۸۲۲ء میں ہندوستان پہنچا اور رنجیت سنگھ کی فوج کو تربیت دینے لگا۔ اس کے علاوہ فرانس کا ایک معروف فوجی افسر جنرل الارڈ بھی ونتورہ کے مشورے سے سکھ دربار میں پہنچا اور اپنی خدمات انجام دینے لگا۔ ان دونوں جنرلوں کو مقبرہ انارکلی میں رہائش مہیا کی گئی۔

بعدازاں ونتورہ تو مقبرے کے مقابل ایک عمارت بنا کر رہنے لگا۔ اس عمارت میں اب پنجاب کے چیف سیکرٹری کا دفتر ہے جب کہ جنرل الارڈ مقبرے میں ہی قیام پذیر رہا۔ اس نے قبر کا تعویز اپنی جگہ سے اٹھوا کر ایک بغلی محراب میں رکھوا دیا۔ لوگوں نے اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا کہ وہ قبر کی بے حرمتی نہ کرے لیکن وہ نہیں مانا۔ بلکہ اس مسئلہ پر جنرل الارڈ رنجیت سنگھ اور اس کے وزیر حکیم فقیر عزیز الدین کے درمیان بات چیت بھی ہوئی لیکن الارڈ اپنی ضد پر قائم رہا۔

اسی اثنا میں الارڈ کی اکلوتی بیٹی میری شارلوچل بسی۔ اس واقعے سے الارڈ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے نہ صرف جلد اپنی رہائش بدل لی بلکہ ہر جمعرات کو قبر عرق سے دھلوانے لگا۔ الارڈ کی بیگم اور ملازم ۱۸۴۹ء تک یہاں مقیم رہے۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ جون ۱۸۵۱ء میں مقبرہ انارکلی کو گرجے میں بدل کر اسے سینٹ جیمز چرچ کا نام دیا گیا اور اس کے گرد خاردار تار لگا دی گئی۔

گرجا بنانے کے متعلق مسلمانوں کو اطلاع ایک مسلمان معمار محمد حسین نے دی جس کا تعلق نواں کوٹ سے تھا۔ یہ سنتے ہی مسلمان ڈنڈے، پرچھیاں اور کلہاڑیاں لے کر چڑھ دوڑے۔ انگریز سامراج نے ان لوگوں پر بے دریغ گولیاں برسائیں جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ یوں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل انگریزوں کے خلاف لاہور میں مسلمانوں کی یہ پہلی خونی تحریک تھی۔ گرجے میں بدلنے کے بعد انگریزوں نے مقبرے میں کئی تبدیلیاں کیں۔ وہاں

مسلمانوں کی ضرورت پوری کرنا

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''مجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان دو نعمتوں میں سے کون سی نعمت سے نواز کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی یہ امید لگا کر میری طرف خلوص کے ساتھ آتا ہے کہ اس کی ضرورت مجھ سے پوری ہو گی اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں اس کی ضرورت آسانی سے پوری کروا دیتے ہیں۔ (اب یہ اس کا مجھ سے اپنی امید لگانا یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے یا میرا اس کی ضرورت کو پورا کرنا بڑی نعمت ہے) اور میں کسی مسلمان کی ایک ضرورت پوری کر دوں۔ یہ مجھے زمین بھر سونا چاندی ملنے سے زیادہ محبوب ہے۔''

سفیدی کروانے سے اس کے خوبصورت نقش و نگار ختم ہو گئے۔ مقبرے کے مرکزی گنبد پر سنگ سرخ کی دو فٹ اونچی صلیب نصب کی گئی۔ ۱۸۹۱ء میں یہاں سے گرجا ختم کر دیا گیا۔

روایت ہے کہ انگریزوں نے انارکلی کی لاش نکال کر اس جگہ دفن کر دی جہاں اس کا تعویز پڑا تھا کیونکہ قبر کی جگہ پر عیسائی عبادت نہیں کرتے۔ ۱۸۹۱ء میں مقبرے کو حکومت پنجاب کے ریکارڈ آفس میں بدل دیا گیا۔ بعض پرانے افراد اور عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر مقبرے کا تہہ خانہ تلاش کرنے کے لیے ۱۹۴۰ء میں کھدائی کی گئی۔ اس کا مقصد ہوائی حملوں کے خلاف پناہ گاہ تیار کرنا تھا۔ تاہم ۱۴ فٹ گہرائی تک کوئی تہہ خانہ نہیں ملا البتہ مقبرے کے وسط میں قبر کی جگہ کھدائی کرنے سے چونے کی بنی قبر ملی جو شمالاً جنوباً تھی۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ انگریزوں نے انارکلی کی لاش نہیں نکالی تھی اور قبر محفوظ ہے۔ اس سے یہ خیال بھی رد ہوا کہ انارکلی کو کسی دیوار میں چنوایا گیا تھا۔ مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں کی طرح تہہ خانے میں قبر اس لیے نہیں بنائی گئی کہ قریب ہی دریائے راوی بہتا تھا اور اس کو نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا۔

شہزادی کا معمہ

حفیظ جالندھری

انوکھی چال چل کر پرایا نگر فتح کرنے والے ایک زیرک و دانا بادشاہ کی ارمانوں بھری کہانی

جب عبدالرحمٰن نے تین معرکہ آرا حملوں کے بعد ہسپانیہ کو مطیع کرلیا تو عربوں کا ایک جرار لشکر ساتھ لیا اور بڑھ کر اشبیلیہ کے سامنے ڈیرے ڈال دیے جو شاہ سانکو کی بیٹی ملکہ کیتھرائن کے قبضے میں تھا۔

ملکہ کیتھرائن دعویٰ دار تھی کہ چونکہ گزشتہ پانچ سال سے میرا باپ بالکل خودمختار فرمانروا رہا ہے اور اُس نے مسلمانوں کو خراج ادا نہیں کیا، اِس لیے نہ تو میں خراج دوں گی نہ عبدالرحمٰن کی اطاعت و ماتحتی قبول کروں گی۔

بادشاہ نے رسد و رسائل کی روک تھام کے خیال سے شہر کا محاصرہ کرلیا اور کیتھرائن کے پاس پیغام بھیجا کہ اطاعت قبول کرلو، اگر ایسا نہ کرو گی تو اشبیلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی، شہر میں لوٹ مچے گی، قلعہ اس طرح تباہ برباد کردیا جائے گا کہ آنے والی نسلیں وہم و گمان میں بھی اس کا نام و نشان نہ ڈھونڈ سکیں گی۔

جس وقت کیتھرائن کے پاس پیغام پہنچا وہ اپنے منقش دریچے کے سامنے فروکش تھی۔ سنہری شعاعیں دریچے میں سے چھن چھن کر اس کے خوبصورت بالوں سے کھیل رہی تھیں۔

اس نے جواب دیا: ''بادشاہ سے کہہ دو کہ اگرچہ آپ بادشاہ ہیں مگر میرے حکمران نہیں۔ ہم سب مسلح ہیں۔ ہمارے پاس نامور بہادر موجود ہیں۔ یہ بھی بتا دو، ہمارے پاس خورونوش کا سامان اس قدر موجود ہے کہ آپ سارے ہسپانیہ میں سالہا سال تک جمع نہیں کرسکتے۔''

یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔ قاصدوں کے سردار نے مؤدب ہوکر عرض کیا: ''کیا یہی پیغام ہے؟''

''نہیں ابھی باقی ہے۔ بادشاہ سے کہہ دو کہ شاہ اشبیلیہ کی شہزادی قلعہ پر حکومت کرتی ہے۔''

قاصدوں کے سردار نے پھر مؤدب ہوکر پوچھا: ''کیا سارا پیغام یہی ہے؟''

کیتھرائن ایک لمحہ خاموش رہی اور پھر بولی: ''ابھی باقی ہے۔ بادشاہ سے کہہ دو کہ آپ کو شہر کی فصیل میں سے گزرنے سے پہلے قلعے پر قبضہ کرنا پڑے گا۔''

قاصدوں کا سردار ماتھا سکوڑ کر مسکراتا ہوا بولا: ''ملکۂ عالم گستاخی معاف! یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ قلعہ ایک اونچی چٹان پر واقع ہے۔ اس کے اِردگرد شہر بستا ہے اور شہر کے گرد فصیل ہے۔ بادشاہ شہر سے پہلے قلعے کو کس طرح فتح کرسکتا ہے؟''

کیتھرائن نے اپنی پلکیں اس طرح اُٹھائیں گویا وہ اس سوال پر خفگی کا اظہار کرسکتی ہے؟

''تم پیغام لائے ہو۔ تعمیل کرنے نہیں آئے۔'' قاصد کو عُذر پر آمادہ دیکھ کر وہ پھر بولی:

''سامنے سے چلے جاؤ اور جو کچھ اشبیلیہ کی شہزادی نے کہہ دیا ہے، اپنے بادشاہ سے کہہ دو۔''

قاصد عبدالرحمٰن کے پاس لوٹ آئے اور کیتھرائن کا پیغام گوش گزار کردیا۔ بادشاہ غضبناک ہوگیا۔ اس نے پیغام کے پہلے حصے کو زیادہ توجہ سے سنا اور آخری حصہ نظرانداز کردیا۔

اس نے اشبیلیہ پر تین دن تک حملہ جاری رکھا۔ کیتھرائن کے بہادروں نے مسلمان مجاہدوں کا پُرزور مقابلہ کیا، جس سے عبدالرحمٰن کے لشکر کو بے حد نقصان پہنچا۔ بہادران اشبیلیہ کے حوصلے بڑھ گئے۔

وہ شہزادی کے جواب سے پورے مطمئن تھے۔ جانتے تھے کہ جو پیغام اشبیلیہ کی ملکہ نے دیا ہے، بالکل درست ہے۔ وہ اس کے باپ کے نمک خوار تھے اس لیے جاں نثاری کرنے کو اپنا ایمان جانتے تھے۔

جب تین روز کا متواتر حملہ ناکام ثابت ہوا، تو بادشاہ اپنی فوجوں کو شہر پناہ کے اور زیادہ قریب لے آیا اور تین ماہ تک خاموشی سے محاصرہ کیے پڑا رہا۔ اس نے کیتھرائن کے پاس دوبارہ پیغام بھیجا کہ یاد رکھو، میں اپنے عہدِ حکومت کا نصف حصہ اس تسخیر پر صرف کرڈالوں گا۔ اگر اب بھی تم اطاعت قبول کرلو تو علاوہ دوسری مہربانیوں کے تمام املاک تمہیں واپس کردیے جائیں گے اور اگر اسی ضد میں اڑی رہیں تو.....

کیتھرائن نے جواب دیا: ''بادشاہ سے کہہ دو کہ آپ قلعے پر فتح حاصل کیے بغیر شہر کے اندر داخل نہیں ہوسکتے۔'' اس جواب کے علاوہ قاصدوں کو اور کوئی جواب نہ ملا۔

مکرر یہی جواب سن کر بادشاہ کے غصّے کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ ہونٹ چبا کر بولا: ''اس کے بہادروں پر خدا کی لعنت ہو۔'' اس نے پھر قاصد سے سوال کیا۔ ''کیا اس ضدی شہزادی کے ہوش و حواس درست ہیں؟''

قاصد نے مؤدبانہ عرض کی: ''جہاں پناہ! بالکل درست ہیں۔ اگرچہ عالی جاہ اس کے ساتھ شریفانہ برتاؤ رکھتے ہیں، لیکن اس قسم کا جواب کسی عورت سے غیر متوقع ہے۔''

بادشاہ نے قاصد سے کہا: ''مابدولت تم سے اس معمے پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے۔ رخصت ہو جاؤ اور دوسرے ملاقاتیوں کو آنے دو۔''

دوسرے ملاقاتیوں سے مل لینے کے بعد بادشاہ نے تنہائی میں اس معمے پر غور کرنا شروع کیا لیکن وہ اسے حل کرنے میں ناکام رہا حتیٰ کہ اس کا دماغ درد کرنے لگا۔ اب اس کے غصّے کی کوئی حد نہ تھی۔

اس نے پھر جارحانہ اقدام کا حکم دیا مگر پیشتر کی طرح اب بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بادشاہ نے تیسری بار قاصد کو بھیجا مگر کیتھرائن نے پھر وہی جواب دیا، جو پہلے دے چکی تھی۔

بادشاہ جھنجھلا کر بولا: ''یہ کام جنّات کی فوج کے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا۔'' وہ کھسیانا ہو رہا تھا۔ اگر اسے یہ خیال نہ ہوتا کہ یہ ناکامی اسے اپنی رعایا کے سامنے حقیر اور فوج کے سامنے بزدل ثابت کردے گی تو وہ شہر اشبیلیہ پر قبضہ کیے بغیر واپس لوٹ جاتا۔ وہ گومگو کی حالت میں پڑا ہوا تھا کیونکہ واپس لوٹنے میں بدنامی کا خوف تھا تو دوسری طرف ایک لشکرِ جرار کی سلامتی اور مقام کی نزاکت کا بوجھ ناقابلِ برداشت بن رہا تھا۔

طرّہ یہ کہ قلعہ کی فوج رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ شہزادی کے سپاہی کھانا کھا چکنے کے بعد ہڈیاں محاصرین پر پھینک دیتے تھے اگرچہ قلعے والوں کے لیے یہ طرزِ عمل مسرت بخش تھا مگر اس سے محاصرہ کرنے والے بہادروں کی سخت توہین ہوتی تھی۔

اس دوران میں شہزادی کیتھرائن اپنے منقش دریچے کے سامنے اپنے مصاحبوں اور سہیلیوں کے ساتھ فروکش ہوتی،

سورج کی زرّیں کرنیں اس کے بالوں سے اٹکھیلیاں کرتیں۔ وہ کبھی مسکراتی، کبھی آہیں بھرتی شاید اسے یہ فکر لاحق ہوگئی تھی کہ بادشاہ کا آئندہ طرزِ عمل کیا ہوگا یا وہ میرے معمہ کو کب سمجھے گا۔

بادشاہ کی فوج میں ایک شخص غازان نامی پر ہیز گاری، بہادری اور خوش طبعی میں بہت مشہور و معروف تھا۔ وہ بہادر تھا اور بزم آرا بھی۔ ان ہی کمالات نے اسے بادشاہ کا قرب حاصل کرنے میں بہت مدد دی تھی۔

شہزادی کیتھرائن کا پیغام غازان نے بھی سن لیا تھا۔ شام کی نماز کے بعد جب عرب سپاہی اپنے خیموں کے آگے آگ جلا کر بیٹھتے تو اکثر اس معاملے پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ غازان سب کی باتیں سنتا اور ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ وہ دانشمندانہ انداز سے سر ہلا دیا کرتا اور اپنی زبان بند رکھتا۔ کسی فرد بشر نے اسے ملکہ کیتھرائن کے معمے کے متعلق بات چیت کرتے نہیں سنا تھا لیکن اس کا ذاتی عقیدہ یہ تھا کہ شہزادی کا پیغام جنگجویانہ نہیں بلکہ صلح جویانہ ہے۔

ایک شام بادشاہ اپنی بارگاہ میں اس معمے کو حل کرنے سے تنگ آ کر کشمکش و پیچ کی حالت میں بیٹھا تھا کہ خیمے کا پردہ اُٹھا اور غازان اندر داخل ہوا۔

بادشاہ بول اُٹھا: ''ہم نے تمہیں نہیں بلایا۔''

غازان آداب بجالایا اور عرض پیرا ہوا ''اگرچہ جہاں پناہ نے مجھے یاد نہیں فرمایا مگر میں بن بلائے حاضر ہوگیا ہوں۔''

بادشاہ خود چاہتا تھا کہ اپنے خیالات کی اُلجھنوں سے آزاد ہو کر کسی سے بات چیت میں دل بہلائے اس لیے مسکراتے ہوئے گویا ہوا ''غازان آؤ' دیکھو ہم نے کتنی بڑی آفت مول لی ہے۔''

بادشاہ نے شربت کا ایک جام غازان کی طرف بڑھایا اور کہا: ''آؤ اس خوشگوار دعوت میں شرکت کرو۔''

اس شاہی اشارے پر غازان پردہ درست کر کے اندر داخل ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا: ''صرف یہی ایک چھوٹی سی ریاست ہماری مملکت سے باہر رہ گئی ہے۔ کیا اشبیلیہ ہی کیتھرائن کا ملجا و ماوا ہے۔''

غازان بولا: ''یقیناً۔''

بادشاہ نے کہا: ''اللہ قادر و قدیر ہے۔ غازان' اس شہر پر اسلامی قبضہ رہ چکا ہے اور قانوناً یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے لیکن ہمارے حملے کے باوجود اب تک اس پر قبضہ نہیں ہوا!''

غازان نے ادب کے ساتھ جواب دیا: ''ظل اللہ میں حضور کو اس امر کے لیے ملامت کرنے نہیں آیا کہ اب تک حضور کا اس پر قبضہ کیوں نہیں ہوا بلکہ یہ بتانے آیا ہوں کہ عالی جاہ اس پر کیونکر قبضہ کر سکتے ہیں۔''

اب وہ اپنی عبا کو اپنے گرد لپیٹتا ہوا خیمے کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور بولا: ''کیا میں عالی جاہ سے ایک سوال پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟''

بادشاہ مطمئن ہو کر تخت پر بیٹھ گیا اور بولا: ''ہاں غازان میں تمہاری بات نہایت غور سے سنوں گا اور اس کا جواب دوں گا۔''

غازان نے پوچھا: ''جہاں پناہ فوج کا قلعہ کیا ہوتا ہے؟''

بادشاہ نے جواب دیا ''فوج کا قلعہ! فوج کا قلعہ کیسا۔ شہر کا قلعہ کہو جو اینٹوں پتھروں کا بنا ہوا بلند جگہ پر واقع ہوتا ہے مگر فوج خیموں میں یا چٹیل میدان میں ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ' فوج کا قلعہ کیا! کیا تمہارا سوال حل ہو گیا؟''

غازان نے دوبارہ پوچھا: ''عالی جاہ فوج کا قلعہ بتایئے۔''

بادشاہ نے دوسری مرتبہ جواب دیا: ''فوج کا کوئی قلعہ نہیں ہوتا۔ اینٹوں پتھروں سے بنے ہوئے شہر کا قلعہ ہوتا ہے مگر فوج اینٹوں پتھروں کی نہیں ہوتی۔ اس میں آدمی بھرتی کیے جاتے ہیں، ان کے گوشت سے' ہڈیوں' بازوؤں' دماغوں سے اور ان کے دلوں سے ریاست محفوظ رہتی ہے۔ الٰہی فوج کا قلعہ کیا معنی۔ کیا اب بھی تمہارا سوال حل نہیں ہوا؟''

غازان نے نفی میں سر ہلایا اور تیسری مرتبہ پوچھا: ''جہاں

پناہ گستاخی معاف! میں پھر وہی سوال کروں گا۔ مجھے بتایئے، فوج کا قلعہ کیا ہوتا ہے؟''

بادشاہ کو احساس ہونے لگا کہ بات معنی خیز ہے۔ اب اس نے سوچنا شروع کیا اور کئی ساعت خیالات کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن رہا۔ غازان بھی بے حس و حرکت بادشاہ کے چہرے پر نظریں گاڑے خیمے کے وسط میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ آخر بادشاہ نے سر اُٹھایا اور جواب دیا:

''فوج کا قلعہ وہ مضبوط دل ہے، جو فوج پر حکومت کرتا ہے۔ الٰہی تو کیا اُس کا دل بھی قلعہ ہے!''

یہ کہہ کر بادشاہ نے غازان کی طرف دیکھا۔ گویا وہ کہہ رہا تھا: ''کیا تمہارا سوال حل ہو گیا؟''

غازان بولا: ''ہاں جہاں پناہ! آپ نے بالکل صحیح حل بتا دیا ہے۔''

اتنا کہہ کر غازان مُڑا اور چپ چاپ خیمے سے باہر جانے لگا مگر بادشاہ نے اس کا دامن پکڑ لیا اور چلّا کر کہا ''غازان! جس طرح شہر کا قلعہ مضبوط ہوتا ہے اسی طرح فوج پر حکومت کرنے والا قلعہ بھی مضبوط ہوتا ہے۔ مجھے شہر کی دیواروں سے گزرنے سے پہلے قلعہ فتح کرنا چاہیے۔''

☆☆

ملکہ کیتھرائن اپنے وسیع ہال میں منقش دریچے کے نیچے مسند پر بیٹھی تھی۔ مصاحب اور سہیلیاں حاضر تھیں اور ایک افسر کسی قیدی کو اندر لانے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

اجازت مل گئی اور قیدی پیش کر دیا گیا۔ یہ قیدی جوان بلکہ نہایت خوبصورت بانکا اور رعنا جوان تھا۔

وہ دو محافظوں کے درمیان کھڑا تھا مگر ایک آزاد ہستی کی طرح مغرور نظر آتا تھا۔ اس کے کالے بال، بڑی بڑی صاف اور روشن آنکھیں، فراخ شانے، چوڑی چھاتی، خوشنما مونچھیں، سیاہ اور تازہ وارد موئے خط ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ شاید یہ کیتھرائن کی آنکھوں کا قصور تھا کہ نوجوان قیدی ان زینوں سے ہو کر دل میں اُتر گیا۔

اس نے افسر سے دریافت کیا۔ ''تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟''

افسر نے جواب دیا ''ملکہ عالم! رات یہ جنوبی دروازے پر آیا اور چلّا رہا تھا کہ مجھے مسلمان بادشاہ کے عتاب سے بچاؤ۔''

کیتھرائن ناک بھوں چڑھا کر بولی: ''جب تو یہ غدّار ہے۔''

افسر نے عرض کیا۔ ''حضور ہمیں اس نے کچھ بتایا نہیں۔ صرف اس قدر کہا ہے کہ میں اپنی سرگزشت ملکہ کے گوش گزار کر دوں گا۔''

یہ سن کر کیتھرائن اپنی سہیلی سے مور کی پنکھیا لے چہرے کو چھپاتے ہوئے قیدی سے مخاطب ہوئی..... ''اپنا حال بیان کرو۔''

قیدی بولا: ''میں قیدی ہوں تو اپنی مرضی اور ارادے سے مگر کچھ واقعات ہی ایسے پیش آئے ہیں کہ مجھے حضور کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں تاہم میں غدّار نہیں اور اپنے بادشاہ کی خیر طلبی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔''

ملکہ کیتھرائن بولی: ''اچھا تو تمہاری یہ مرضی ہے کہ تمہارا بادشاہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر واپس لوٹ جائے۔''

کیتھرائن کے اس فقرے پر اس کے بہادر مسکرائے اور اس کی سہیلیوں نے قہقہہ لگایا۔

اجنبی نے اس رائے زنی اور قہقہوں کی کوئی پروانہ کی اور بولا: ''بادشاہ کے دل میں میری بے انتہا قدر تھی۔ میں بادشاہ کے بغیر اور وہ میرے بغیر کچھ نہیں تھا۔ وہ مجھے دانشمند اور مدبر خیال کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو واقعات ابھی تک ظہور میں بھی نہیں آئے مجھ پر روشن ہو جاتے ہیں اور وہ میری مدد سے ان تمام واقعات کے نتائج معلوم کر سکتا ہے۔ بادشاہ ہر مشکل معمہ میری مدد سے حل کر لیتا تھا۔ جن تین معرکوں میں وہ فتح یاب ہوا ہے، ان تینوں میں اس کے ساتھ میں تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے اشبیلیہ لے آیا، کیونکہ اسے میرے دانشمندانہ مشورہ اور طاقت

سے شہر پر قابض ہونے کا یقین تھا۔ میں خودستائی نہیں کر رہا' وہی بیان کر رہا ہوں جو بادشاہ نے لوگوں کے سامنے اور علیحدہ طور پر بار ہا ظاہر کیا۔''

کیتھرائن بولی: ''خیر ایک فرد کی رائے تمہارے متعلق اچھی ہے۔ بے شک میں بھی یہ سمجھتی ہوں۔''

اس پر سہیلیوں نے پھر قہقہہ لگایا اور بہادر مسکرائے مگر قیدی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ نہایت واضح طور پر اپنی داستان بیان کرتا رہا یہاں تک کہ اس کی مردانہ آواز نے ملکہ کیتھرائن کی سہیلیوں کو موہ لیا اور اب وہ دل ہی دل میں اس احساس سے شرمندہ ہونے لگیں کہ ہم نے ایک بہادر جوان کا تمسخر کیوں اُڑایا۔

جوان کہہ رہا تھا ''وہ دن بہت سخت تھا جب ملکہ کا پیغام بادشاہ کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ انسان شہر کی دیواروں سے قلعہ فتح کرنے کے بعد کس طرح گزر سکتا ہے؟ میں نے کہا یہ بات بالکل مہمل ہے۔ آپ اس بات کی پروانہ کریں۔ بادشاہ نے میری بات پر یقین کر کے شہر فصیل پر حملہ کر دیا۔ مجاہدینِ اسلام بے فائدہ تلوار کے گھاٹ اُتر گئے۔ دوبارہ آپ کا یہی جواب آیا۔ بادشاہ نے پھر مجھ سے پوچھا۔ میں نے پھر جواب دیا کہ یہ باتیں بالکل بے معنی ہیں آپ ان کی مطلق پروانہ کریں۔ اس نے میرے تدبر پر یقین کرتے ہوئے فصیلِ شہر پر پھر حملہ کیا اور بہادر بے نتیجہ مارے گئے۔

''تیسری مرتبہ آپ کا پھر وہی جواب آیا۔ بادشاہ نے پھر مجھ سے رائے طلب کی اور آپ کے معمے کا حل پوچھا مگر میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ بہادرانِ اسلام میری بے وقوفی کے سبب سے اپنی قیمتی جانیں گنوائیں۔ میں نے بادشاہ کے سامنے اس امر کا اعتراف کر لیا کہ میں اس معمے کو حل کرنے سے قاصر ہوں۔''

ملکہ کیتھرائن نے مور کے پروں والی پنکھیا سے آنکھیں اُٹھاتے ہوئے کہا: ''تمہیں عقل بہت گراں اور بہت دیر بعد ملی ہے۔''

جوان نے جواب دیا ''جب میں نے اپنی کم فہمی کا اقرار کر لیا تو بادشاہ قدرتی طور پر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا اگر تم نے اس مرتبہ معمے کا حل نہ بتایا تو تمہارے تمام کارناموں پر پانی پھر جائے گا۔ تمام حقوق زائل ہو جائیں گے۔ تمہیں ملک بدر کر دیا جائے گا۔ عزیزوں سے ملنے کی اجازت بھی نہ دی جائے گی بلکہ تمہاری زندگی کا بڑی ذلت کے ساتھ خاتمہ کر دیا جائے گا۔

''بادشاہ نے یہ تمام باتیں نہایت طیش کے عالم میں کہی تھیں۔ میں اس کے ڈر اور موت کی دھمکی سے رات کو چپ چاپ نکل آیا اور جنوبی دروازے پر آ کر اپنے آپ کو ملکہ کے سپاہیوں کے سپرد کر دیا۔''

کیتھرائن نے پوچھا ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''یا تو اس معمے کا حل بتا دیجیے تاکہ میں بادشاہ کے پاس لے جاؤں اور دوبارہ اس کی مہربانی حاصل کر سکوں.....''

کیتھرائن نے بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اگر مجھ سے یہ نہ ہو سکے تو.....''

''مجھے کچھ عرصہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں اپنی قوت سے اس معمے کو حل کر لوں۔''

بہادر مسکرائے اور نوجوان کی اس کمزور جسارت پر سرگوشیاں کرنے لگے مگر سہیلیوں پر جوان کی رعنائی اور شکل و شباہت نے بے حد اثر ڈال دیا تھا۔ انہوں نے آہ بھری۔ شاید ان کی اس بات سے رنج ہوا ہو کہ ایسا نوجوان اس قسم کی بے نتیجہ درخواست کا مرتکب کیوں ہو رہا ہے مگر ملکہ کیتھرائن خیالات کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو گئی اور جب اس نے آنکھیں اُٹھائیں تو اس کی آنکھیں جوان کی آنکھوں سے چار ہو گئیں۔ جوان کی آنکھیں پوری طرح اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

کیتھرائن کے خوبصورت چہرے پر ہلکی سُرخی رقص کرنے لگی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سرخ روشنی تھی جو منقش دریچے سے اس کے رُخِ روشن پر نچھاور ہو رہی تھی۔

اس نے کہا ''تم سات روز تک ٹھہر سکتے ہو۔ شرط یہ ہے کہ یہ عرصہ ختم ہو جانے پر میرے ملازم تمہیں بادشاہ کے پاس لے جائیں گے۔ اگر اس عرصے میں تم نے معمہ حل کر لیا تو تمہارے بلکہ بادشاہ کے لیے بھی بہت اچھی بات ہو گی اور اگر تم اسے حل کرنے سے قاصر رہے تو یہ تمہاری بدقسمتی ہو گی بلکہ شاید موت بھی اس سے بُری نہ ہو۔''

اجنبی نے مسکرا کر کہا ''میں یہاں ٹھہرنے کے لیے اس شرط کو منظور کرتا ہوں۔''

کیتھرائن نے اشارہ کیا کہ اسے یہاں سے لے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

سات دن اور راتیں اجنبی شہر میں قیام پذیر رہا۔ ہر روز وہ خلوت و جلوت میں کیتھرائن کے روبرو طلب کیا جاتا۔ وہ اکثر بادشاہ اور اس کی سلطنت کے متعلق گفتگو کیا کرتا تھا۔ کیتھرائن نے اس پر اپنی تمام دولت اور طاقت ظاہر کر دی۔ وہ ہر بار اس سے یہ دریافت کرتی۔ ''بتاؤ تم کون ہو؟''

ہر بار اجنبی بھی یہی جواب دیتا ''میں بادشاہ کے بغیر کچھ بھی نہیں۔''

ملکہ تجسس حال کے لیے اور بھی پریشان نظر آتی۔ وہ اپنے دل سے سوال کرتی۔ ''یہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے؟''

اس دوران میں بادشاہ کا لشکر چپ چاپ خیموں میں قیام پذیر رہا اور شہر پناہ پر کوئی حملہ نہ کیا۔

تیسرے روز کیتھرائن نے جوان سے پوچھا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ بادشاہ دوسری عظیم الشان سلطنتوں کو چھوڑ کر میرے چھوٹے سے خوبصورت شہر کے پیچھے کیوں پڑا ہے۔''

جوان نے جواب دیا۔ ''بادشاہ اپنی سلطنت بڑھانا چاہتا ہے۔ اس نے گزشتہ تین برس میں اپنے مقبوضہ علاقوں کے اندر امن و امان پیدا کر دیا ہے۔ صرف یہی شہر دوستوں میں دشمن، فرماں برداروں میں نافرماں بردار، طاقتوروں میں کمزور باقی رہ گیا ہے۔''

کیتھرائن نے تیوری چڑھا کر اس جواب کو سنا اور ایک ساعت کے بعد بولی۔ ''اگر بادشاہ مجھے تمہارے ان الفاظ سے مخاطب کر کے قاصدوں کو بھیجتا، تو ممکن تھا میں اس کا پیغام سن لیتی مگر مجھے تو اس نے صرف یہی حکم دیا کہ اطاعت قبول کر لوں۔''

اگلے روز کیتھرائن نے اسے پھر بلایا اور پوچھا ''اگر میں بادشاہ کی اطاعت قبول کر لوں تو کیا میں وہی کیتھرائن رہوں گی جو اشبیلیہ کی ملکہ ہے؟''

''بادشاہ کی نظروں میں آپ کا درجہ اور بھی بلند ہو جائے گا۔ وہ آپ سے محبت کرنے لگے گا۔''

کیتھرائن خفا ہو گئی۔ ''میں اس کی محبت کی بھوکی نہیں ہوں۔''

جوان نے نہایت نرمی سے کہا ''آپ نہیں جانتیں محبت کیا ہوتی ہے؟ آپ بادشاہ کی محبت کو نہیں جانتیں۔''

پانچویں روز ملکہ نے جوان کو خلوت میں بلایا اور پوچھا: ''اگر میں اپنے آپ کو بادشاہ کے حوالے کر دوں، اس کی اطاعت منظور کر لوں اور شہر میں اسی طرح امن پھیل جائے جو میرے باپ کے زمانے میں تھا تو بادشاہ کیا کرے گا؟''

''وہ سلطنت کو خوشحال اور امن کی دولت سے مالا مال کر دے گا۔''

''تو پھر تم کیا کرو گے؟''

اجنبی بولا: ''میں بادشاہ کے ساتھ رہوں گا اور اس کو ضرورت کے وقت مشورہ دیا کروں گا۔''

کیتھرائن نے پوچھا: ''کیا وہ تمہیں اور زیادہ عزت بخشے گا؟''

جوان نے کہا: ''اگر اس معمے کو حل کر لوں تو میری عزت ہی عزت ہے۔''

''تو کیا تم نے ابھی تک اس کو حل نہیں کیا؟''

''میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس کا حل آپ کی آنکھوں میں پڑھ لوں۔''

کیتھرائن نے اس ڈر سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا کہ کہیں وہ آنکھوں سے معمے کا حل معلوم نہ کر لے۔

ساتویں روز رات کے وقت ملکہ نے اجنبی کو علیحدہ بلایا تاکہ سہیلیوں اور بہادروں کو کچھ بھی پتا نہ چل سکے۔

وہ ایک وسیع ہال میں بیٹھی تھی۔ دھیمی دھیمی روشنی ہو رہی تھی جس میں صرف اس کا خوبصورت چہرہ، سیاہ بال اور شاہانہ لباس کی چمک نظر آتی تھی۔

جوان آیا اور اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

کیتھرائن نے کہا ''میں کل صبح تمہارے قول کے مطابق تمہیں بادشاہ کے پاس پہنچا دوں گی۔ بتاؤ تم اس کی خدمت میں کون سا تحفہ پیش کرنے جا رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا ''میرے پاس قلعے کی کنجیاں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔''

گہرا سکوت چھا گیا۔ وسیع ہال بالکل چپ تھا۔ اجنبی جوان کیتھرائن کے بالکل قریب آ گیا اور اس کی مسند کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے کہا ''ملکہ خدا حافظ۔''

ملکہ نے اس کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز سے کہا۔ ''خدا حافظ۔''

اجنبی بولا: ''ہم دوبارہ ملیں گے۔'' ملکہ حیران نہ ہوئی بلکہ اس نے جوان کے چہرے پر نظر جما کر پوچھا: ''کب؟''

''کل قلعے کی دیواروں سے باہر۔''

''قلعے کی دیواروں سے باہر!''

''ہاں'' کہہ کر جوان جھکا اور ملکہ کے مرتعش ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے بولا:

''فوج کا قلعہ ملکہ کا دل ہے۔''

ملکہ جیسے خواب سے چونک اُٹھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اجنبی نوجوان نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ایک طویل نظر ڈالتے ہوئے اسے منقش دریچے میں چھوڑ کر چلا گیا جہاں صرف چاندنی کی نورانی شعاعیں اس کے خوبصورت بالوں سے کھیلتی رہ گئیں۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے اسی طرح وہاں بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں دریچے پر لگی ہوئی تھیں جس میں سے وہ گزر گیا تھا۔

اس نے آہستہ سے کہا: ''میرا دل اپنے مالک کو پہچانتا ہے۔ تو کیا میں بادشاہ کے ساتھ سرگرم کلام تھی!''

☆☆

عبدالرحمٰن جسے سلطنت کے بعض ضروری کاموں کے سبب لشکر سے باہر جانا پڑا تھا' واپس آ گیا اور دوبارہ لشکر کی کمان سنبھال لی۔ اس نے اپنی فوج کو اپنے ساتھ اشبیلیہ کے جنوبی دروازے کے پاس فصیل کے بالکل قریب چلنے کا حکم دیا۔ ایک بوڑھے سپاہی نے غازان سے پوچھا: ''کیا ہم تیسرا حملہ کرنے جا رہے ہیں۔''

غازان نے جواب دیا: ''نہیں۔ بادشاہ دیواروں سے نہیں ٹکرائے گا وہ سیدھا قلعے پر قبضہ کرے گا۔'' اردگرد کے سپاہی ہنسنے لگے۔ وہ سمجھے غازان بادشاہ کا مذاق اُڑا رہا ہے!

سہ پہر کے وقت بادشاہ اپنے بیش قیمت لباس میں ایک سیاہ عربی گھوڑے پر سوار آگے بڑھا۔ جب فصیل دو سو گز کے فاصلے پر رہ گئی تو وہ گھوڑے سے اُتر کھڑا ہوا۔ فوج کو بھی اُترنا پڑا۔ اب اس نے ایک قاصد کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ فصیلوں پر ملکہ کے جانثار مقابلے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ قاصد نے بادشاہ کے حکم کے مطابق فصیلوں کے قریب جا کر پکار کر کہا ''بادشاہ ملکہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔''

اس پیغام سے قلعے کی دیواروں کے اندر شور مچ گیا مگر بادشاہ چپ چاپ اپنے مشکی گھوڑے کی باگ پکڑے شان و وقار کے ساتھ متمکن تھا۔

کوئی دو ساعت کے بعد شہر کا دروازہ کھلا اور ملکہ کیتھرائن سہیلیوں اور بہادروں کے ساتھ شاہانہ لباس پہنے نقاب چہرے پر ڈالے پالکی میں سوار آموجود ہوئی۔

بوڑھے سپاہی نے اس فکر میں کہ شاید اب ہمیں شہر پر حملہ کرنے کا موقع نہ ملے گا' غازان سے پوچھا ''کیا واقعی قلعے پر حملہ نہ ہو گا؟''

غازان نے کہا۔ ''ہم تھوڑی دیر کے اندر شہر کے بازاروں میں سے گزر رہے ہوں گے۔''

بادشاہ نے گھوڑے کو تیز کیا اور آن کی آن میں اس جگہ جا پہنچا جہاں نقاب پوش ملکہ کیتھرائن پالکی سے نکل کر سہیلیوں کے جھرمٹ میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

کیتھرائن نے بادشاہ کو دیکھا تو نقاب کے اندر سے اس کی آنکھیں روشن نظر آنے لگیں مگر اس نے کوئی تعجب ظاہر نہ کیا۔ اس نے کہا۔ ''اس امر کا مجھے اس وقت بھی پتا تھا، جب میری سہیلیاں اور بہادر حیران تھے۔''

ملکہ نے پوچھا: ''پیارے بادشاہ سلامت آپ کہاں؟''

بادشاہ جواب دیے بغیر جھکا۔ اس نے ملکہ کو پھول کی طرح اُٹھا کر گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا لیا۔

دونوں فوجوں میں شور و غلغلہ بلند ہوا۔ بادشاہ نے کہا ''ملکہ اب قلعہ میرے قبضہ میں ہے اور میں شہر کی دیواروں سے گزر جاؤں گا۔''

دونوں اسی طرح خوشی کے نعروں اور پھولوں کی بارش کے درمیان اشبیلیہ کے اندر داخل ہو گئے۔

◆◆◆

جارج برنارڈ شا

اس قدر شرمیلا تھا کہ اپنے دوستوں کو ملنے سے گھبراتا تھا۔ اس کے باوجود دنیا کا بہترین مقرر بن گیا۔

مادام میری کیوری

نوبل انعام یافتہ نامور فرانسیسی فزکس دان اور کیمسٹری کی ماہر خاتون جو کسی زمانے میں خود کو گرم رکھنے کے لیے سردیوں میں رات کو اپنے اوپر کتابوں کا ڈھیر رکھ لیا کرتی تھی۔

ونسٹن چرچل

ریاضی سے نفرت ہونے کے باوجود چار برس وزیرِ مال رہے۔

جوزف سٹالن

اس کے والدین غلام تھے مگر اس نے بیس کروڑ عوام پر حکمرانی کی۔

جنرل عمر نیلسن بریڈلے

شرمیلے پن کے باوجود ذہانت نے اسے امریکا کا عظیم جنرل بنا دیا۔

ارونگ برلن

امریکا کا مشہور گیت نویس جو کسی زمانے میں تھرڈ کلاس اور سستے ہوٹلوں میں گایا کرتا تھا۔

مسولینی

اس نے پانچ لاکھ آدمی محض اس لیے موت کی بھینٹ چڑھا دیے کہ اسے بیسویں صدی کا جولیس سیزر کہا جائے۔

ولیم شیکسپیئر

اس کے گاؤں کے لوگوں نے اسے عزت کے ساتھ دفن کیا کیونکہ وہ انہیں شرح سود پر قرض دیا کرتا تھا۔

چارلس ڈکنز

اپنی کتابوں کا معاوضہ تین پونڈ فی لفظ کے حساب سے لیتا تھا۔

تھامس ایڈیسن

ڈاکٹر اس کے سر کی غیر معمولی ساخت دیکھ کر پیشگوئی کرتے کہ وہ پاگل ہو جائے گا مگر وہ دنیا کا بہت بڑا سائنسدان بن گیا۔

مارکونی

جب اسے وائرلیس کی ایجاد پر پچاس ہزار پونڈ ملے، تو اس نے سب سے پہلے ایک سائیکل خریدی۔

آرول رائٹ

اس نے دنیا کی تاریخ کا رُخ بدل دیا لیکن اس عظیم بات کا اسے احساس تک نہ ہوا۔

ملتان کا سرسید

جاوید مسرت

جہالت کے خلاف جہاد کرنے والے مجاہد کی داستان جنہوں نے نئے وطن میں علم کی شمعیں روشن کرکے ہزاروں زندگیاں سنوار دیں

فروری ۱۹۸۰ء کے اوائل میں مجھے ابا جان کے انتقال کا اندراج کرانے کی خاطر کارپوریشن دفتر جانا پڑا۔ متعلقہ کلرک کو جب میں نے درخواست دی تو وہ صاحب فوراً اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور رجسٹر میں اندراج فرمانے لگے۔ میں نے کہا، آپ اطمینان سے بیٹھ کر کام کریں تو وہ صاحب یوں گویا ہوئے ''جاوید صاحب! آپ اس وقت بہت چھوٹے تھے جب مرزا صاحب نے تعلیم کے زیور سے ہمیں آراستہ کیا اور نہ صرف تعلیم دی بلکہ ہماری تربیت ان خطوط پر کی کہ آج ہم اس پُر آشوب دور میں بھی اپنے عمل سے رزق حلال کا تصور زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایسی ہستی کا نام بیٹھ کر لکھنا اُن کی توہین ہے''۔

یہی وہ ہستی ہے جس سے مجھے یہ نسبت خاص تھی کہ وہ میرے والد بزرگوار تھے لیکن اپنی خداداد صفات اور اپنے یادگار علمی، تعلیمی اور تہذیبی کارناموں کے سبب ان کا رشتہ اور رابطہ پوری ملّت سے تھا۔ انہوں نے نہایت محنت، دیانت، صداقت اور خلوص و بے غرضی کے ساتھ اپنا ایک ایک لمحہ تعمیر ملّت میں صرف کیا۔ خصوصاً نئی نسل کی تعلیم و تربیت، ذہنی ارتقا، اخلاقی نشوونما اور اسلامی اقدار کی بنیاد پر نوجوانوں اور طلبہ کی شخصیت سازی ان کا وہ ملّی کارنامہ ہے جو ہمیشہ یاد رہے گا اور دوسرے مسافرانِ علم و عمل کو اپنے سفر میں چراغ دکھاتا رہے گا۔

جب ابا جان انتقال فرما گئے، تو کچھ عرصہ بعد ایک دن سرِ راہ میری ملاقات ملتان کے مشہور و معروف زمیندار سے ہوئی۔ موصوف فرمانے لگے ''مرزا صاحب تو کافی جائیداد اور مربعے چھوڑ کر مرے ہوں گے''۔

میں نے برجستہ جواب دیا۔ ''آپ کی کُل جائیداد اور دولت سے کہیں زیادہ چھوڑ گئے ہیں''۔

فرمانے لگے ''اس کا مطلب ہے کہ پچاس ساٹھ مربعے سے زیادہ ہوں گے''۔

مجھے اُن کی زمیندارانہ ذہنیت پر حیرت ہوئی، جواب دیا ''جناب وہ زر اور زمین نہیں بلکہ عزت و وقار اور علم و عمل کی ایسی لازوال دولت چھوڑ گئے ہیں کہ جس کے مقابل میں دُنیوی دولت کی کوئی وقعت نہیں''۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اگر ابا جان مرحوم چاہتے تو بہت سی دولت اکٹھی کر سکتے تھے مگر یہ ان کی زندگی کا مقصد نہ تھا بلکہ انہوں نے ''اقراء'' کو اپنی زندگی کا سلوگن بنایا اور جہالت کی تاریکیوں کے خلاف بھرپور جہاد کیا۔ انہوں نے علم کی ایک ایسی شمع فروزاں کی جس کی روشنی تا ابد قائم و دائم رہے گی۔ ان کا وجود ایک روشن چراغ تھا۔ ان کی ذات ایک انجمن تھی، ہنستی مسکراتی بزم اور ایک فعال ادارہ۔

نظم و ضبط، قرینہ و سلیقہ، زندہ دلی اور مہمان نوازی ان کی

خوبیاں تھیں۔ وہ با اصول و باضمیر تھے۔ پُر وقار رفتار و گفتار کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت ایسے ہی اعلیٰ اوصاف اور عمدہ اطوار کا مرقع تھی۔ ان کی سیرت ساز شخصیت نے اعلیٰ ذہن پیدا کیے جن پر اسلامی افکار کی گہری چھاپ ہے۔ وہ ایک نسل کے معمار تھے، ایک ایسی نسل جن کے قلب و نظر اسلامی تعلیمات سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔

میں جب بھی ابا جان کی زندگی کا بغور مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے ان کی پوری زندگی قائداعظمؒ کے اس ارشاد کی تفسیر دکھائی دیتی ہے: کام، کام اور بس کام

ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے انہیں اپنے کام میں اسی لگن اور تندہی سے منہمک پایا جیسے وفات سے چند ہفتے پہلے۔ ریٹائرمنٹ کا لفظ ان کی زندگی کی لغت میں نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ملّت کالج سے بحیثیت پرنسپل سبکدوشی کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ مصروف کر لیا۔

ان کی گھریلو زندگی کے اُصول بعینہٖ وہی تھے جو گھر سے باہر۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا گھریلو ماحول آئیڈیل گھر کا ماحول تھا۔ جہاں بڑوں کی عزّت، چھوٹوں سے شفقت، ہمسایوں سے صلہ رحمی اور ملازمین سے پیار و محبت، غرض ہمارا گھر حقیقت میں جنت کا گہوارہ تھا۔

مجھے بچپن کا وہ وقت بخوبی یاد ہے جب ابا جان علی الصبح اٹھنے کے بعد نماز باجماعت ادا کرنے مسجد تشریف لے جاتے اور اس کے بعد قلعہ کہنہ پر آدھ گھنٹا ورزش کرتے۔ کبھی کبھی امی جان اور ہم بہن بھائیوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔ قلعہ پر ایک مخصوص میدان میں وہ ورزش کرتے اور گھر آنے کے بعد روزانہ غسل فرماتے۔ سردیوں میں بھی ان کو اپنے معمولات میں تبدیلی کرتے نہ دیکھا۔ البتہ سردیوں میں غسل کے لیے گرم پانی استعمال کرتے۔ غسل کے بعد خوش الحانی سے کلام پاک کی تلاوت فرماتے اور پھر ناشتے سے فراغت پا کر وقت مقررہ سے تقریباً نصف گھنٹا پہلے اسکول روانہ ہو جاتے۔ میں نے پوری زندگی انہیں کبھی دیر سے اسکول جاتے نہیں دیکھا۔ وقت کی پابندی ان کی زندگی کا سنہرا اصول تھا۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے ''جو شخص وقت کی قدر نہیں کرتا وقت اس کی کبھی قدر نہیں کرتا''۔

ابا جان کھانے کے معاملے میں انتہائی باذوق اور نفاست پسند تھے۔ مہمانوں کے کے لیے ان کا دسترخوان ہمیشہ وسیع ہوتا۔ ہر ماہ دو تین مرتبہ تمام اصحاب کو پُر تکلف دعوتوں پر مدعو کرتے۔ اپنے کھانے کے بارے میں انتہائی محتاط تھے۔ صبح کا ناشتا شہد، بادام، ڈبل روٹی، انڈا اور چائے پر مشتمل ہوتا۔ دوپہر کو انتہائی ہلکا کھانا کھاتے۔ شام کی چائے ان کے معمولات میں شامل تھی۔ رات کا کھانا جلد کھاتے۔ پرہیز کے معاملے میں بہت ہی حساس تھے اور ڈاکٹر کی ہدایت پر انتہائی سختی سے عمل کرتے۔

اگر کوئی شخص کھانے پر مدعو کرتا تو اپنا پرہیزی کھانا پہلے سے بتلا دیتے تاکہ میزبان کو آسانی رہے۔ میں نے کبھی ابا جان کو دعوتوں اور خصوصاً شادی کے کھانوں میں بدپرہیزی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ سختی سے اپنے اُصولوں پر کاربند رہنے کے قائل تھے۔

ابا جان کو اللہ تعالیٰ نے خوش الحانی عطا فرمائی تھی۔ مجھے اب بھی وہ زمانہ یاد ہے جب ہمارے گھر شام کے وقت نعتیہ محفلیں منعقد ہوتیں جس میں ان کے انتہائی قریبی دوست غلام مصطفیٰ چغتائی (مرحوم) ہلال جعفر اور عبدالعزیز شرقی ضرور شرکت فرماتے۔ والد ان محفلوں کی روح رواں ہوا کرتے۔

والد مرحوم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ ان چند خوش نصیب افراد میں سے ہیں جنہیں ان کا ہر دوست دوسرے سے زیادہ قریب سمجھتا۔ والد مبلغ تھے ایک معلم بھی، ایک قانون دان تھے اور ایک سیاسی شخصیت بھی، ایک بہترین باپ تھے اور ایک دوست بھی۔ مجھے وہ وقت کبھی نہیں بھولتا جب میں ابا جان کی بیماری کے دوران طبی مشورہ کے لیے ان کے ہمراہ

لاہور گیا۔ لاہور ایئر پورٹ پر اداکار محمد علی جو کہ اباجان کے اوّلین شاگردوں میں سے تھے۔ ہمیں لینے جہاز کی سیڑھی کے قریب کھڑے تھے۔ لاؤنج میں ادارہ اردو ڈائجسٹ کے ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور ان کے بھائی الطاف حسن قریشی ہمارے منتظر تھے جو اباجان کے پرانے رفقا میں سے ہیں۔

ہمارا قیام لاہور کے ہلٹن ہوٹل میں تھا۔ اباجان کو وہیل چیئر کے ذریعے ہوٹل تک لے گئے۔ جب ہم ان اصحاب کی معیت میں ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا عبدالستار خان نیازی بھی لاؤنج میں بہت دیر سے انتظار فرما رہے ہیں۔ اباجان کو دیکھتے ہی وہ باہر آ گئے۔ وہیل چیئر کے پیچھے فلم سٹار محمد علی تھے اور دائیں بائیں قریشی برادران۔ مولانا عبدالستار خان نیازی اور دیگر احباب بھی وہیل چیئر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ مگر وہیل چیئر پر بیٹھے ایک شخص کے ساتھ اتنی شخصیات کا اجتماع دیکھ کر انتظامیہ پریشان ہو گئی۔ میں نے منیجر کی پریشانی بھانپ لی۔ ہوٹل منیجر گھبراہٹ میں بڑھے اور انہوں نے پوچھا ''جناب یہ کوئی پیر ہیں جو آپ کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔''

میں ان کا سوال سن کر مسکرایا اور انہیں بتایا کہ یہ کوئی پیر نہیں بلکہ استاد ہیں... روح انسانی کے صنعت گر۔

ابا مرحوم انتہائی محبت کرنے والے، ہنس مکھ اور نرم طبیعت کے مالک تھے۔ وہ ہر بات کو دلائل کی کسوٹی پر پرکھتے، خود متفق ہو جاتے یا دوسرے کو اپنے دلائل کی بنا پر اپنا بنا لیتے لیکن دلائل کے ساتھ ایسی غیر ضروری بحث و تمحیص سے گریز کرتے جو شکر رنجی پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے، ان کا حلقۂ احباب وسیع تر ہوتا رہا۔ ایک مرتبہ دائرہ اثر میں آنے والا زندگی بھر ان کا مدح رہا۔

ملازمین کے ساتھ ان کا رویہ اپنائیت بھرا تھا۔ گھر کے ذاتی ملازم ہوں یا اسکول کے اساتذہ، سبھی سے اتنا پیار و محبت رکھتے کہ ملازم کو کبھی ملازم ہونے کا احساس نہ ہونے دیتے۔

ہمارے گھر کا ملازم اشتیاق اور ڈرائیور اسد اللہ جب کبھی اباجان کے ساتھ باہر جاتے تو ان کو ہمیشہ ہوٹل میں اپنے ساتھ ٹھہراتے اور اپنے ساتھ میز پر کھانا کھلاتے۔ کبھی کوئی ملازم کسی ضرورت کے لیے کچھ رقم طلب کرتا تو اسے اس کی طلب سے بڑھ کر دیتے اور بقایا رقم کا کبھی حساب نہ لیتے۔ کہا کرتے تھے کہ ملازمین کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں، اگر وہ پوری کر دی جائیں تو وہ پھر کبھی انہیں غلط طریقے سے پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

میری چھوٹی بہن رُوبی سے انہیں بہت پیار تھا اور اس کی ہر خواہش پوری کرتے۔ میں اور نوید بھائی اس کی بعض خواہشات پوری ہونے پر احتجاج کرتے تو کہتے کہ بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ اس رحمت کی قدر کرنی چاہیے۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ آپس میں تحائف دو تاکہ دلوں میں محبت بڑھے۔ اباجان مرحوم اپنے دوستوں کو تحائف دیتے اور اس ارشاد نبوی ﷺ پر عمل کرتے، ان کا تحائف دینے والا انداز بھی مختلف تھا۔ عید سے ایک رات پیشتر بڑے اہتمام سے دلیے کے پیڑے آرڈر پر تیار کروائے جاتے۔ وہ پھر تمام دوستوں کے گھر میں بھجوائے جاتے۔ ان کے یہ پیڑے تمام دوستوں میں مقبول تھے۔ ان کا ذائقہ اس قدر عمدہ ہوتا کہ دوست بعد میں فرمائش کرتے، پیڑے والے کا پتا پوچھتے اور خود منگواتے۔

تحفوں کا یہ سلسلہ صرف ملتان کے دوستوں تک محدود نہ تھا بلکہ لاہور اور راولپنڈی تک تحفے ارسال کیے جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں، بقول غالب انگبیں کے سربہ مہر گلاس، راہِ خلد کا توشہ اور طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ یعنی آم، دوستوں کی خدمت میں روانہ کیا جاتا۔ ہندوستان میں سہارن پور آموں کا گھر تھا اور پاکستان میں ملتان کے آم اپنی مثال آپ ہیں۔ اباجان کہا کرتے تھے کہ سہارن پور کے آم بھی خوش ذائقہ ہیں لیکن مخصوص آب و ہوا اور موزوں زمین کے سبب جو مزا ملتان کے آموں میں ہے، وہ سہارن پور کے آموں میں کہاں۔ موسم گرما میں باغ سے آم خریدے جاتے۔ خصوصی پیکنگ کے بعد آموں کی یہ ڈالیاں، ملتان سے باہر کے دوستوں کو روانہ کی جاتیں۔ ان کے اکثر دوست یہ کہا کرتے تھے کہ گرمیوں کی آمد کا اندازہ مرزا صاحب کی طرف سے آم آنے پر ہوتا ہے۔

اباجان مرحوم کے لباس کا سلیقہ بہت عمدہ تھا۔ لباس کی خریداری سے لے کر اس کو زیب تن کرنے تک کے تمام مراحل میں نفاست مدِنظر رہتی۔ لباس کی خریداری میں ہمیشہ سید اقبال شاہ ان کے ہمراہ ہوتے۔ ان کے مشورے سے کپڑا خریدا کرتے، پھر نوکر کے ذریعے کپڑا گھر روانہ کر دیتے کہ ہم لوگ بھی اُس پر رائے زنی کر سکیں۔ سبھی کی آراء کی روشنی میں اپنی خریداری مکمل کرتے۔ کپڑے سینے کے لیے بھی ان کا درزی مخصوص تھا۔ ہندوستان میں ان کا اپنا درزی تھا جو ہجرت کے بعد حُسن اتفاق سے ملتان آ گیا اور ملتان چھاؤنی میں انگلش ٹیلرز کے نام سے کام کرنے لگا۔ مرزا صاحب نے وضعداری کو برقرار رکھا اور ہمیشہ اپنے پُرانے درزی سے کپڑے سلوائے۔

اباجان مرحوم کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں۔ مجھے اسی مقصد کے لیے انہوں نے کیڈٹ کالج حسن ابدال میں داخل کروایا مگر میں ان کی خواہش پوری نہ کر سکا اور فوج میں چلا گیا مگر انہوں نے میرے انتخاب کو بہت سراہا اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ اباجان کا ذکر کرنے کے لیے شاید صفحات میرا ساتھ نہ دے سکیں کیونکہ اُنتیس سالہ اس رفاقت کے ایک ایک لمحے کو الفاظ کا روپ دینا اس وقت ممکن نہیں۔ میں آج فخر سے کہتا ہوں کہ میرے والد محترم ایک آئیڈیل باپ، ایک آئیڈیل خاوند اور ایک آئیڈیل انسان تھے۔

اباجان مرحوم کے شاگردوں میں جو عقیدت مندی میں نے دیکھی ہے، وہ کسی خوش نصیب استاد ہی کے حصے میں آ سکتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ کردار سازی کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اساتذہ کے لیے مشعل راہ ہے۔ ملت ہائی سکولز سے فارغ التحصیل طلبہ اور دیگر درس گاہوں کے طلبہ میں یہی وہ بنیادی فرق ہے جو مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ملّت اولڈ بوائز کو دوسروں سے ممتاز کیے ہوئے ہے۔ مرزا مسّرت بیگ کے راہنما اقوال درج ذیل ہیں۔

- ☆ میں عقیدہ کے لحاظ سے ایک معلّم ہوں، پیشہ کے لحاظ سے نہیں۔
- ☆ بچہ ہمارے پاس قوم کی امانت ہے۔ اگر ہم نے اس امانت کی حفاظت نہ کی تو اللہ اور قوم ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔
- ☆ اُستاد کا کام بہت مشکل ہے۔ اگر اس نے اپنا فرض بخوبی انجام دیا تو سب سے پہلے جنت میں جائے گا ورنہ سب سے پہلے دوزخ میں۔
- ☆ بچے کو ذریعۂ نجات بنانا چاہیے۔
- ☆ آج کے دور میں طلبہ کے درمیان محض نمبروں کا مقابلہ ہوتا ہے، علم کا نہیں۔
- ☆ موجودہ دور میں استاد کی کارکردگی نتائج کے معیار ہی سے نہیں تعداد سے بھی جانچی جاتی ہے۔
- ☆ بچے کی تعلیم و تربیت سے سزا کو قطعاً نکال دیا جائے۔ کیونکہ سزا بچے کی نفسیاتی نشوونما کو روک دیتی ہے۔
- ☆ سزا کا خوف اس کے استعمال سے بہتر ہے۔
- ☆ مذہبی تعلیم بچے کو شعوری اور لاشعوری طور پر (دونوں طرح سے) دی جائے۔
- ☆ شعوری طور پر تدریس، تبلیغ کا طریقہ ہے۔ جبکہ اسکول کا ماحول اور استاد کا کردار لاشعوری طور پر طالب علم کو متاثر کرتا ہے۔ اس لیے بچے کی تربیت کے لیے استاد کی اصلاح ضروری ہے۔

سرخ گلاب

سارا احمد

زندگی میں کی گئی معمولی سی نیکی کبھی کبھی غم وآلام میں گھرے انسان کا بیڑا پار لگا دیتی ہے

شاعری اور کہانیوں کی کتابیں تھیں جنہیں اب بینائی میں کمی کی وجہ سے پڑھنا دشوار تھا۔ ان سب کو بیچ کر جان چھڑائی۔ سرہانے پڑی رہتیں تو اذیت دیتیں۔ ان میں سے کئی ورق نکال کر پوتوں نے کشتیاں بنا کر بارش کے پانی میں بہا دی تھیں۔ ان کا بچپن تیرتا اور اس کا بڑھاپا ڈوبتا تھا۔ عمر کے اس حصے میں کمائی اگر سود دے کر بچانی پڑ جائے تو حال افضل کی ناکارہ جوتیوں جیسا ہو جاتا ہے۔ تلووں میں جگہ جگہ سوراخ اور ان میں کنکر پھنسے ہوئے۔ تھیلا اگر بھاری نہ ہوتا تو کسی جگہ بیٹھ کر پاؤں میں مسلسل ہونے والی چبھن سے نجات حاصل کر لیتا۔ ذرا سی دیر بہو کے غصے کو آتش فشاں بنا دیتی۔ صبح بیٹا بھی تاکید کر کے گیا تھا:

''ابا جی، بچوں کے اسکول سے آنے سے پہلے ہی فاخرہ کو سودا سلف لا کر دے دینا۔''

افضل دل ہی دل میں کڑھتا تھیلا دائیں کندھے پر ڈالتا کبھی بائیں کندھے پر گھر تک پہنچ ہی گیا۔ بہو نے پہلے برآمدے میں لگی گھڑی کی طرف دیکھا پھر سسر کے ہاتھ سے تھیلا پکڑا۔ تھیلا پکڑتے ہوئے ذرا ایک دم آگے کو جھک بھی گئی۔

''اُف تھیلا تو بہت بھاری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سسر کو ٹھنڈے پانی کا گلاس لا کر دیا۔

افضل کی بڑبڑاہٹ معمول کی تھی۔ اس لیے بہو نے توجہ نہ دی اور کام کاج میں مشغول ہوگئی۔ رات بیٹا گھر آیا تو اس پر بہت چیخا:

''اپنی اچھی بھلی جوتی مسجد میں چھوڑ کر نجانے کس کی ٹوٹی جوتی پہن کر آجاتے ہیں۔''

بیٹا ذرا سانس لیتا تو بہو کود پڑتی، ''پتا نہیں کیا مسئلہ ہے ان کے ساتھ ہمیشہ ہی نئی جوتی گم کر آتے ہیں مسجد، کئی بار کہا مسجد کے لیے الگ جوتی رہنے دیں۔''

بہو بیٹا جب بھڑاس نکال چکے تو اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تینوں پوتے اس کے بستر میں گھس گئے کہ صبح چھٹی ہے، کوئی کہانی سنائیں۔ اس کے پاس ایک ہی کہانی تھی۔ بچے وہی پرانی کہانی سن کر منہ بسورتے ہوئے سونے چلے گئے۔ وہ جانتا تھا اگلے ہفتے بچے پھر اسی پرانی کہانی پر راضی ہو جائیں گے۔ بیٹے کو وہ انسان تھوڑا ہی نظر آتا تھا تبھی تو وہ اپنے بیٹے کو خنزیر کا بچہ کہتا۔

مرنے والی کا حق جدا ہو کر بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ فقیری میں بھی وہ اسے بادشاہ ہی سمجھتی تھی۔ وہ جب کام سے آتا تو جہاں ہوتی دوڑی چلی آتی۔ اپنا ہر ضروری کام چھوڑ کر اسے پانی کا گلاس یوں پیش کرتی جیسے اس کے محل کی رانی نہیں دربار کی معمولی کنیز ہو۔ اس کی سستی سی چپل یوں اٹھا کر رکھتی گویا اس

سے بڑی سعادت کوئی اور نہ ہو۔

گزرے وقتوں کی اچھی یادیں ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتیں۔ پیارا اور جانثار ساتھی قسمت کے دھنی لوگوں کو ہی ملتا ہے۔ بہت سالوں کے بعد رانی کی گود ہری ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بھی ایک ہی بیٹا دینے کے بعد پھر ان کا دل صبر وشکر سے بھر دیا۔ وہ بھی اس کی رضا میں راضی ہو گئے۔

بیٹے نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ سسرال والے مالی لحاظ سے ان سے بہتر تھے۔ اس لیے بیٹے پر بہو کا رعب اور دباؤ تھا۔ باپ کو مناسب سا خرچہ اور اپنے پاس سے روٹی کپڑا دے کر سمجھتا اپنی ذمہ داری نبھالی۔

افضل اپنی نئی جوتی مسجد میں گم نہیں کرتا تھا بلکہ بدل لیتا۔ حبیب اس کی نئی جوتی دیکھ کر لیچڑ بن کر اس سے چمٹ جاتا۔ جب تک اپنی پرانی ٹوٹی جوتی اس کی نئی جوتی سے بدلوا نہ لیتا اس کا پیچھا نہ چھوڑتا اور پھر آخری حربہ اس کے پاس بھابھی کی سفارش ہوتی۔ رانی کا جہاں ذکر آتا اس کا دل پسیج جاتا۔ حبیب اس کے بچپن کا جگری یار تھا۔ گھر بسایا تھا اور نہ کبھی ڈھنگ کا اس کا کوئی روزگار رہا تھا۔ اسی طرح مانگ تانگ کر زندگی گزار رہا تھا۔ انٹر تک دونوں کی پڑھائی ایک ساتھ ہی ختم ہوئی۔

گھر فاصلے پر تھے لیکن ایک ہی علاقے میں ہونے کی وجہ سے رابطہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ چھٹی کے دن گلی میں اپنے مخصوص وقت پر پٹھان پھیری لگانے آیا تو اس نے اپنے پرانے کپڑے اور ایک بوسیدہ تنگ کوٹ دے کر اس سے پرانے مگر اچھی حالت میں جوتے لے لیے۔ بیٹا دروازے پر کھڑا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ بولا کچھ نہیں مگر جب پٹھان کی گٹھڑی پر نظر پڑی تو چونک اٹھا۔ پرانے جوتوں کے جوڑوں میں وہ جوتے بھی پڑے تھے جو اس نے خود انہیں پچھلی دفعہ خرید کر دیے تھے۔ بیوی کی وجہ سے کہ گھر میں فساد نہ ہو اور چھٹی کا دن اکارت نہ جائے، وہ خاموش رہا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بیوی بچوں کے ساتھ کسی پارک میں جانے کا پروگرام بنا تھا۔ اندر بچے زور شور سے تیاری میں لگے تھے۔ بیوی کا شکر گزار تھا جس نے اس کے باپ کے لیے کھانا تیار کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی، اندر آتے ہوئے باپ کی جیب میں کچھ روپے ڈال دیے۔ فرق اگر ایک نمبر کا ہوتا تو کپڑوں کی طرح باپ کو جوتوں کی بھی کبھی تنگی نہ ہوتی۔

بیٹے کے دیے ہوئے پیسے وہ ایک جگہ رکھتا جاتا تھا۔ پتا نہیں بیٹے نے اپنی ماں کی قبر پر بارشوں کے بعد لیپ کروایا بھی تھا کہ نہیں۔ شام ڈھلنے لگی تو اُسے رانی کی یاد ستانے لگی۔ کیسا سنجوگ ہے یہ بھی کہ محبت گونگی ہو کر بھی تنہائی کو بے بس کر دیتی ہے۔ اس کا دل اللہ ھو کا ورد کرنے لگا۔ مقام بدل کر بھی اس کی شدت میں کمی نہیں ہوتی۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ درمیان میں بچوں کے گھر آنے پر شور سے آنکھ کھلی بھی تو کروٹ بدل کر سو گیا۔

اس کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ بیٹے سے رانی کی قبر کا ذکر کرتا۔ بہو اور بیٹے کے اپنے رونے ہی نہیں ختم ہوتے تھے۔ کبھی بجلی کے بل کا رونا اور کبھی بچوں کی فیس اور ان کی بیماری۔ اللہ تعالیٰ کا شکر تھا وہ کم ہی بیمار پڑتا۔ رانی کے بتائے ہوئے ٹوٹکوں پر وہ آج بھی عمل کر کے بچت کر لیتا تھا۔ بیمار پڑ کر بستر سے لگ جاتا تو باہر کون نکلنے دیتا؟ مسجد جانے سے بھی جی بہلا ہوا تھا۔ بہت دنوں بعد اسے حبیب ملا تو خلافِ معمول اچھے حلیے میں تھا۔ گھر پر اس کی بہو کی تند مزاجی کی وجہ سے وہ بہت کم آتا تھا۔ جب بھی آیا بغیر چائے پیئے ہی اٹھا۔ جب رانی تھی تو افضل ہمیشہ کھانا کھلا کر اسے رخصت کرتا۔ آج کل وہ بسوں کے اڈے پر ایک کمپنی میں ٹکٹوں کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ اپنے کام پر ٹکا ہوا تھا، تبھی اس کا دھیان اس کے پاؤں کی طرف نہیں گیا۔

افضل کا دل چاہتا تھا وہ بھی کسی ایسے ہی کام پر بیٹھ جائے۔ کم از کم بہو بیٹے کی محتاجی تو نہ رہے گی مگر بیٹا نہیں مانتا تھا۔ یہی کہتا، لوگ طعنہ مارتے ہیں کہ باپ کو اس عمر میں دو

وہ انتظار کرتا رہا کہ کسی دن بیٹے کو فرصت ملے تو اس سے بات کرے۔ بیٹے کو جب بات سننے کی فرصت ملی تو پھر اسے ٹال دیا، ''ابا جی لے چلوں گا آپ کو کسی دن، وہ دلدلی جگہ ہے، ابھی جانا مناسب نہیں.....''

اب دل ہر خوف و خطر سے پاک ہو گیا۔ کیا وہ اپنی رانی کی قبر بھی نہیں ڈھونڈ سکتا؟ پوتے پاس ہی برآمدے میں کھیلتے ہوئے شور کر رہے تھے۔ وہ چادر منہ پر ڈال کر رونے لگا۔ کسی نے بھی اس کے رونے کی آواز نہیں سُنی۔ کوئی بھی اس کے قریب نہیں تھا۔ اس کا ساتھی اور غمگسار تو مر چکا تھا۔

رات بھر بارش کی جھڑی لگی رہی۔ یوں لگتا تھا ساری کائنات سوگوار ہے۔ اس ایک دل کے ساتھ ہی تو جہاں کا رونا ہنسنا ہے۔ یہ دل ختم تو سارے جھگڑے ختم۔

صبح اٹھا تو بدن ٹوٹ رہا تھا لیکن ارادہ پکا تھا۔ لگن صرف قبرستان جانے کی لگی تھی۔ پوتوں کو کہانی سناتا تو وہ ہنستے تھے۔ کیا کوئی غریب بھی بادشاہ ہو سکتا ہے اور اس کی بیوی رانی۔ انہیں کیا پتا تھا' وہ اپنی کہانیوں میں کس رانی کا ذکر کرتا ہے۔ انہیں کیا پتا رانی کے بغیر بادشاہ فقیر ہو جاتا ہے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا ناشتا کیے بغیر اپنی ضروری چیزیں لے کر تیار ہو گیا۔ پیچھے سے اسے کس نے آواز دی' کس نے پکارا، وہ ناک کی سیدھ میں خود کو گھسیٹتا ان سنی کرتا گھر سے نکل گیا۔

رات کی بارش اور پھر صبح چلنے والی ہوا نے موسم خوشگوار بنا دیا تھا۔ سڑکیں خالی تھیں اور کاروبارِ زندگی میں ابھی تیزی نہیں آئی تھی۔ دودھ دہی اور پرچون کی دکانیں کھلی تھیں۔ تنور والے بھی اپنے کام کے ابتدائی مرحلے میں تھے۔ ایک رکشے والے نے رفتار کم کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچ کر سر باہر نکال کر پوچھا:

''حاجی صاحب کدھر کا ارادہ ہے، کہاں جانا ہے.....؟''

''میں حاجی نہیں ہوں.....''

''حاجی صاحب نیت رکھو، نہ پہنچ سکے تو بھی فرشتے حاجی

کہہ کر لے جائیں گے۔''

افضل کچھ بڑبڑایا تو رکشے والا پھر سارے راستے کچھ نہ بولا۔ وہ مسافر کو منزل کی طرف پہنچانے بڑھ گیا۔

رکشہ سے اتر کر پیسے دیتے وقت افضل کچھ کہنے لگا تو وہ والا جلدی سے بولا ''کوئی بات نہیں جی' آپ میرے والد کی جگہ ہو، میرا ابا بھی اسی قبرستان میں دفن ہے۔ سواری اٹھانے کی جلدی نہ ہوتی تو ضرور فاتحہ پڑھ کے جاتا، ویسے عید شبرات میری حاضری پکی ہے۔''

قبرستان کے ساتھ پھولوں کی دکانیں ابھی بند تھیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر گورکن کو ڈھونڈا۔ وہ اپنی جھگی میں ادھ موا پڑا تھا۔ خراٹوں کی آواز میں اس کی آواز دب گئی۔ ایک بلی جھگی کے باہر لیٹی اسے مندھی مندھی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ اسے ششکارا تو اپنی دم اٹھا پھر مٹی پر پنجے کر سو گئی جیسے کہہ رہی ہو میرے لیے زندہ مردہ برابر ہیں۔

قبرستان پر چھائے دائمی سکوت اور وحشت نے افضل کے دل پر ہیبت طاری کر دی۔ جسم لرزنے لگا جیسے تیز ہوا سے کسی خالی مکان کا دروازہ ہلتا ہے۔ وہ نشیبی جگہ پر اترتے ہوئے پھسل کر گرنے لگا تو دو مانوس ہاتھوں نے تھام کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''یار حبیب تو.....'' وہ بس یہی کہہ سکا۔

حبیب اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ بغیر راستہ بھولے اسے رانی کی قبر پر لے گیا۔ رانی کی قبر نئی بنی لگ رہی تھی۔ مٹی کی تازہ لپائی اور اپنی ایک مخصوص خوشبو سے مہک رہی تھی۔

''فکر نہ کر، کتبہ لگ جائے گا تو نشانی پکی ہو جائے گی۔''

اسے اپنی رانی کی قبر یاد نہیں تھی اور حبیب اس مٹی کی ڈھیری کی حفاظت کر رہا تھا۔ افضل کا دماغ گھوم گیا۔ گریبان کھینچنے سے حبیب کی قمیص کے بٹن ٹوٹ کر گر گئے۔ وہ چلایا:

''تو ہوتا کون ہے میری رانی کے متعلق سوچنے والا۔''

افضل رانی کے قدموں کی طرف بیٹھ کر اپنی سانسیں بحال کرنے لگا۔ آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ حبیب نے اپنی جیب سے سُرخ گلاب کی پتیوں سے بھرا لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بولا:

''یہ لے' ان پر صرف تیرا حق رہے گا..... میں بھلا تیری جوتیوں کے دام کہاں چکا سکتا ہوں۔''

حبیب وہیں بیٹھا رہا۔ جانتا تھا' صرف وہی ہے جس سے افضل رانی کی باتیں کر سکتا ہے۔ اس نے تو دوستی کا معمولی سا صدقہ ادا کیا تھا۔ خراج تو سُرخ گلابوں نے وصول کرنا تھا۔ افضل نے رانی کی قبر پر سجادی تو حبیب نے آگے بڑھ کر اس کے ڈولتے جسم کو گھر لے جانے کے لیے سہارا دیا۔ بادل پھر بارش برسانے کو بے قرار تھے۔ کیا پتا بارش کے ساتھ اب کی بار سوندھی مٹی اور گلاب بھی آنسو بہانے لگیں۔

●●●

افکارِ جبران

☆ بہترین انسان وہ ہے جب اس کی تعریف کی جائے تو وہ شرمندہ ہو اور جب اس کی برائی کی جائے تو وہ خاموش رہے۔

☆ زیب و زینت کی نمائش کم ظرفی کی دلیل ہے۔

☆ جو شخص سوال پوچھنے میں تیز ہو وہ جواب دینے میں کمزور ہوتا ہے۔

☆ اقوال بے معنی ہیں۔ جب تک یہ عادات پر اثر انداز نہ ہوں۔

جو لوگ تمھاری خدمت کرتے ہیں' اس کے بدلے میں سونے کے ڈھیر بھی انھیں دو تو یہ کوئی بڑی قیمت نہیں۔ ہو سکے تو انھیں اپنا دل پیش کرو یا پھر ان کی خدمت کرو۔

فکاہیہ

انجمنِ حقوقِ مرداں

شوہر کے عہدے پر فائز ہونے کا خواب اپنے اندر اتنی دلفریبی رکھتا ہے کہ اکثر کوتاہ اندیش کنوارے اس کے سحر سے اس وقت تک نکل نہیں پاتے جب تک کہ یہ حادثہ ہو نہیں جاتا۔ پھر اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہو جانے کے بعد وہ بے چارے اپنی کج فہمی پہ خود بھی شرمندہ شرمندہ سے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے چہرے سے ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں'' کا شکوہ بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ اکثر ''شوہرانِ نو'' جو شادی سے پہلے اس کا تصور کر کے رومانوی خیالوں میں کھوئے رہتے ہیں، شادی کے بعد آٹے دال کے بھاؤ کے معاملات میں الجھے پائے جاتے ہیں۔ وہ ''چودہ طبق روشن ہونے'' اور ''ہوش ٹھکانے آنا'' کے محاورات کی عملی تفسیر نظر آتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست شادی کروانے کا انتہائی شوق رکھتے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جنون رکھتے تھے۔ ایک دن ہمارے پاس آ کر کہنے لگے:

''بھائی! میری شادی کے لیے دُعا کیجیے''۔

''ابھی کیے دیتے ہیں یار!'' ہم نے پوری شفقت کے ساتھ کہا۔ ''اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ شادی سے محفوظ رکھے''۔

''نہیں بھائی.....'' وہ ایک دم تڑپ کے بولا۔ ''شادی ہونے کی دعا کیجیے''

''شادی ہونے کی دعا؟''..... بھئی! وہ دعا نہیں بد دعا کہلائے گی''

''بد دعا.....؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''بد دعا کیسے؟''

''یہ بات ابھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کچھ چیزوں کو سمجھنے کے لیے تجربے کا ہونا ضروری ہے اور آپ ٹھہرے نا تجربہ کار.....'' ہم نے جواب دیا۔

''بھائی! مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آ رہی۔ بس آپ میری شادی ہونے کی دعا کیجیے۔'' اس نے ملتجی لہجے میں دو ٹوک بات کی۔

''ٹھیک ہے''۔ ہم نے بھی حتمی لہجے میں کہا ''اگر آپ کو نتائج کی پروا نہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہم کیے دیتے ہیں دُعا لیکن یہ ہم بتاتے چلیں کہ ہم کوئی پیر فقیر یا کوئی پہنچی ہوئی ہستی نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ہم دعا مانگتے ہیں تو مکمل مانگتے ہیں، ادھوری نہیں۔ اس لیے تفصیل سے بتاؤ کہ لڑکی کس طرح کی ہونی چاہیے''؟ ایک دم سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ جیسے ہمارا دعا نہ مانگنا اس کی شادی کی راہ میں واحد رکاوٹ تھی اور ہمارے حامی بھرنے سے وہ دور ہو گئی''۔

''لڑکی ایسی ہونی چاہیے کہ.....'' یہ کہہ کر وہ سوچوں میں کھو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ خیالوں ہی خیالوں میں کسی حسین پیکر کو دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے یوں بولنا شروع کیا جیسے خواب میں بول رہا ہو:

''لمبی رنگت، گوراقد.....''

''بس.....بس.....بس، ادھر ہی رک جایئے۔'' ہم نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔ ''محترم! لفظوں کی ترتیب درست کر

لیجیے ورنہ ہم نے واقعی ایسی دعا مانگ لی اور خدانخواستہ وہ قبول بھی ہو گئی تو آپ کی شادی کسی لڑکی نہیں بلکہ عجوبے سے ہو گی۔''

''جی.....؟'' وہ ہماری بات سمجھ نہ پایا۔ ہم نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ''آپ کی شادی لمبے قد اور گوری رنگت کی لڑکی سے تو ہو سکتی ہے مگر لمبی رنگت اور گورے قد کی لڑکی سے نہیں۔''

''اوہ.....'' اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ''لگتا ہے میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔''

''یقیناً''۔ ہم نے اس کی تائید کی۔ ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں''۔ زندگی میں بہت دفعہ انسان کو نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے کام کرنا پڑتے ہیں جنہیں وہ مناسب نہیں سمجھتا۔ ہم بھی چونکہ دوست سے دعا کا وعدہ کر چکے تھے اس لیے ایسا کرنا اب اخلاقی طور پر ہمارے لیے لازم ٹھہرا اور نہ کون جان بوجھ کر اپنے دوست کی بدخواہی کی تمنا کرتا ہے۔ اللہ جانے یہ ہماری دعا کا اثر تھا یا اس کی قسمت ویسے ہی خراب تھی کہ کچھ عرصے بعد اس کی واقعی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد تین چار ماہ تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر اچانک ایک دن وہ آموجود ہوا۔ حالت ایسی دگرگوں کہ جس پہ اچھے خاصے نوحے لکھے جا سکیں۔ اس کی شکستہ حالت دیکھ کر ہمیں تشویش ہونے لگی۔

''یار! کیا ہو گیا آپ کو؟'' ہم نے بے اختیار اسے گلے لگایا۔

''شادی ہو گئی ہے میری''۔ اس نے مرے لہجے میں جواب دیا۔

''شادی کا تو پتا ہے لیکن یہ حالت.....؟'' ہم نے تشویش کا اظہار کیا۔

''دراصل ہمارے کچھ دوستوں نے ہمیں ورغلایا تھا۔ کہتے تھے کہ شادی کر لو، زندگی سنور جائے گی۔ کپڑے استری شدہ ملیں گے، کھانا پکا پکایا ملے گا اور نہ جانے کتنے خواب دکھائے تھے انہوں نے مجھے''۔ اس نے دکھڑا کہہ سنایا

''ٹھیک ہی تو کہا تھا''۔

''خاک ٹھیک کہا تھا''۔ اس نے تلخی سے کہا۔ ''اب بھگت تو میں رہا ہوں نا''

''کیا مطلب.....؟ کیا بھگت رہے ہو۔''

''شادی سے پہلے صرف اپنے کپڑے دھویا کرتا تھا، اب بیگم کے بھی دھونے پڑتے ہیں۔ پہلے صرف ایک وقت کھانا بنا کر دو تین وقت کھا لیا کرتا تھا۔ اب تینوں وقت تازہ کھانا بنانا پڑتا ہے کیونکہ بیگم فریج میں رکھے کھانے کو بھی باسی ہی تصور کرتی ہیں۔ پہلے ہفتے بعد گھر کی صفائی کیا کرتا تھا اب روزانہ کرنا پڑتی ہے اور.....'' وہ روہانسے لہجے میں بولے جا رہا تھا۔

''واہ..... واہ..... واہ.....'' ہم نے تالی بجائی۔ ''کیا گھڑ شوہر پایا ہے بھئی آپ کی بیگم نے!''

''ہاں! آپ طنز کر لیں'' وہ آبدیدہ ہو گیا۔ ''میری جان پہ بنی ہوئی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔'' ہم اسے دلاسہ دینے کا سوچ ہی رہے تھے کہ وہ پھر بول پڑا۔ ''اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ڈاڑھی رکھ لوں گا۔'' ہمیں حیرت کا جھٹکا لگا۔ بھلا شادی کے بعد کے اثرات کا ڈاڑھی رکھنے سے کیا تعلق۔ وہ ہمارے چہرے سے ہماری الجھن بھانپ گیا اور گویا ہوا:

''دراصل شیو کے اخراجات بچا کر بیگم کے میک اَپ کے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کروں گا۔''

لیکن آپ کو خط تو پھر بھی باقاعدگی سے بنوانا پڑے گا۔ اس کے اخراجات تو ہوں گے۔'' ہم نے اعتراض کیا۔

''خط بنوانا پڑے گا مگر اخراجات مکمل شیو کے خرچ سے بہت کم ہوں گے''۔ اس نے وضاحت کی۔

''زبردست..... آپ کو تو پاکستان کا وزیرِ خزانہ ہونا چاہیے تھا کہ بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے اور ذرائع نہ سوجھتے

تو سرکاری ملازمین کی تنخواہوں پہ ٹیکس بڑھا کر ہی یہ کمال کرنے کی کوشش کر گزرتے''۔ ہم نے طنز کیا لیکن اس نے بولنا جاری رکھا: ''اور اب میں ہفتے میں صرف ایک دفعہ اپنے جوتے پالش کیا کروں گا۔ برانڈڈ جوتے خریدنے کی بجائے کسی فٹ پاتھ پہ بیٹھے پٹھان سے جوتے خریدا کروں گا۔ گولڈ لیف کی بجائے ایمپیسی پی کر گزارہ کروں گا۔ کسی مہنگے کلاتھ ہاؤس کی بجائے کسی پھیری والے سے کپڑے خریدا کروں گا.....''

''دیکھو!'' ہم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یار! حالت اب ایسی بری بھی نہیں جیسی آپ بیان کر رہے ہیں۔ دراصل آپ پر یہ افتاد نئی نئی پڑی ہے اس لیے آپ کے اوسان خطا ہو رہے ہیں۔ چند دن انتظار کرو، سب کچھ نارمل لگنے لگے گا۔ ہر شادی شدہ مرد کی یہی داستان غم ہے جو آپ سنا رہے ہیں۔ ایسا سب مردوں کے ساتھ ہوتا ہے؟

''اچھا..... یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے؟'' اُسے کچھ حوصلہ ہوا اور چہرے کی رنگت میں خفیف سی مثبت تبدیلی پیدا ہوئی۔

''اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے؟'' اس نے پھر مسکین صورت بنا کر پوچھا۔ اس کے چہرے پہ ایسی مظلومیت اور بے چارگی چھائی تھی کہ اس لمحے وہ ہمیں ہر قسم کے صدقے، زکوٰۃ، خیرات اور امداد کا سب سے بڑا مستحق نظر آیا۔

''حل ہے..... بالکل ہے''۔ ہم نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''اس مقصد کے لیے انجمن حقوقِ مرداں بنانے کی ضرورت ہے۔''

''انجمن حقوقِ مرداں''؟ وہ الجھ سا گیا۔

''جی..... انجمن حقوقِ مرداں''۔ ہم نے زور دے کر کہا۔ ''خواتین نے انجمن حقوقِ نسواں جیسی تحریکیں چلا کر ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ انہیں اپنے حقوق تو مل سکے یا نہیں، مردوں کے حقوق ضرور سلب ہو گئے۔ ہر زہر کا تریاق

نصیب

شروعات سفر تھا اک داغ بدنماں
انجام سفر ہوا بڑا ہی خوشنماں
وہی نکلا نصیب دوستاں
تھا میں سمجھا نصیب دشمناں

(شاکر لطیف، جوہر ٹاؤن)

ہوتا ہے اور انجمن حقوقِ نسواں کے اثراتِ بد کا تریاق انجمن حقوقِ مرداں کے سوا کوئی اور نہیں''۔

وہ بڑے اشتیاق سے ہماری بات سن رہا تھا۔ ہم نے بات جاری رکھی: ''لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں۔ ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے وہ مرد ساتھی ہی ہوں گے زن مریدی جن کی نس نس میں بس چکی اور جو اس سعادت مندی کو کھونے پر بالکل تیار نہیں ہوں گے۔''

''پھر تو کافی مشکل ہے''۔ مایوسی بدستور قائم تھی۔

ہمیں غصہ آ گیا۔ ''یار! تم بھی اللہ میاں کی گائے ہو۔ بات بات پہ مایوس ہونا مردوں کا شیوہ نہیں۔ بس آج سے ہی انجمن حقوقِ مرداں کا آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بانی ارکان ہم دونوں ہیں۔ امید ہے بہت سارے اور متاثرینِ شادی مرد بھی جلد اس قافلے میں شامل ہو جائیں گے اور پھر تم دیکھو گے کہ بہت جلد ہم نسوانی بالادستی سے نجات حاصل کر کے مردوں کی طرح جینے کے قابل ہو جائیں گے۔'' ہمارے اس مختصر اور برہم خطاب نے اس کے اندر خوابیدہ مردانہ ہمت کو کسی حد تک جگا دیا۔ وہ پُرامید نظر آنے لگا۔ شاید اُسے غلامی کی زنجیریں ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہوا تو کافی حد تک پرسکون لگ رہا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ ہمارے نامۂ اعمال میں کافی نیکیاں لکھ دی گئی ہوں گی۔ کسی مایوس آدمی کو مایوسی سے نکال کر امید کی طرف لانا نیکی نہیں تو اور کیا ہے؟

◆◆◆

یہ بیسویں صدی کا آخری سال تھا۔ میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں ضلع رحیم یار خان کی تحصیل صادق آباد پہنچا۔ تینوں صوبوں کے سنگم پر موجود اس علاقے میں دل لگانے کی کوشش میں تھا کہ کتابوں کی کشش مجھے ''اردو مبارک لائبریری'' لے گئی۔

قریبی قصبے سنجر پور سے تھوڑا آگے نہر کنارے، آموں کے باغات اور کھجوروں کے جھنڈ میں گھری بستی محمد آباد واقع ہے۔ یہ کتب خانہ اسی بستی میں واقع ہے۔ لائبریری کی سرخ عمارت کے سامنے دائیں سمت نیم اور بکائین کے درختوں تلے چھڑکاؤ لگی کچی زمین پر کرسیوں، مونڈھوں کی دو قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک آرام کرسی پر پُرکشش شخصیت دکھائی دی۔ سفید جھالر کی طرح بال، بڑی بڑی مونچھیں، روشن آنکھیں، مسکراتا چہرہ اور سامنے میز پر کتابیں، اخبار اور رسالے سجائے سید انیس شاہ جیلانی بیٹھے تھے۔

تعارف ہوا، تعلق بنا اور انہوں نے ایسا نبھایا کہ آج جب وہ یاد آتے ہیں اور میں ان کے لکھے سینکڑوں خطوط اور کارڈ دیکھتا ہوں تو موتیوں جیسے لفظ مسکرانے لگتے ہیں اور میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ میں لائبریری سے زیادہ ان کی شخصیت سے متاثر ہوا۔ وہ ایک مفکر، دانش ور، غالب شناس، کتاب دوست سے زیادہ انسان دوست، اور درویش آدمی تھے۔

کتابیں لکھنے اور پڑھنے والوں سے وہ حد درجہ محبت کرتے تھے۔ اجنبیوں کو بھی کتابیں پڑھنے کے لیے دے دیتے اور بعد میں خط لکھ لکھ کر ان سے اپنی کتب واپس کرنے کا مطالبہ کرتے رہتے۔ جب کہ اسی خطے سے تعلق رکھنے والے میر زاہد (اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے) بھی کتابوں کے شیدائی تھے۔ اُن کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا لیکن ان کی کتابیں عوام تو کیا خواص کی دسترس میں بھی نہیں تھیں اور نہ ہیں۔

انیس شاہ اردو اور سرائیکی کے ایک منفرد لکھاری تھے۔ سندھی بھی جانتے تھے۔ آخری عمر تک ان کی خواہش انگریزی زبان سیکھنے کی رہی۔

وہ ایک بے باک اور نڈر آدمی تھے۔ ایک بار ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعض خطوط میں نجی باتیں اور کئی ایسے تبصرے موجود ہیں جن کی اشاعت پر کچھ لوگ ناراض ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا انہیں حذف کر دیں۔ کہنے لگے ''نہیں جو لکھا ہے اسے چھپنا چاہیے۔'' ''سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان'' میں بھی بے لاگ تبصرے اور تنقید ان کی بے ریا شخصیت کی عکاس ہے۔

ان کے والد مبارک شاہ نے ۱۹۲۶ء میں پنجاب کے اس

دُور افتادہ قصبے میں ''اردو مبارک لائبریری'' کی بنیاد رکھی۔ آج بھی یہ کتب خانہ صحرا میں نخلستان کی مانند ہے۔ انیس شاہ کی علم دوستی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ آج بھی ایسے دیوانے موجود ہیں۔

انیس شاہ جیلانی نے اپنے والد کی وفات کے بعد اس لائبریری کو ایسا سنبھالا، نبھایا اور بڑھایا کہ آج وہاں چھبیس ہزار سے زائد کتب موجود ہیں۔ کتب خانے کی بڑی خصوصیت اس میں موجود مخطوطات اور مشاہیر کے خطوط ہیں۔ کئی محقق پی۔ایچ۔ڈی اور ایم۔فل کی سطح کے مقالے لکھتے ہوئے لائبریری کی کتب سے فیض یاب ہو چکے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مبارک لائبریری میں بہت سے ادیبوں، شاعروں اور مشاہیر کی تصاویر بھی موجود ہیں جو یقیناً علمی ادبی تاریخ مرتب کرنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں نے ہمیشہ انیس شاہ جیلانی کے کام کو سراہا اور حیرت و محبت سے دیکھا ہے۔ لیکن افسوس! ہمارا صاحبِ اختیار و اقتدار حلقہ اس طرح کے تہذیبی، ثقافتی اور علمی ورثے کو سنبھالنے والے کے ہاتھ مضبوط کرنے سے قاصر رہا۔

انیس شاہ سچے، کھرے اور محبِ وطن پاکستانی تھے۔ سیاست اور سیاست دانوں پر بے لاگ تبصرے ان کی دانائی کا پتا دیتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے حلقہ احباب کی نظریاتی آبیاری کی۔ ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی اردو شعر و ادب کی آغوش یعنی سردار احمد جعفری اور رئیس امروہوی کی صحبت میں گزری۔ ان کی زبان اور تحریر ایسی نکھری ہوئی اور ایسی اُجلی تھی کہ کیا اہلِ زباں لکھتے بولتے ہوں گے۔ خطوط لکھنے میں اور خاص طور پر اختصار سے لکھنے میں شاید ہی ان کا کوئی ثانی ہو۔

غلام رسول مہر کے نام انھوں نے ۴۰۰ سے زیادہ خطوط لکھے تھے۔ یہ اب اسلامیہ یونیورسٹی کے اردو نصاب کا حِصّہ ہیں۔ سرائیکی میں تحریر کردہ ان کے مضامین کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر شاملِ نصاب ہیں۔

پاکستان کے چاروں صوبوں کے ادیبوں سے ان کے مراسم اور روابط تھے۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب ان کے ہاں مہمان نہ آتے ہوں۔ وہ بڑے مہمان نواز تھے۔ تحقیقی مقالہ جات کے سلسلے میں لوگ مہینوں ان کے مہمان رہتے۔ پاکستان بھر سے آئے محققوں کے ساتھ ان کا تعاون مثالی اور حیران کر دینے والا ہوتا۔ نادر و نایاب کتابیں بلاخوف و خطر اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیتے۔ نہایت خوش خط شخص تھے۔ ان کی لکھائی کے سامنے جدید کمپیوٹر پرنٹنگ بھی ماند ہے۔ اچھے کاغذ اور قلم کے وہ شیدائی تھے۔ ان کی نفیس طبیعت پر بُری لکھائی، بے ترتیبی اور ناقص کاغذ گراں گزرتا تھا۔ انیس شاہ کی کتاب ''معاصرین مبارک'' شائع ہوئی تو گھٹیا کاغذ پر چھپ جانے سے انھیں بہت افسوس ہوا۔

سرائیکی زبان کے منفرد لکھاری تھے۔ ایک بار ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ پروفیسر شوکت مغل (اردو، سرائیکی لکھاری، محقق) کا کہنا ہے' انیس شاہ تین سو سال پرانی سرائیکی لکھ رہا ہے۔ ارے بھئی یہی بات تو میرے لیے سند ہے کہ میں اصل سرائیکی لکھ رہا ہوں۔

انیس شاہ جیلانی آج چترا پریتم کی اداس کر دینے والی پینٹنگ کے پسِ منظر میں موجود مٹی کی ڈھیری تلے جا سوئے ہیں۔ ؎

یادیں رہ گئیں' باتیں رہ گئیں' اللہ جل شانہٗ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے جاں نشینوں کو ان کا کام سنبھالنے کی ہمت و شوق عطا کرے۔

(انیس شاہ جیلانی جون ۲۰۱۷ء میں انتقال کر گئے۔ آپ کی کتب میں آدمی غنیمت ہے' سفرنامہ مقبوضہ ہندوستان' نوازش نامے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔)

◆◆◆

مسئلے تقدیر کے

رضیہ بٹ

انسان اپنی مرضی کو سیدھی سمجھتا ہے، کبھی کبھی قسمت کے نرالے کھیل اُسے کھوٹی بنا دیتے ہیں

بات ختم کر کے نسیمہ نے فون رکھ دیا۔ خود قریب ہی پڑے صوفے پر بیٹھ کر بڑبڑائی ''میں تو خواہ مخواہ ہی درمیان میں آ گئی۔''

کمرے سے آصف نکلتے ہوئے بولے ''کیا بات ہے، کس کا فون تھا؟''

''انہی کا......'' وہ جھلا کر بولی۔

آصف مسکرا کر بولے ''مختار صاحب کا۔''

''نہیں ان کی بیگم تھیں۔''

''کیا کہتی ہیں......''

''وہی جو روز کہتی ہیں۔ ثانیہ انہیں اتنی پسند آ گئی ہے کہ رشتہ ہر صورت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ادھر ثانیہ کی اماں ہیں کہ......''

''اوہو......اماں نہیں ممی......'' آصف ہنس کر بولے۔

''ممی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پہلے خود ہی میرے پیچھے پڑی تھیں کہ ثانیہ کے لیے کوئی رشتہ بتاؤ۔ جوان ہو گئی ہے۔ بی اے میں پہنچ گئی ہے۔ یہ ہو گیا ہے وہ ہو گیا ہے۔''

''اب کہتی کیا ہیں۔''

''یہ رشتہ انہیں پسند نہیں آیا۔''

''تو بھئی اس میں الجھنے کی بات کیا ہے۔ لڑکی کی ماں ہیں وہ' نہیں مناسب لگا ہو گا یہ رشتہ۔''

''پاگل ہے' اس سے اچھا رشتہ نہیں ملے گا اسے......لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ اتنی اچھی پوسٹ پر ہے۔ خوبصورت اور شریف ہے۔ سگریٹ تک نہیں پیتا۔ باپ ریٹائرڈ افسر ہے۔ معقول پنشن ہے اس کی، گھر اپنا ہے اور کیا چاہیے۔''

آصف نے نعیمہ کو مسکرا کر دیکھا اور بولے ''بھئی اگر نگار کو رشتہ پسند نہیں تو تم کیوں جز بز ہو رہی ہو۔ صاف کہہ دو لڑکے والوں سے۔''

''کس منہ سے کہوں اتنے حیلے بہانوں سے تو انہیں راضی کیا تھا۔ بھئی آج کل ایسے اچھے رشتے چھوڑتا کون ہے۔''

''بیگم صاحبہ اپنی جان چھڑاؤ۔ کسی طرح زبردستی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں نہ ہی دباؤ ڈالنا ٹھیک ہے۔ کرنے دو دونوں پارٹیوں کو اپنی اپنی مرضی۔''

''ہوں۔''

''دیکھو نعیمہ، چاہو تو ایک بار پھر نگار سے مل کر انہیں بتا دو کہ لڑکے والے کس قدر خواہشمند ہیں' کتنی چاہت سے رشتہ لینا چاہتے ہیں۔ رشتہ ہے بھی انتہائی معقول پھر بھی نگار رضامند نہ ہو تو ان کی مرضی! لڑکے والوں سے معذرت کر لینا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں۔''

''ٹھیک ہے میں کھانے کے بعد جاتی ہوں نگار کی

طرف۔''

☆☆

''پھر یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔''

''ہاں نسیمہ آپا۔ میں معذرت خواہ ہوں ناحق آپ کو تکلیف دی۔ آپ لڑکے والوں سے بہانہ کردیں۔''

''لیکن نگار، میں تمہیں بار بار کہوں گی کہ ایسے رشتے بار بار نہیں ملتے۔ ثانیہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ کہاں ملے گا میری مخلصانہ رائے ہے کہ......''

''آپا شاید آپ اپنی جگہ ٹھیک ہوں لیکن میں ثانیہ کی ماں ہوں۔ ثانیہ میری ایک اکلوتی بیٹی ہے اور آپ جانتی ہیں کہ کس قدر لاڈ پیار میں پالا ہے ہم نے اُسے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے۔ لاکھ لاڈ پیار میں پالو' جانا اس نے دوسرے گھر ہی میں ہوتا ہے اور پھر یہ تو خوش قسمتی ہوتی ہے نگار کہ بروقت اچھا رشتہ مل جائے۔''

''میں بھی جانتی ہوں آپ کو تجربے نے یہ باتیں سکھائی ہیں مگر آپا میں بھی بچی تو نہیں ہوں۔ یہ رشتہ اچھا ہے لیکن ثانیہ کے لیے موزوں نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس میرے خیال کے مطابق یہ رشتہ ثانیہ کے لیے ٹھیک نہیں۔''

''کوئی وجہ بھی؟''

''بس''۔

''کھل کے کہونا۔ لڑکے کی شکل وصورت پسند نہیں' گھر بار ٹھیک نہیں لگا' ماں باپ اچھے نہیں لگے یا گھر کا طور طریقہ پسند نہیں آیا؟ ہاں شاید تم کسی کوٹھی والے کے ہاں رشتہ کرنا چاہتی ہو۔ اس لڑکے کے ماں باپ کے پاس البتہ جہازی سائز کوٹھی نہیں۔ مکان ہے بڑا سا بس۔ ہاں بھئی تم خود بھی تو اب کوٹھی میں رہتی ہو۔''

یہ کہہ کر نگار ہنس پڑی۔ نسیمہ کو اس پر غصہ آگیا۔ جلدی سے بولی ''نگار وہ کوٹھیوں بنگلوں والے کا بھی تو رشتہ آیا تھا؟''

''ہائے آپا نام نہ لیں اس کا' ایسے لوگوں کو تو دور ہی سے سلام! ہم لوگوں کے وارے آسکتے ہیں بھلا مگر وہ رشتہ بھی تم نے ٹھکرا دیا تھا۔ یہ مکان والا بھی چھوڑ رہی ہو۔ آخر تم سوچتی کیا ہو؟''

''ثانیہ کی بہتری ہی کا سوچتی ہوں۔''

''یہاں بہتری نظر نہیں آتی؟''

''نہیں۔''

''کیسے؟''

''ایسے آپا کے لڑکے کی دو جوان بہنیں ابھی کنواری ہیں۔ ان کی شادیاں ہونی ہیں اور آپ جانتی ہیں لڑکے کا باپ ایک ریٹائرڈ آدمی ہے۔ اس کے پاس کیا ہوگا؟ ان شادیوں کا سارا بار لڑکے کے کندھوں پر ہی ہے۔ لڑکا بھی تو تنخواہ دار ہے۔ ان شادیوں پر جو خرچ کرے گا قرض ہی لے کر کرے گا نا۔ ساری عمر یہ قرض اتارتے گزرے گی۔''

نسیمہ نے آنکھیں پھیلا کر نگار کو دیکھا پھر بولی ''تو اس وجہ سے انکار کررہی ہو۔''

''دوسری وجہ یہ کہ لڑکا ماں باپ کے ساتھ ہی رہ رہا ہے۔ جوائنٹ فیملی سسٹم میں جو قباحتیں ہوتی ہیں وہ آپ بھی جانتی ہیں۔ لڑکی کو شوہر کے ساتھ ساتھ اس کے ماں باپ بھائی بہنوں کی بھی غلامی کرنا پڑتی ہے۔ میری ثانیہ اتنی پابندیوں میں نہیں رہ سکتی۔''

''نگار۔''

''جی آپا۔''

''یہ تم سے کس نے کہا کہ لڑکے کے کندھوں پر بہنوں کی شادیوں کا بار ہے۔''

''نظر نہیں آتا کیا؟''

''پگلی ان کی دونوں بیٹیوں کا بار والدین کے کندھوں پر ہے۔ دونوں کے مستقبل کا انہوں نے خود سوچ رکھا ہے اور دونوں کے جہیز اور شادی کا خرچہ وہ خود کریں گے۔''

''سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایک ریٹائرڈ آدمی دو دو ...یوں کی شادی کرسکتا ہے بھلا''۔

''چلو تھوڑی مدد بیٹے سے بھی لیں گے تو کوئی گناہ کی ...ت ہے۔ دوسری لڑکے کے گھر میں رہنے کی بات تو جب ...ک اس کی یہاں پوسٹنگ ہے' وہ ماں باپ کے ساتھ رہ رہا ...ہے۔ جب کسی دوسرے شہر تبدیلی ہوگی تو کیا تب بھی یہیں ...رہے گا؟ کوئی عقل کی بات کرو نگار...... میں نے تو سنا ہے ...قریب اس کی تبدیلی بھی ہونے والی ہے۔ دوسرے شہر چلا ...گیا تو ظاہر ہے ماں باپ ساتھ تو نہیں اُٹھ دوڑیں گے اور یہ ...ی واضح بات ہے کہ جہاں رہے گا بیوی ساتھ رہے گی۔''

''پھر بھی''

''کوئی اور وجہ؟''

''آپا آپ ناراض نہ ہوں۔ میں جو باتیں سوچتی ہوں وہ ...آپ کے ذہن میں نہیں آتیں۔ میں ثانیہ کی ماں ہوں' اس کی ...بھلائی ہی کا سوچوں گی۔''

''جیسے تمہاری مرضی...... لیکن مجھے یہ رشتہ نہ کرنے کا ...افسوس رہے گا۔''

☆☆

نسیمہ باورچی خانے میں نوکرانی کو دوپہر کے کھانے کا بتا ...رہی تھی کہ آصف دروازے میں آگئے۔

''کیوں؟'' نسیمہ نے انہیں دیکھ کر کہا۔

وہ مسکرائے اور سرگوشی کے سے انداز میں بولے ''وہ ...تمہاری مسز مختار آئی ہیں۔''

''سچ۔''

''ہاں۔''

''اکیلی ہیں۔''

''ساتھ بیٹی بھی ہے۔ جلدی سے آجاؤ ڈرائنگ روم میں ...بٹھایا ہے انہیں۔''

''آتی ہوں۔'' نسیمہ جلدی سے نوکر کو کھانے کا بتاتے ہوئے بولی ''مجھے تو سمجھ نہیں آرہی کیا کہوں گی ان لوگوں سے۔'' وہ قدم اُٹھاتے ہوئے بڑبڑائی۔

آصف دروازے سے ہٹتے ہوئے بولے ''کہنا کیا ہے جو نگار نے کہا ہے بتا دینا۔''

''کتنی بُری بات ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے۔ تم تو خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہو۔''

''بات ہی ایسی ہے'' وہ باورچی خانے سے باہر آتے ہوئے بولیں۔

آصف بولے ''اتنا ہی رشتہ اچھا ہے تو ثانیہ نہ سہی کسی اور ہی کا بھلا کردو۔''

''یہ بات ٹھیک کہی آپ نے! اپنی ناصرہ کی چھوٹی بیٹی ہے نا' اس کی بات نہ کروں؟''

''پہلے پوچھ لو ناصرہ سے کہیں وہ بھی نگار کی طرح اعتراض نہ کرے۔''

''سب کے مغز پھرے نہیں ہوتے۔''

آصف لاؤنج میں چلے گئے اور نسیمہ دوپٹہ ٹھیک کرتے ڈرائنگ روم میں آگئیں جہاں مسز مختار اور ان کی بیٹی عاصمہ بیٹھی تھیں۔

نسیمہ بڑے تپاک سے ملی۔ مسز مختار بہت سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ بڑے شائستہ انداز میں باتیں کرتی تھیں۔ نسیمہ کو ان کی یہی بات بہت پسند تھی۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر مسز مختار بولیں۔ ''میں نے سوچا آج خود ہی حاضر خدمت ہوجائیں۔ فون پر تو ٹھیک سے بات نہیں ہوتی۔ ہماری درخواست کا کیا بنا؟''

نسیمہ چند لمحوں کو پریشان ہوئی۔ پھر بولی ''بہن میں آپ سے شرمندہ ہوں' دراصل بچی کے لیے اس کے ننھیال میں ایک رشتہ ہے' بھابی کی بہن کا بیٹا۔ دونوں بہنوں کی خواہش تھی کہ وہاں رشتہ ہوجائے لیکن مجھے پتا نہیں تھا۔''

مسز مختار نے حیرانگی سے انہیں دیکھا اور کہا ''یہ بات تھی تو

پھر..... آپ کی بھابی پہلے ہی کہہ دیتیں۔ رشتے کی بات چلائی ہی نہ جاتی۔"

"ایسا ہوتا رہتا ہے۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ ناحق میں آپ کو پریشان کیا۔"

چند لمحے نسیمہ معذرتی انداز میں باتیں کرتی رہی پھر بولی "فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں بہن۔ آپ کا بیٹا ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے اسے رشتوں کی کیا کمی۔"

"یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن میری خواہش آپ کے خاندان سے رشتہ لینے کی تھی۔"

نسیمہ پہلے تو جھجکی پھر آہستگی سے بولی "آپ خواہشمند ہیں تو اور اچھی اچھی بچیاں ہیں میرے خاندان میں۔ آصف کی چھوٹی بہن ہیں۔ ان کی بچی پیاری اور بڑی اچھی ہے۔ آپ چاہیں تو دیکھ لیں۔ ویسے وہ لوگ متوسط طبقے کے ہیں۔ جہیز....."

"آپ جانتی ہیں کہ ہمیں جہیز کا کوئی لالچ نہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے۔ میں ناصرہ سے بات کروں گی۔"

"آنٹی پہلے کی طرح نہیں ہوگا....." صائمہ جو کچھ بددل سی ہوگئی تھی آہستگی سے بولی۔

"نہیں بیٹی یہ رشتہ میرے ہاتھ میں سمجھو۔ میں پہلے ہی یہ رشتہ بناتی لیکن جھجک گئی تھی کہ شاید مڈل کلاس کی یہ لڑکی....."

"لڑکی شریف اور شائستہ ہو۔ خاندان اچھا ہو بس اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں چاہتے۔" مسز مختار نے کہا۔

"امی تھوڑی شکل وصورت بھی تو اچھی ہو۔" صائمہ نے ہولے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ناصرہ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔" نسیمہ نے تعریف کی "بڑی سگھڑ سیانی اور شائستہ سی ہے۔"

"پھر تو ہم ضرور دیکھیں گے" مسز مختار نے کہا۔

نسیمہ نے وعدہ کرلیا۔

چائے کے بعد ماں بیٹی اٹھیں جاتے جاتے بھی تاکید کی "اب پہلے کی طرح نہ ہو۔ ناصرہ سے پوچھ گچھ کر ہمیں اطلاع دیجیے گا۔"

"بالکل۔ بالکل....." نسیمہ نے کہا۔

ان کے جاتے ہی وہ آصف کو لے کر ناصرہ کے گھر چلی گئیں۔ ثانیہ خوبصورت اور سمارٹ لڑکی تھی۔ ماں باپ کی لاڈلی تھی جو چاہتی پاتی تھی۔ ماں نے تو خاصا سر چڑھا رکھا تھا۔ حالات سے سمجھوتا کرنے کا شعور اسے قطعاً نہیں تھا۔ فراغت دیکھی تھی اور فراغت ہی چاہتی تھی۔

نیا رشتہ معقول تھا۔ لڑکا تعلیم اور سٹیٹس کے لحاظ سے مسز مختار کے بیٹے سے بڑھ کر تو نہیں برابر ہی تھا لیکن نگار کو اس میں جو خوبیاں نظر آئیں وہ اس کے نظریات پر پورا اترتی تھیں۔

لڑکا چاروں بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھا۔ بڑا بھائی شادی شدہ تھا دونوں بہنیں بھی بیاہی ہوئی تھیں بڑی لاہور ہی میں تھی اور چھوٹی کویت میں۔ کوٹھی نئی بنائی تھی۔ پچھلے سال ہی اس کوٹھی میں یہ لوگ شفٹ ہوئے تھے۔ لڑکا ملازمت کے سلسلے میں ان دنوں اسلام آباد میں تھا۔ گھر والوں کا رکھ رکھاؤ اچھا تھا۔ لڑکے کی ماں مزاج کی کچھ تیز ضرور تھی لیکن نگار خود بھی تو کچھ کم نہ تھی اس لیے یہ بات درخورِ اعتناء نہ سمجھی۔

یہ رشتہ اس کی پسند کا تھا۔ وہ لوگ رشتہ لے کر آئے۔ نگار نے خوب خاطر مدارت کی۔ ثانیہ انہیں پسند آئی۔

نگار اور سلیم بھی ان لوگوں کے ہاں گئے۔ لڑکے سے ملے۔ گھر والوں نے ان کی بھی بڑی آؤ بھگت کی۔ ندیم معقول ملازمت پر تھا۔ شکل وصورت کا بھی اچھا تھا۔ ادھر ادھر سے پوچھ گچھ کرنے پر بھی اس کی شرافت کی تسلی ہوئی۔ دونوں طرف سے رضامندی ظاہر ہوئی تو چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوگئی۔

نگار خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ نسیمہ ملی تو اترا کر کہنے لگی "دیکھا آپا مل گیا نا میرے مطلب کا رشتہ صاف ستھرا رشتہ ہے۔ سب بہن بھائی بیاہے ہوئے ہیں۔ یہ شاندار سجی

سجائی کوٹھی ہے۔ ماں باپ کے ساتھ رہنے کا بھی سوال نہیں کہ لڑکا اسلام آباد میں ہے۔ ثانیہ عیش کرے گی عیش، نہ کوئی بوجھ ہوگا نہ پابندی، میں یہی چاہتی تھی۔ ایسا ہی رشتہ درکار تھا۔"

"مبارک ہو" نسیمہ نے اس کی خوشی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اللہ تعالیٰ بچیوں کو اپنے گھروں میں خوش رکھے۔ ثانیہ خوش رہے گی آپا۔ اس سے اچھا رشتہ شاید ہی کوئی ملتا۔ شادی کب کر رہی ہو۔"

"اگلے ماہ! منگنی کی معمولی سی رسم اسی ہفتے کریں گے۔"

"منگنی کی رسم ضروری تو نہیں تھی۔ شادی جو اتنی جلد کرنا ہے۔"

"ہے تو غیر ضروری لیکن لڑکے کی ماں خواہشمند ہیں۔ میں نے بھی سوچا ٹھیک ہے۔ تھوڑا بہت خرچ ہی ہوگا نا۔ ان لوگوں کی خوشی بھی پوری ہوجائے گی اور ہماری بھی۔ ثانیہ ہی تو ہے ہمارے لیے سب کچھ۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"بس آپا رشتہ اپنی مرضی کا مل گیا ہے مجھے یہی خوشی ہے۔ باقی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ شادی دھوم دھام سے کروں گی ثانیہ کی۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"شکریہ۔"

☆☆

ناصرہ بڑی صابر اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والی عورت تھی۔ ساری زندگی جدوجہد کرتے گزاری تھی۔ مالی حالات اتنے بُرے نہیں تو اچھے بھی نہیں رہے تھے۔ بس کھینچا تانی ہی ہوتی رہی تھی۔ پھر بھی اس نے بچوں کو اچھی تعلیم دلائی تھی۔ تربیت بہترین کی تھی۔ خاص کر بیٹیوں کو تو ہر ماحول میں اپنے آپ کو مدغم کر لینے کا شعور دیا تھا۔ اس کی دونوں بڑی بیٹیاں اسی تربیت کے کارن کامیاب زندگی گزار رہی تھیں۔ نہ کبھی گلہ کیا تھا نہ ہی شاکی ہوئی تھیں۔ چھوٹی بیٹی بھی انہی صفات سے آراستہ تھی۔ اسی سال بی اے کیا تھا اور وہ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی تگ ودو کر رہی تھی۔

نسیمہ اور آصف نے مسز مختار کے بیٹے کی بات کی تو وہ حیران ہوکر بولی "آپا وہ لوگ ہمارے ہاں رشتہ کرلیں گے۔"

"تم رضامند ہو تو انہیں لے آؤں۔" نسیمہ مسکرا کر بولی۔

"لیکن۔"

"کیا۔"

"ہم سفید پوش لوگ ہیں۔ آپا جانتی ہیں ان لوگوں کے شایان شان جہیز نہیں دے سکیں گے۔"

"وہ جہیز کے لالچی نہیں ہیں۔"

"پھر تو..... پھر تو یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی آپا۔"

"رشتہ بہت ہی اچھا ہے۔ پہلے میں نے ثانیہ کے لیے کہا تھا۔"

"پھر وہاں کیوں نہیں کیا؟"

"نگار نے انکار کردیا۔"

"وہ کیوں؟"

"اتنے اچھے رشتے میں اسے دو تین خامیاں نظر آئی تھیں۔"

"خامیاں۔"

"ہاں۔"

"تو پھر۔"

"خامیاں نگار کی نظر میں تھیں ناصرہ!" نسیمہ نے نگار کی باتیں اُسے بتائیں۔ ناصرہ چند لمحے چپ رہی پھر بولی "یہ خامیاں تو نہ ہوئیں آپا۔ بیٹے کس لیے ہوتے ہیں؟ ماں باپ کا ہاتھ بٹانا یا ان کی مدد کرنا برائی ہے کیا؟ یہ تو عبادت کا درجہ رکھتی ہے آپا! وہ بڑے صالح بیٹے ہوتے ہیں جو ماں باپ کا بار اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں۔"

"اپنی اپنی سوچ ہی ہے نا۔ بہرحال نگار کو اپنی پسند کا رشتہ مل گیا ہے۔" نسیمہ بولی "اب تم کہو تمہارا کیا خیال ہے۔"

''میری تو خوش قسمتی ہوگی اگر وہ لوگ نیرا کو اپنا لیں۔''

''میں انہیں لے کر آؤں گی۔''

''میں چشم براہ ہوں گی۔''

مسز مختار اور ان کی بیٹیوں کو نیرا ثانیہ سے بھی زیادہ اچھی لگی۔ بڑے پیار اور بڑے اصرار سے انہوں نے رشتہ مانگا۔ نسیمہ نے ناصرہ کی مالی حالت کا پہلے ہی ذکر کر دیا تھا۔ گھر دیکھ کر بھی انہیں اندازہ ہو گیا لیکن سفید پوشی کا بھرم انہوں نے بڑے وقار اور سلیقے سے قائم کیا ہوا تھا۔

ناصرہ نے ان کے سامنے انکسار سے بات کو دہرایا کہ وہ لمبا چوڑا جہیز دینے کے قابل نہیں۔ معمولی جہیز کے ساتھ اگر وہ نیرا کو اپنانا چاہتے ہیں تو یہ بات اس کے لیے خوشی اور تفاخر کا باعث ہوگی۔

مسز مختار نے ناصرہ سے بغلگیر ہوتے ہوئے اس کی ہر طرح سے تسلی کی ''اللہ کا دیا جو کچھ ہے وہ ان بچوں ہی کا ہے۔ ہم لوگ بھی کوئی کروڑوں والے نہیں ہیں۔ اللہ کا احسان ہے۔ بس دو بیٹیاں ابھی بیاہنے والی ہیں۔ ان کے متعلق بھی کوئی فکر نہیں' سب کا حصہ الگ الگ کر رکھا ہے ہم نے۔ بیٹے کے ساتھ بڑی بیٹی کی بھی شادی کرنا ہے۔ اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں تو پھر دوسری کا رشتہ تلاش کریں گے۔''

ناصرہ اور نسیمہ اگلے جمعہ مختار صاحب کے ہاں گئیں۔ بڑی سڑک سے اترنے والی کشادہ گلی میں دوسرا مکان ان کا تھا۔ مکان خاصا بڑا اور جدید چیزوں سے آراستہ تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ناصرہ مرعوب و متاثر ہوئی۔ اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ پھر وہی بات کہی جو پہلے بھی کہہ چکی تھی ''ہم لوگ آپ کے شایانِ شان جہیز نہ دے سکیں گے۔''

مسز مختار بولیں ''آپ اپنی سب سے قیمتی چیز ہمیں دے دیں گی تو اس کے مقابلے میں جہیز کی کیا وقعت۔''

''یہ بتائیے سجاد آپ کو پسند آیا۔''

''ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہے سجاد بیٹا۔''

''شادی ہم جلدی کرنا چاہتے ہیں'' سجاد کی امی نے چائے کے دوران کہا ''اس کی تبدیلی ہونے والی ہے۔ شادی اس سے پہلے کرنا چاہتے ہیں تاکہ دلہن کچھ دیر ہمارے ساتھ بھی رہ سکے۔''

دونوں شادیاں ایک ہی ماہ میں ہوئیں۔ ثانیہ ندیم کی دلہن بن کر اس کی نئی آراستہ پیراستہ کوٹھی میں اپنے لمبے چوڑے جہیز کے ساتھ آ گئی۔ دونوں طرف سے دھوم دھام کا مظاہرہ ہوا۔ ثانیہ کے لیے بُری بھی بڑھیا سی آئی۔ زیور بھی اچھا خاصا آیا۔ نگار کا پاؤں زمین پر نہیں پڑتا تھا۔ ثانیہ کے سسرال والوں کے آگے بچھی جاتی تھی۔ سسرال والوں نے بھی ثانیہ کا خیر مقدم خندہ پیشانی سے کیا۔ جہیز شاید ان کی امیدوں سے زیادہ ہی ملا تھا۔ گھر تو پہلے ہی بھرا تھا اور لد گیا۔ دو کمرے پہلے ہی ان کے لیے خالی کر دیے گئے تھے۔ ان میں چیزیں سجا دی گئیں۔

ولیمے کے بعد ندیم اور ثانیہ ہنی مون کے لیے چلے گئے۔ تین ہفتے کی چھٹیاں باقی تھیں۔ وہ دونوں نے گھوم پھر کر گزاریں۔ دونوں بہت خوش تھے۔ انہیں خوش دیکھ کر دونوں کے والدین بھی نہال ہو رہے تھے۔

ناصرہ بھی بہت خوش تھی اور مختار اور اس کی بیگم بھی! نیرا جیسی لڑکی بہو کا روپ دھارے ان کے گھر میں آ گئی تھی اور ناصرہ کو سجاد جیسا خوش رو اور خوش خلق داماد مل گیا تھا۔

یہ شادی زیادہ دھوم دھڑکے سے نہیں ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے سادگی ہی کا مظاہرہ ہوا۔ نہ ہی وہ لوگ بری اتنی قیمتی اور زیور اتنا زیادہ لائے تھے کہ جو دیکھتا واہ واہ کہہ اٹھتا اور نہ ہی ناصرہ نے جہیز اتنا دیا کہ گھر میں سجانے کی جگہ نہ رہتی۔ بس واجبی سا کام ہوا تھا۔ ناصرہ تو خیر تھی ہی کم مایہ لیکن مسز مختار نے بھی زیادہ دھوم دھڑکا نہیں کیا۔ ایک تو وہ لوگ فضولیات کے قائل ہی نہ تھے دوسرے بیٹی کی بھی شادی ساتھ ہی کی تھی۔ دو شادیاں سادگی سے کرنا بھی اتنا سہل تو نہیں تھا۔

نیرا اور سجاد بھی ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ زندگی کے رویوں کے بارے میں دونوں کے خیالات ملتے جلتے تھے۔

☆☆

ندیم کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ ثانیہ کو اس نے ساتھ ہی لے جانا تھا۔ ثانیہ پیکنگ کر رہی تھی۔ تین چار سوٹ کیسوں میں اس نے اپنے کپڑے جوتے اور میک اپ کی چیزیں بھر لی تھیں۔ اب کراکری وغیرہ جو پیک ہی پڑی تھی' اکٹھی رکھ رہی تھی۔

''یہ' یہ سب کیا ہے' اتنا ڈھیر لگا دیا۔'' ندیم کمرے میں آتے ہی مختلف ڈبے اوپر تلے رکھے دیکھ کر بولا۔

''کراکری ہے' دوسرے برتن ہیں۔'' ثانیہ بولی۔

''ان کی ضرورت نہیں وہاں گزارے کو ہر چیز موجود ہے' صرف کپڑے لے چلو اپنے۔''

''فرنیچر بھی نہیں جائے گا۔''

''کہنا نا گزارے کی ہر چیز موجود ہے۔ دو تو کمرے ہیں میرے پاس' یہ چیزیں وہاں کہاں رکھو گی۔''

''صرف دو کمرے' پوری کوٹھی نہیں۔''

ندیم ہنس کر بولا ''کس جہاں میں رہتی ہو؟ دو کمروں کا کرایہ بھی تنخواہ میں سے دیا کروں تو چیخا کرو گی۔ اسلام آباد میں پوری کوٹھی کا کرایہ جانتی ہو کتنا ہوتا ہے' ہوش اڑ جائیں گے سن کر۔''

ثانیہ تو بنا سنے ہی سن سی ہو گئی تھی۔ خوابوں کے جزیروں میں زلزلے کے جھٹکے سے محسوس ہوئے تھے۔ وہ تو اسلام آباد میں ایک شاندار سی کوٹھی میں بڑی شان سے رہنے کا تصور کیے ہوئے تھی۔ جہیز کا نیا سامان اس کوٹھی میں سجانے کے خیال سے مسرور تھی۔ دو کمروں کا سوچ کر ہی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ندیم اس کے خیالات سے بے خبر تھا۔ اسی لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے دباتے ہوئے بولا ''یہ کراکری کے ڈبے جہاں سے اٹھائے ہیں وہیں واپس رکھ دو۔ فرنیچر اور دوسری چیزیں بھی گھر میں امی نے سیٹ کر دی ہیں۔ جب چھٹی پر آیا کریں گے تو یہ چیزیں استعمال کر لیا کریں گے۔ ویسے بھی میں کوشش کر رہا ہوں کہ میری پوسٹنگ لاہور ہی ہو جائے۔''

''کیا۔''

''بھئی یہاں اپنا گھر ہے۔ ٹھاٹھ سے رہیں گے کم از کم مکان کا کرایہ تو بچے گا۔''

''یعنی یہاں' یہاں رہیں گے؟''

''ہاں۔ یہاں رہنے سے فائدہ ہے ثانیہ۔ کرایے کی بچت ہوگی۔''

ثانیہ چپ ہو گئی۔ ندیم جلدی سے بولا ''امی کے ادھر آنے سے پہلے یہ سب چیزیں ٹھکانوں پر رکھ دو۔ ان کی اجازت کے بغیر تو کوئی چیز ادھر ادھر نہیں کر سکتا اور تم یہ سب چیزیں اٹھا لائی ہو۔''

''یہ سب چیزیں میری ہیں' میرے جہیز کی ہیں ندیم'' ثانیہ تنک کر بولی۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تم امی کو ابھی نہیں جانتیں' وہ بہت برا مناتی ہیں۔ ان سے پوچھے بنا کوئی کام کیا جائے تو.....''

ثانیہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ گھور کر ندیم کو دیکھا۔ اس کی باتیں اسے اچھی نہ لگیں۔ دو کمروں کے گھر نے پہلے ہی خاصا پریشان کر رکھا تھا اس پر امی کی یہ تعریفیں سن کر وہ جھلا سی گئی۔

☆☆

نیرا اور سجاد بڑی مطمئن اور خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ مختار اور اس کی بیگم دونوں بہت اچھے تھے۔ نیرا کو اپنی بیٹی سمجھتے۔ نیرا بھی ان کی عزت کرتی تھی۔ خدمت گزار لڑکی تھی۔ ساس کی بہت سی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لے لیں۔ سجاد کی ٹرانسفر ہونے والی تھی۔ بیگم مختار نیرا سے کہتی ''بیٹی تو نے مجھے ہر ذمہ داری سے آزاد کر دیا ہے۔ تبدیلی ہو گئی اور تم چلی گئیں تو مجھے پھر سے یہ بار اٹھانا کٹھن لگے گا۔''

''اللہ کرے تبدیلی نہ ہی ہو۔ میں نے سجاد سے کہا ہے کہ وہ تبدیلی رکوانے کی کوشش کریں۔ میں یہاں بہت خوش ہوں

امی۔ ہرے بھرے گھر سے جا کر اکیلے کیسے رہوں گی۔"

"اللہ تعالیٰ تمہیں خوش وخرم رکھے بیٹی..... تبدیلی تو اب ہو ہی جائے گی۔ چار سال ہو گئے سجاد کو یہاں۔"

"تو پھر آپ سب بھی ہمارے ساتھ ہی چلئے گا۔"

"جیتی رہو۔" بیگم مختار نے ہنس کر اسے دیکھا "آیا کریں گے تمہارے پاس بھی۔"

☆☆

ندیم نے تنخواہ لا کر ثانیہ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ثانیہ نے جلدی سے پیسے گنے۔ پھر حیرانی سے انہیں دیکھا اور پریشان ہو کر بولی "یہ کیا ہے؟"

"تنخواہ ہے اور کیا؟"

"تنخواہ بس اتنی۔"

"کٹ کٹا کر اتنی ہی رہ جاتی ہے ہر مہینے۔"

"کٹ کٹا کر۔"

"بھئی کرایہ بجلی پانی گیس کا بل' میس کا بل پٹرول کا بل اور۔ اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی قسط' بینک کے قرضے کی قسط دے دلا کر بس یہی کچھ بچتا ہے۔"

ثانیہ کے ہاتھ سے جیسے نوٹ گر گئے۔ وہ حواس باختہ سی نظر آنے لگی۔ ندیم نے جھک کر نوٹ اٹھائے اور سر جھکاتے ہوئے بولا "ثانیہ تمہیں بتا دوں کہ میرے سر پر کافی قرضے ہیں۔ کوٹھی نئی بنائی ہے نا اس کے لیے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے قرض لیا تھا۔ اس کی قسط میں ہی دیتا ہوں۔ ابا پاکستان میں سے تو نہیں دے سکتے نا۔ اب شادی کے لیے بھی بینک سے قرضہ لیا تھا۔ وہ قسط بھی دینا ہوتی ہے۔"

ثانیہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ ٹکر ٹکر ندیم کو تکے گئی۔ ندیم ہنس کر بولا "فکر نہ کرو۔ اگلے ماہ ہماری بدلی لاہور ہو جائے گی۔ پھر یہ کرایہ تو بچا کرے گا اور یہ بھی تمہارے لیے خوشی کی بات ہوگی کہ اپنی امی ابو کے قریب رہو گی۔"

ثانیہ کو ڈپریشن ہو رہا تھا۔ دو کمروں ہی سے سمجھوتہ نہ کر پا رہی تھی اس پر کٹی کٹائی یہ تنخواہ۔ اُسے بہت غصہ آ رہا تھا۔ ندیم بار بار گھر جانے کی باتیں کر کے اس کے ڈپریشن اور غصے کو بڑھا رہا تھا۔ ثانیہ کو ندیم کی امی کے مزاج کا دو تین بار تلخ تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ ان کے ساتھ ایک گھر میں رہنے کا تصور بھی گراں تھا اسے۔

☆☆

نسیمہ ناصرہ کے ہاں آئی تو نیرا بھی وہیں تھی۔ بہت نکھر آئی تھی نیرا۔ چہرے سے بشاشت عیاں تھی۔ بات بات پر مسکراتی تھی۔ نسیمہ نے اسے لپٹا کر پیار کیا "کیسی ہو۔ خوش باش ہونا اپنے گھر میں۔"

"بہت خوش ہوں آنٹی۔"

"گھر والے سب اچھے ہیں نا تمہارے ساتھ۔"

"بہت اچھے ہیں آنٹی' مجھے تو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ سسرال میں رہتی رہی ہوں۔"

"رہتی رہی ہوں کیا مطلب؟"

"ان کی بدلی سرگودھا ہو گئی ہے آپا۔" ناصرہ نے نیرا کی جگہ جواب دیا۔ "ملنے ہی آئی ہوئی ہے۔ کل جا رہی ہے۔"

"اچھا۔"

نسیمہ نیرا سے باتیں کرنے لگی۔ نیرا ساس سسر کی تعریفیں کرتے نہ تھک رہی تھی۔ وہ تھے بھی بہت ہی اچھے۔

"دیکھیں نا آنٹی ہمارا سامان سرگودھا بھجوا دیا ہے۔ میرے جہیز میں جو چیز نہیں تھی' وہ اپنے پاس سے دی ہے۔ میں نے بہتیرا کہا کہ خود آہستہ آہستہ خرید لوں گی لیکن امی نہیں مانیں' ڈھیر ساری چیزیں دی ہیں۔"

"شکر ہے میں تو سرخرو ہوئی" نسیمہ مسکرا کر بولی۔

"ہم تو آپ کے بے حد احسان مند ہیں آپا۔ آپ کے توسط سے ہمیں اتنے اچھے لوگ ملے۔"

"یہ نیرا کی قسمت تھی ناصرہ۔ یہی رشتہ نگار نے ٹھکرا دیا تھا اب دیکھو اس کو رو رہی ہے نصیبوں کو۔"

"کیوں کیا ہوا؟" ناصرہ اور نیرا نے بیک وقت پوچھا۔

"جن جن باتوں کا اعتراض کیا تھا نا اس رشتے پر وہی باتیں پیش آئی ہیں بچی کو۔"

"ثانیہ خوش تو ہے نا؟" نیرا نے جلدی سے کہا۔

"خوش کیا خاک ہو گئی۔ یہاں بدلی ہو گئی تھی نا ان کی بھی..... ساس نے تو جیسے پنجے تلے دبا کر رکھا ہوا ہے۔ ماں تک کو ملنے کی کھلی چھٹی نہیں بچی کو! قرضے کے بار ہیں ندیم کے سر پر! گھر بنانے کے لیے قرضہ لیا تھا۔ شادی بھلا اتنے دھوم دھڑکے سے کرنے کی کیا ضرورت تھی جو برسوں قرضہ ہی اُتارنا پڑے۔ آدھی تنخواہ قرضے میں چلی جاتی ہے آدھی ساس خرچے میں کاٹ لیتی ہے۔ معمولی سا جیب خرچ ملتا ہے دونوں کو۔"

"ہائے بیچاری....." ناصرہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میرے سسرال والے تو اُلٹا ہمیں دیتے ہیں آنٹی۔ آٹھ مہینے ہم ان کے ساتھ یہاں رہے ہیں۔ کھانے پینے تک کا خرچہ نہیں لیا۔ وہ تو ہم ہی حیلے بہانے بھی امی بھی ابا اور کبھی آسیہ کے لیے چیزیں لے آئے تھے۔"

"اللہ تمہیں اس سے زیادہ خوشیاں دے بیٹی۔ اپنے ساس سسر کی ہمیشہ خدمت کرنا۔ ایسے فرشتہ خصلت لوگ آج کل ملتے کہاں ہیں۔"

☆☆

"آؤ آؤ نگار کیسی ہو' کیسے آئیں۔" نسیمہ نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نگار دھم سے صوفے میں گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ بہت دلگیر لگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے' خیر تو ہے۔" نسیمہ اس کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کیا بتاؤں آپا..... ثانیہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔"

"کیوں؟"

"ساس نے ناک میں دم کر رکھا ہے میری بچی کے..... ناحق بدلی ہو گئی یہاں۔"

"وہ تو سنا ہے ندیم نے خود ہی کروائی تھی۔"

"اندر کے حال میں کیا جانتی تھی۔ اتنے قرضے ہیں اس کے سر پر چار پانچ سال میں بھی اتر نہ پائیں گے۔ صرف یہی نہیں اب تو ایک اور مصیبت آ گئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ندیم کی بہن جو لاہور میں ہی ہے۔"

"ہاں ہاں۔ دو تین بچے بھی ہیں اس کے۔"

"اسے کیا ہوا؟"

"وہ بھی میکے آ بیٹھی ہے؟"

کیوں؟"

"اس کی شوہر سے ان بن ہو گئی ہے۔ لڑ کر میکے آ گئی ہے طلاق لے رہی ہے وہ۔ ثانیہ کے سر پر چڑھ کر بیٹھے گی۔ پہلے ہی کون سا اسے سکھ کا سانس لینے دیا جاتا ہے۔ اس پر یہ افتاد....."

نسیمہ نے گہری سانس لے کر نگار کو دیکھا۔ اس کا غرور اور ہنکار سامنے آ رہا تھا۔ بیٹی کی تقدیر تو جیسے وہ خود لکھنا چاہتی تھیں۔ وہی باتیں پیش آ رہی تھیں جن کے لیے اتنا اچھا رشتہ مسترد کیا تھا۔ نگار اس وقت بہت دکھی ہو رہی تھی۔ اس لیے نسیمہ نے کوئی بات جتلانی مناسب نہ سمجھی۔ نگار کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے صرف اتنا کہا "یہ سب تقدیر کے مسئلے ہوتے ہیں جنہیں انسان سمجھ نہیں پاتا۔"

"ہاں آپا۔" نگار دونوں ہاتھوں پہ چہرہ گرا کر روتے ہوئے بولی۔ "ہیں تو تقدیر کے مسئلے لیکن انسان کی تدبیر بھی عقل کی پابند ہو..... تو..... کاش میں نے وہ پہلا رشتہ مسترد نہ کیا ہوتا۔"

"اب کیا فائدہ..... اب ثانیہ کو حوصلہ دیا کرو اور خود ہمت سے کام لو۔ اللہ بہتر کرے گا۔" نسیمہ نگار کو تسلیاں دینے لگی۔

آملہ

وٹامن سی کا خزانہ

صبا عمران

یہ پھل قوت وتوانائی کا مخزن ہے۔ جو لوگ آملے کا خوردنی استعمال کریں، وہ صحت کے ساتھ لمبی عمر پاتے ہیں۔ یہ پھل زمانہ قدیم سے ہندوستان اور مشرق وسطی میں قیمتی ادویہ کے جُز کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ آملہ قدرت کی طرف سے انسان کے لیے قیمتی تحفہ اور متعدد بیماریوں کا مؤثر علاج ہے۔ یہ طویل اور صحت مند عمر پانے کے لیے فطری نعمت ہے۔

آملہ کی اہمیت کا بڑا سبب اس میں موجود وٹامن سی کی بہت زیادہ مقدار ہے۔ تحقیق کے مطابق اس میں موجود وٹامن سی کی مقدار دنیا کے تمام پھلوں سے زیادہ ہے۔ اس کے ایک سو گرام تازہ پھل میں ۴۷۰ سے ۶۸۰ ملی گرام وٹامن سی ہوتا ہے۔ خشک آملہ کے ایک گرام میں ۲۴۲۸ سے ۳۴۷۰ ملی گرام وٹامن سی ہوتا ہے یہاں تک کہ اسے سائے میں رکھ کر خشک کر کے سفوف بنایا جائے تب بھی اس میں ۱۷۸۰ سے ۲۶۴۰ ملی گرام وٹامن سی ملتا ہے۔

آیورویدک معالجین اور حکما اپنی ادویہ میں آملہ کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ اسے کئی طرح استعمال کرنا ممکن ہے۔ کچے پھل کا رس پیا جاتا ہے۔ سلاد کی طرح کچا آملہ کھانا بہترین طریقہ ہے۔ اس سے وٹامن سی کی بہت کم مقدار ضائع ہوتی ہے۔ اس کا اچار اور مربہ بھی ڈالا جاتا ہے۔ خشک کر کے سفوف بنا کر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

چستی اور توانائی کے لیے:

اگر تازہ آملہ روزانہ صبح کھایا جائے تو جسم میں چستی اور توانائی آتی ہے۔ اگر تازہ آملہ میسر نہ ہو تو خشک پھل کا سفوف شہد میں ملا کر استعمال کرنا مفید ہے۔

ذیابیطس کے لیے:

سفوف آملہ، جامن اور کڑوا پیٹھا ہم وزن لے کر ملا لیں۔ اس مرکب کا ایک چمچ روزانہ ایک یا دو بار لینا ذیابیطس کے مرض کو بڑھنے سے روکتا ہے۔

جوڑوں اور گنٹھیا کا درد:

خشک آملہ کا سفوف ایک چمچی ایک چمچ شکر کے ساتھ ایک ماہ تک استعمال کرنے سے جوڑوں اور گنٹھیا کے درد میں آرام آتا ہے۔

پیچش اور اسہال:

خشک آملہ پیچش اور اسہال میں بہت فائدہ دیتا ہے۔ آملہ، لیموں کا رس اور مصری سے تیار کیا ہوا شربت بیکٹریا سے پیدا ہونے والی پیچش روکتا ہے۔ آملہ کے پتوں کو کچل کر شہد ملا کر کھانے سے اسہال اور پیچش میں آرام آتا ہے۔

آنکھوں کے امراض:

شہد کے ساتھ آملہ کا رس پینے سے نظر تیز ہوتی ہے۔ آملہ کا مربہ کھانے سے بھی نظر تیز ہوتی ہے۔

سکروی کا علاج:

جلد کا ایک مرض، سکروی وٹامن سی کی کمی سے پیدا ہوتا ہے۔ آملہ میں وٹامن سی کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ خشک آملے کا سفوف شہد میں ملا کر دودھ کے ساتھ پینا نہایت مفید ہے۔

تقویتِ دل:

آملے کو قلب کے لیے بہترین ٹانک قرار دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں آملہ کا مربہ ایک دو دانے روزانہ کھانا مفید ہے۔ اس سے امراضِ قلب سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

کھانسی اور گلے کی تکلیف:

آملے کا مربہ کھانے سے کھانسی دور ہوتی ہے۔ گلا صاف ہوتا ہے اور سانس کی تکالیف بھی دور ہوتی ہیں۔ مربے کو گرم دودھ کے ساتھ کھایا جائے تو فوائد دگنے ہو جاتے ہیں۔

حاملہ خواتین کے لیے:

آملہ غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس لیے حاملہ خواتین کے لیے ٹانک کا درجہ رکھتا ہے۔ ۵۰ گرام آملوں کو ۲۰۰ گرام پانی میں اُبالیں۔ جب ۸۰ گرام پانی رہ جائے تب اس میں شہد ملا کر کھائیں۔ زچہ اور بچہ دونوں کے لیے مفید ہے۔ اس کے علاوہ آملہ پیس کر روزانہ دس گرام سفوف گائے کے دودھ کے ساتھ نوش کیجیے۔ اس سے طاقت ملتی ہے۔

یرقان کا علاج:

آملے کا سفوف لسی کے ساتھ پینے سے یرقان میں آرام آتا ہے۔

ہڈی ٹوٹ جائے تو:

اگر ہڈی ٹوٹ جائے تو ڈاکٹری علاج کے ساتھ ساتھ باقاعدگی سے آملے کا رس کسی پھل کے رس میں ملا کر پیجیے۔ جلد آرام آتا ہے۔

خارش سے چھٹکارا پائیے:

خشک آملے کا سفوف بدن پر لگانے سے کھجلی دور ہوتی ہے اور پھوڑے پھنسیاں بھی دور ہوتے ہیں۔

دانت صاف کیجیے:

آملے کا سفوف منجن کے طور پر انگلی سے دانتوں پر ملیں۔ مسوڑھوں سے خون آنا بند ہوگا، دانتوں کا میل صاف رہے گا اور ہلتے دکھتے دانتوں کو بھی آرام ملے گا۔

نکسیر پھوٹ جائے تو:

دس گرام آملہ پانی میں کوٹ کر چھان لیں۔ بعد ازاں اس میں مصری ملا کر پینے سے نکسیر کا خون بند ہو جاتا ہے۔

لازوال جوانی کے لیے:

آملہ میں نئی قوت اور توانائی مہیا کرنے کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ یہ انسان کی قوتِ مدافعت بڑھاتا اور اسے بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ جسم کے غدودوں کو بھی فعال کرتا اور جلد اور بالوں کو جوان رکھتا ہے۔ اس کے اجزاء عمر بڑھنے کے ساتھ پیدا ہونے والی شکست وریخت کو روکتے اور بڑھاپے میں بھی توانائی برقرار رکھتے ہیں۔

آملہ اور بال:

آملہ کے پھل کاٹ کر اس کے ٹکڑے سائے میں خشک کر لیں۔ پھر ان خشک ٹکڑوں کو ناریل کے تیل میں ڈال کر اتنا پکائیں کہ جل جائیں۔ یہ تیل پھر محفوظ کر لیں۔ یہ بال گرنے اور سفید ہونے سے بچاتا ہے۔

آملے کا سفوف پانی میں ملا کر گاڑھا سا لیپ بنا لیں پھر اسے بالوں کی جڑوں میں لگائیں۔ کچھ دیر بعد سر دھو لیں۔ اس سے بال سیاہ ہوتے ہیں۔ کسی قسم کا شیمپو اس کے ساتھ استعمال نہ کریں۔

چار آملے رات کو بھگو کر صبح انھیں مل کر چھان کر یہ پانی پینے سے گرتے بال رک جاتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ یہ عمل باقاعدگی سے چند مہینوں تک کیا جائے۔

●●●

ایک عمر رسیدہ قاری کے قلم سے
زمانہ طالب علمی کی خوش کن یادیں

ماسٹر خوشی محمد کی پیسٹری

محمد امین باجوہ

ایک زمانے میں پرائمری جماعتیں چوتھی جماعت تک ہوتی تھیں۔ چوتھی جماعت کا امتحان ضلعی سطح پر ہوتا تھا۔ پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں مڈل کی کلاسیں کہلاتی تھیں۔ آٹھویں جماعت کا امتحان ورنیکولر مڈل کلاس سرٹیفکیٹ دینے کی خاطر پنجاب یونیورسٹی لیتی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے ماتحت موجود بھارتی پنجاب، ہماچل پریش اور مغربی پنجاب کے علاوہ صوبہ سرحد کا علاقہ بھی تھا۔ کراچی یونیورسٹی بھی پاکستان بننے کے فوراً بعد قائم ہوئی۔ اِس لیے موجودہ پاکستان سارے کا سارا پنجاب یونیورسٹی کے ماتحت ہی تھا۔

چوتھی جماعت تک جماعتیں درختوں کے سائے تلے ہوتی تھیں اور پانچویں جماعت کو کمرا مِل جاتا۔ اِسی لیے پانچویں جماعت تک کلاس میں آنے جانے کی تہذیب پوری طرح کوئی بھی استاد نہیں سکھاتا تھا۔ رفع حاجت کرنے یا پانی پینے کے لیے جانا ہوتا تو ماسٹر صاحب سے اجازت لیتے۔ واپسی پر آ کر چُپ چاپ کلاس میں بیٹھ جاتے۔

چوتھی جماعت کے فوراً بعد مجھے میعادی بخار (ٹائی فائیڈ) ہو گیا۔ کچھ عرصہ قبل ہی میری ہم عُمر بھتیجی ثریّا اِسی بیماری سے فوت ہو گئی تھی۔ جب میں تین سال کا تھا تو مجھ سے بڑا بھائی حلیم بھی بیمار ہو کر وفات پا چُکا تھا۔ اِس لیے والد صاحب کو میری صحت کی بڑی فکر تھی۔ مجھے اپنی والدہ اور والد کے پریشان چہرے ابھی تک یاد ہیں۔

ایک دِن والد فجر کی نماز ادا کر کے آئے تو دبے انداز سے والدہ سے پوچھا کہ ابھی تک زندہ ہے کہ نہیں؟ مجھے تھوڑا تھوڑا ہوش تھا۔ میں نے یہ الفاظ سُنے بھی لیکن اتنی چھوٹی عمر میں موت کا کوئی خوف ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ آخر چند دن بعد میں ٹھیک ہونے لگا۔ دو تین ہفتے بعد میری صحت پوری طرح بحال ہو گئی۔ پانچویں جماعت کو شروع ہوئے تقریباً

تین ہفتے تو ہو چکے تھے۔ والد مجھے مع بستہ کے سائیکل پر دَس بجے اسکول چھوڑ آئے۔ میں حسب معمول پانچویں جماعت کے کمرے میں جا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

یونیفارم پانچویں جماعت میں لازم ہو گئی تھی۔ سَر پر جناح کیپ، اور ساتھ سفید شلوار قمیص۔ میں یونیفارم پہن کر گیا تھا۔ ایک بالکل نئے چھوٹے قد کے اور موٹی موٹی انگلیوں والے ماسٹر صاحب انگریزی پڑھا رہے تھے۔ پانچویں میں ہی اے بی سی سے انگریزی کی تعلیم شروع ہوتی تھی۔ پیریڈ کے خاتمہ پر وہ میرے پاس آئے اور کان سے پکڑ کر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ پھر دُوسرا۔ پھر تیسرا، آناً فاناً سب کچھ ہو گیا۔ میرا جناح کیپ دور جا گرا تھا۔

وہ ٹوپی ایک ہم جماعت نے اُٹھا کر واپس کی۔ ماسٹر صاحب یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ اِس کو کمرے کے اندر داخل ہونے کی تہذیب کسی نے نہیں سکھائی۔ ہمیں واقعی کسی نے نہیں سکھائی تھی۔ کلاس روم ہوتا تو کوئی سِکھاتا۔ بہرحال ماسٹر صاحب سے مار کھا کے نہ رونا اور نہ گھر جا کر شکایت کرنا ہمیں سکھایا گیا تھا۔ اُس پر عمل کرنے کی نوبت نہ پہلے کبھی آئی اور نہ بعد میں کبھی آئی۔ سب مضامین میں سے انگلش ہی میرا سب سے بہتر مضمون رہا۔ یہ اپریل ۱۹۴۸ کا واقعہ ہے۔ اُس کے بعد جناح کیپ کی جو مٹی پلید ہوئی وہ قومی تاریخ کا المناک باب ہے۔ ہم نے رشوت دینے لینے میں آسانی پیدا کرنے کی خاطر ہر نوٹ پر محمد علی جناح کی تصویر بنا رکھی ہے تاکہ فریقین کے لین دین کے دوران کوئی تو گواہ ہو۔

انگریزی کے استاد کا نام خوشی محمد تھا۔ ان کو بھی چند ہفتوں بعد اندازہ ہو گیا کہ غلط شاگرد کو مار بیٹھے تھے۔ میری اچھی انگلش نے اُن کے ہاتھ ساتویں جماعت تک مجھ سے دور ہی رکھے۔ آٹھویں جماعت میں انگریزی ہیڈ ماسٹر پڑھانے لگے۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے آٹھویں کے امتحان تک ماسوائے اِتوار کے ہر چھٹی ہمارے لیے ممنوع۔

پیسٹری کی کہانی

چھٹی جماعت کی انگریزی کی کتاب میں پیسٹری (PASTRY) کا لفظ درج تھا۔ ماسٹر خوشی محمد نے کلاس سے پوچھا ''پیسٹری کیا ہوتی ہے؟''

سب طلبہ خاموش رہے۔ ماسٹر خوشی محمد کے ڈر سے ایک دوسرے کی طرف بھی نہ دیکھتے کہ سزا دینے کا کوئی اشارہ ہی مِل جائے۔ چند لمحے کسی نے بھی کوئی جواب نہ دیا تو مجھے کھڑا کر کے پوچھا کہ پیسٹری کیا ہوتی ہے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''جی P.A.S.T.R.Y۔''

''میں نے ہجے نہیں پوچھے۔ حاجی صاحب نے کبھی تمہیں پیسٹری نہیں کھلائی؟''

''نہیں جی۔''

''معلوم ہوتا ہے حاجی صاحب شہر میں خود ہی کھا آتے ہیں۔''

انھوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا ''کبھی کسی شادی پر گئے ہو؟''

''جی بھائی اسلم کی، بھائی احمد حسین کی، بھائی محمد علی کی شادی پر گیا تھا۔''

''تو انہوں نے چائے کے ساتھ کیا کھلایا تھا؟''

''بوندی کے لڈّو، ساتھ برفی، شکر پارے اور جلیبیاں۔''

''بس؟''

''جی بس۔''

''کمال ہے، جماعت میں کسی لڑکے نے کبھی پیسٹری نہیں کھائی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ شکل صورت کیا ہوتی ہے؟''

ساری کلاس پھر سہم گئی کہ اب آئی شامت۔ اب تو ماسٹر خوشی محمد ایک ایک کو کان سے پکڑ کر کھڑا کریں گے اور پیسٹری کا حلیہ نہ بتانے پر ایک ایک تھپڑ لگاتے جائیں گے۔ اِس طرح ہمارے کانوں کی کھڑکیاں اچھی طرح کُھل جائیں گی۔ اور

پھر ساری کلاس متوجہ ہو کر ماسٹر صاحب کا بتایا ہوا پیسٹری کا حلیہ اور اُس کی شکل وصورت ساری عمر یاد رکھے گی۔ شُکر ہے نوبت وہاں تک نہ پہنچی۔ ماسٹر صاحب نے اگلا سوال کیا۔

''کیا کریم کبھی دیکھی ہے؟''

کلاس میں کھُسر پھُسر ہونے لگی۔ ایک لڑکا بولا ''آپ تبت سنو کی بات کر رہے ہیں۔''۔

''اوئے نا سمجھو! مُنہ پر لگانے والی نہیں کھانے والی کریم۔ کیا وہ کبھی دیکھی ہے یا سنی ہے؟''

''نہیں جی۔'' سب لڑکے بول اٹھے۔

''وہ مکھن کی طرح میٹھی ہوتی ہے۔ کیک کے ٹکڑوں پر لگا دیتے ہیں تو وہ بن جاتی ہے پیسٹری۔ اچھا یہ بتاؤ کیک کیا ہوتا ہے؟''

اب پھر سب چُپ اور سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

''اوئے! کیک کا بھی پتا نہیں۔ ڈبل روٹی کبھی دیکھی ہے؟''

میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔

''ہاں بتاؤ۔''

میں نے بتایا ''والد صاحب کبھی کبھار لاتے ہیں۔ پھولی پھولی نرم نرم۔''

''ہاں ہاں اور اگر ڈبل روٹی کے آٹے میں انڈے اور چینی ملا کر ڈبل روٹی پکائی جائے تو وہ بن جاتا ہے کیک۔''

اب ماسٹر صاحب کے ڈر سے سب نے کہہ دیا کہ ہاں جی سمجھ آگئی ہے۔ لیکن تصور میں نہ کیک کی تصویر بن سکی نہ پیسٹری کی۔

چھٹی کے بعد ساتویں اور پھر آٹھویں جماعت پاس کر گئے لیکن پیسٹری کی شکل دیکھنا یا کھانا نصیب میں ہی نہیں تھا۔ میں پھر راولپنڈی چلا گیا اور وہاں ہائی اسکول میں داخل ہوا۔ ایک دِن بھائی محمد علی بازار جانے لگے تو مجھے بھی سائیکل پہ آگے ڈنڈے پر بیٹھا لیا۔ ابھی اصغر مال روڈ پر

پیسے کی زیادتی

جناب یحییٰ بن معاذؒ کا ارشاد ہے ''امیر کے لیے مرتے وقت دو مصیبتیں ہیں (دوسرے لوگ ان سے آزاد ہیں) ایک مصیبت تو یہ کہ سارا مال اس سے چھین لیا جائے گا اور دوسری مصیبت یہ کہ قیامت میں اس مال کی پُرسش اس سے کی جائے گی''۔

چڑھے ہی تھے کہ اخبار ہاکر کی زور دار آواز آئی ''مولانا مودودی کو سزائے موت۔ پڑھیے ''تعمیر'' اخبار کا خصوصی ضمیمہ۔''

سائیکل سے اُتر کر اخبار کا خصوصی ضمیمہ خریدا۔ کافی پریشانی ہوئی۔ ہم دونوں بھائی جماعت اسلامی سے ہمدردی رکھتے تھے۔ پھر سائیکل پر سوار ہو کر بازار محلّہ کرتار پورہ سے ہوتے ہوئے جامع مسجد روڈ پر جا رہے تھے۔ آگے ایک بیکری آئی تو بھائی محمد علی صاحب نے اچانک پوچھا ''کبھی پیسٹری کھائی ہے؟''

''نہیں بھائی جی۔''

بھائی نے بیکری سے ایک پیسٹری خرید کر دی۔ آگے ہم راجا بازار کی طرف مُڑ گئے۔ میں نے پیسٹری کا ایک لقمہ کافی کوشش لگا کر کاٹا تو بھائی کہنے لگے ''ارے تم تو کاغذ بھی ساتھ کھا رہے ہو۔''

''کون سا کاغذ؟''

''جو پیسٹری کے گرد چمٹا ہوا ہے۔''

میں نے غور سے دیکھا تو کاغذ نما چیز پیسٹری کے اِرد گرد نظر آئی لیکن معلوم ایسے ہی ہوتا تھا جیسے پیسٹری کا حصہ ہو۔ ماسٹر خوشی محمد نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ پیسٹری کے گرد کاغذ بھی ہوتا ہے۔ میں نے غلطی سے جو کاغذ مُنہ میں ڈال لیا تھا' وہ خفت کے مارے کوشش کر کے نِگل لیا۔ بہر حال پیسٹری کھانے اور دیکھنے سے اسے برتنے کا ڈھنگ ضرور آ گیا۔

علی الصبح مجھے ایک ضروری کام سے شوری جانا تھا۔ شوری چھوٹی سی جگہ ہے اور وہاں کے اسٹیشن پر ریل نہیں رکتی، چنانچہ میں وہاں ہمیشہ کار ہی میں جایا کرتی ہوں۔

میرا پُرانا ڈرائیور کریم تین دن کی چھٹی لے کر اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ اُسے علم تھا کہ کل صبح مجھے جانا ہے۔ وہ یہ وعدہ کر کے گھر گیا تھا کہ مجھے شوری پہنچانے کے لیے بروقت لَوٹ آئے گا۔

رات کے کھانے کے بعد میں زوناش کی مدد سے کچھ ضروری کاغذات سفری بیگ میں رکھ رہی تھی کہ میں نے کہا ''زوناش! کریم اب تک نہیں آیا اور مجھے علی الصبح روانہ ہونا ہے۔''

''ساری رات پڑی ہے خاتون رُوحی! بے فکر رہیے۔ وہ پہنچ جائے گا وعدے کا بڑا پابند ہے۔''

حبشن نے بیگ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

''پابند تو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر کیا پتا؟ کوئی ایسا اتفاق پیش آجائے کہ وہ نہ پہنچ سکے۔ میرے خیال میں احتیاطاً تم زلفی کو فون کر کے کہہ دو کہ ایک دن کے لیے اپنا ڈرائیور بھیج دیں۔''

''بہت اچھا، پر میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کریم اپنے وعدے کا ایسا پکا ہے کہ جس طرح بھی ہو گا وقت سے پہلے پہنچ جائے گا۔''

''تم ٹیلیفون تو کر دو۔''

ساڑھے گیارہ بجے میں نے روشنی بجھا دی اور بستر پر لیٹ کر دوسرے دن کے ضروری کاموں کی فہرست دل ہی دل میں مرتب کرنے لگی۔

یہ دسمبر کی ستم انگیز رات تھی۔ سردی شدید تھی۔ بانس اور صنوبر کے سر بلند درختوں پر خنک ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔

میں ایک شوخ نارنجی رنگ کے لحاف میں بلّی کی طرح دبکی پڑی تھی۔ آتشدان میں چٹخنے والی صنوبر کی لکڑیوں کے شعلے کمرے کی تاریک دیواروں پر یوں لرزاں تھے جیسے کسی پُرانے غیر آباد راستے پر بدرُوحیں دبے پاؤں چل پھر رہی ہوں۔

اچانک گھڑیال نے بارہ بجائے اور میں نے آنکھیں نیند کے لیے بند کر لیں۔ چند ہی منٹ گزرے تھے، دفعتاً دروازے پر کسی کی دستک نے مجھے چونکا دیا۔

''کون ہے؟''

''ڈرائیور۔ کریم ہوں حضور!''

میں نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کریم! تم آ پہنچے؟''

''صبح آپ کو شوری جانا تھا نا!''

میں لحاف میں لیٹے لیٹے بولی ''تم نے ناحق تکلیف کی۔ میں نے صبح کے لیے خاتون زلفی کے ڈرائیور کو بُلا لیا ہے۔ خیال تھا واپسی میں شوری سے تمہیں بھی ساتھ لیتی جاؤں گی۔ تمہارا گھر کہیں اسی قصبے کے آس پاس ہے نا۔''

''جی''

''خیر اب تم آ گئے ہو تو اچھی بات ہے، خیال رہے، علی الصبح نماز کے فوراً بعد روانہ ہو جانا ہے۔''

سردی کی پژمُردہ اور تاریک صبح، میں نے نماز پڑھی۔ زوناش نے گرم گرم کافی پلائی۔ پھر میں شال میں لپٹی لپٹائی باہر نکلی تو کار تیار ملی۔ یہاں تک کہ کریم اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے پابہ رکاب بیٹھا تھا۔

میرے سوار ہوتے ہی کار چل پڑی۔ خنک ہوائیں جسم میں سوئیاں چبھو رہی تھیں۔ میں نے شیشے چڑھا لیے اور سکڑ کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے اُکتائی تو بیگ کھول کر ''پیری لوئی'' کا ''صحرا'' نکال لیا اور مغربی افریقا کی فرانسیسی نوآبادی کے پُراسرار اور پُرفسوں مناظر میری تصور کی آنکھ کے آگے پھرنے لگے۔

میں دیر تک مطالعہ میں مستغرق رہی۔ پھر نظر اُٹھائی تو دیکھا، کافی وقت گزر چکا ہے۔ سردیوں کے غیر دلچسپ پھیکے آسمان پر مریض سا سورج پژمُردہ چہرے سے چمکنے کی کوشش کر رہا تھا اور سفید دھوپ کُہر کو چیر کر میدانوں میں اُتر رہی تھی۔

میں نے کتاب بند کی۔ اِدھر اُدھر بے لطفی سے دیکھا۔ جمائی لی اور بولی ''تم پہلے اس راستے سے جا چکے ہو نا؟ قریب ترین راستے سے چلنا کیونکہ میرا وہاں ایک بجے تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

''حضور میں بارہ بجے آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، اس کے معنی یہ کہ میں ایک گھنٹا آرام بھی کر سکوں گی مگر دیکھو، بہت تیز نہ چلو۔ کہیں ٹکر نہ لگ جائے۔ ایک گھنٹا دیر میں پہنچنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ہم کسی پہاڑ یا درخت سے ٹکرا جائیں اور کبھی نہ پہنچ سکیں۔''

یہ کہہ کر میں نے کتاب کھول لی اور پھر مطالعہ میں غرق ہو گئی۔ اچانک میں اپنی سیٹ پر اُچھل پڑی اور کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے قدموں میں جا پڑی۔ میں نے غصّے سے کریم کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں کار فی گھنٹا ساٹھ میل پر جا رہی ہے؟''

''دیکھ رہا ہوں حضور! مگر بارہ بجے شوری پہنچنا ضروری جو ہے۔''

''کوئی ضروری نہیں''۔ میں نے غصہ ضبط کر کے کہا۔

مجھے لحہ بہ لحہ کار کی رفتار میں اور تیزی محسوس ہونے لگی۔ دیکھا کہ اُس نے رفتار ستر میل کر دی ہے۔ اطراف کے مناظر ہیبت ناک وارفتگی میں اڑے جا رہے تھے۔ سڑک کے کنکر اُڑاڑ کر کار کے شیشوں پر لگ رہے تھے۔ کار کے پیچھے کے شیشے میں سے گرد و غبار کے بگولے اُڑتے نظر آتے تھے۔

''کار روکو''۔ میں نے انتہائی غصّہ کی حالت میں کہا۔

''کار نہیں رُکے گی خاتون روحی۔ بارہ بجے شوری پہنچنا ضروری ہے۔''

''ضروری ہے! کیوں؟''

''کیونکہ بارہ بجنے کے بعد۔۔۔''

''بارہ بجے کے بعد کیا ہوگا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''آپ پہنچ نہ سکیں گی۔''

''کیوں؟''

''جنازہ پہنچ جائے گا۔''

''جنازہ!'' میں نے کانپ کر کہا۔ ''کس کا؟''

اُس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔ کار ضبط و احتیاط کو نظر انداز کر کے ایک بے عنان جنون میں اُڑی جا رہی تھی!

میں بدحواس ہو گئی۔ چیخ پڑی۔ ''روکتے ہو یا نہیں؟''

''نہیں''

میرا خون جسم میں جم گیا۔ ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص ایک خوفناک جنونی ہے یا کسی شدید مرض میں مبتلا۔ وہ میرے پاس چھ سال سے تھا۔ میری تمام کاروں کا وہی نگراں تھا۔ بے حد محتاط تھا۔ ایسا گستاخ کبھی نہ تھا۔

میں کانپ گئی۔ جنازے کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ پیچھے گرد کا طوفان سامنے کنکریوں کی بارش! دروازے کے شیشوں کے ٹوٹنے کا ہر وقت خطرہ! میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ جلد سے جلد کوئی حادثہ پیش آ جائے، اور یہ خوفناک سلسلہ اختتام پر پہنچے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کریم پر نگاہ ڈالی اور خود کو ہچکولوں سے محفوظ رکھنے کے لیے دریچے کے قریب لگے ریشمی ڈورے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا پھر۔ دہشت زدہ ہو کر چیخی:

''کریم! تم بیمار تو نہیں؟''

''اب اچھا ہوں۔''

''یعنی! بیمار تھے؟''

''ہاں''

''تو پھر آئے کیوں؟ تمہیں آرام کی ضرورت تھی۔''

''آپ کو شوری جو پہنچانا تھا۔''

شدتِ خوف کے مارے میرے حلق سے اب آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ لحہ بہ لحہ کار کی رفتار تیز کر رہا تھا۔ اور تیز۔ اور تیز! رفتار پیا آلے کی سُوئی اُوپر چڑھتی جا رہی تھی!! ستر سے اُوپر۔ اسّی! اسّی سے اُوپر نوّے اور پھر۔ نوّے سے اُوپر سو! اب باہر کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ معبود! میرے معبود!! ایک وحشی بگولہ چیخیں مارتا ہوا مجھے فنا کی طرف لیے جا رہا تھا۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ''احمق! یہ کیا کر رہا ہے! اُف اُف۔ خدا کے لیے کار روک دو۔ دیکھو میرے ساتھ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔ کہاں جا رہے ہو؟۔ کہاں؟ لو شوری پہنچ گئے۔ اب تو روکو۔ یہ شوری کا قبرستان سامنے آ گیا۔ آ گیا۔''

میں نے یہ کہہ کر دیوانہ وار چیخ مار دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

کار اپنے جنون میں ایک مٹی کے ٹیلے پر چڑھ گئی اور پھر؟ اور پھر بڑے زور سے جیسے فنا کے قعر میں گر پڑی۔ ایک دھماکے کے ساتھ، جیسے سمندر میں آسمانوں سے بجلی گرتی ہے۔

☆☆☆

جب آنکھ کھلی تو سورج قبرستان پر اپنی بے نیاز شعاعیں پھینک رہا تھا۔ میں ٹوٹی ہوئی کار کے سائے میں لاش کی طرح پڑی تھی۔

اسی وقت قبرستان کا دروازہ کھلا اور لوگوں کے ہجوم کی آواز آئی۔ میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ لوگ ایک جنازہ لیے اندر داخل ہو رہے ہیں۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گزشتہ رات بارہ بجے کے قریب ڈرائیور کریم کا ہیضے سے انتقال ہو گیا تھا۔ اب بارہ بجے اُسے دفنانے کے لیے وہ قبرستان میں لے آئے تھے۔

یہ سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور میں پھر بے ہوش ہو گئی۔

تواضع

حضرت علیؓ فرماتے ہیں، تواضع کی بنیاد تین چیزیں ہیں: آدمی کو جو بھی ملے، اسے سلام میں پہل کرے اور مجلس کی اچھی جگہ کے بجائے ادنیٰ جگہ میں بیٹھنے پر راضی ہو جائے اور دکھاوے اور شہرت کو بُرا سمجھے۔

ہم سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے کہ گھنٹی بج اٹھی۔ یہ میرے لیے انہونی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میں ایک شادی میں شریک تھا۔ پچھلے چند برس کے دوران شادی کی پانچ چھ تقریبات میں جا چکا تھا مگر ہر بار بھوکے واپس آنا پڑا، کیونکہ قطار میں لگنے کی خواہش تو ٹیبلٹی سٹور کے سامنے کھڑے ہو کر پوری ہو چکی تھی، اور کھانے کا شوق بھی خیر سے نہیں تھا۔ سو ہر بار میں اپنی جگہ بیٹھ کے تماش بین بنتا اور دیکھتے ہی دیکھتے کھانا ختم ہو جاتا مگر کھانے پر گھنٹی کی آواز پہلی بار سنائی دی تھی۔

عبدالباسط ذوالفقار

مہذب کون ہے؟

دورِ نو کی بظاہر پڑھی لکھی معزز ہستیوں سے چبھتا ہوا سوال

گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی جو اودھم مچا ''الامان الحفیظ''، شرفا کھانے پہ ایسے ٹوٹے کہ کئی پلیٹیں بھی ٹوٹیں، جام بھی چھلکے، اور دیگوں کے ڈھکن بھی اڑے۔ خوشبو تو وہ لوگ انڈیل کے لائے تھے، سونڈ بونڈ بھی تھے، کمی تھی تو کپڑوں پہ بیل بوٹوں کی، اور یہ کمی سالن کے گرنے نے پوری کر دی۔ جو بھی پلیٹ لے کر جم غفیر میں گھستا اور جب نکلتا تو بیل بوٹوں سے سجا نکلتا۔

یہ ایک تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ کا ولیمہ تھا۔ کسی دور پار کی نسبت سے میں بھی حاضر تھا۔ وہاں جا کر میں پریشان تو تھا ہی، پشیمان بھی ہوا۔ شرفا کھانے پر ایسے ٹوٹے ہوئے تھے گویا کئی دن کے بھوکے ہوں۔ روسٹ ختم ہو چکا تھا۔ سب کی عقابی نظریں تعاقب میں تھیں کہ کب ویٹر روسٹ کی ٹرے لے کر آئے اور وہ اس پر جھپٹ پڑیں۔

ہال میں جگہ جگہ سی سی ٹی وی کیمرے لگے تھے۔ ہوٹل انتظامیہ حالات بھانپتے ہوئے سمجھ گئی تھی۔ سو جیسے ہی ٹرے دروازے سے اندر گئی، وہ خود سی سی ٹی وی فوٹیج میں شرفا کا

ڈرامہ دیکھنے لگی۔ لوگ اس جھپٹا جھپٹی اور دھکم پیل میں ایک دوسرے پر خود کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس شور شرابے میں باریک سی آوازیں کان کے پردوں سے ٹکرائیں۔ دیکھنے پہ معلوم ہوا کہ یہاں تو صنف نازک بھی کھانا پانے کی دوڑ میں شامل ہے۔ کسی نے اسکرٹ پہن رکھا تھا تو کسی نے مردانہ کرتا، کسی نے ٹی شرٹ پہن رکھی تھی تو کوئی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ کسی کا دوپٹہ کہاں جا رہا تھا کسی کا وہاں۔ کئی لڑکیوں کے گلے میں پھندا نما شے لٹک رہی تھی جس کا کچھ حصہ فرش پہ پوچے والا کام کر رہا تھا۔ چھ انچ اونچی ہیل پہنے گھوڑوں کی سی ٹاپوں کی ٹک ٹک قریب تر سنائی دے رہی تھی۔ ہوگو باس اور ایسٹی لارڈ کی مہک پورے ہال میں پھیلی ہوئی تھی۔

یہ مخلوط ولیمہ شہر کے فائیو سٹار ہوٹل میں منعقد ہوا تھا۔ میرے ساتھ والے احباب نے کچھ سمجھتے ہوئے اپنی پلیٹیں تو پیش کیں مگر میں نے یہ مسکراتے ہوئے دل پر پتھر رکھ کے ٹال دیا کہ نہیں جناب! شکریہ آپ کھائیے، میں پرہیزی کھانا کھاتا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ خود انہوں نے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کے کھانا حاصل کیا ہے۔ میں نے لے لیا' تو اچھی بات نہ ہوگی۔ حالانکہ بھوک سے پیٹ میں آنتیں کروٹیں لے رہی تھیں۔

اسی اثنا میں ایک صاحب پر نظر پڑی جو پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک بچی کو دھتکار رہے تھے۔ غالباً وہ کوئی سوالی تھی اور بھوک کی شدت نے اسے سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے ویٹر کو آواز دی ''ویٹررر!''، اس سے پہلے کہ ویٹر آتا' ایک سفید ریش بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے' اور ایک پلیٹ میں کچھ چاول وغیرہ ڈال کے لائے اور بچی کو دے دیے۔ بچی نے سفید ریش بزرگ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ ایسی ہوگئی جیسے کسی نے گہرے زخم پر پھاہا رکھ دیا ہو۔

اس نے ایک ہاتھ میں پلیٹ پکڑی۔ دوسرے سے سر پہ دوپٹہ ٹھیک کیا اور ساتھ ہی بیٹھنے کو جگہ تلاش کرنے لگی۔ یکا یک اس کے قدم ایک طرف کو اٹھنے لگے۔ میری نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔ جلد وہ مجھے ایک کونے میں بیٹھی نظر آئی۔ وہ پرسکون و مطمئن انداز میں بغیر اِدھر اُدھر دیکھے کھانا کھا رہی تھی۔ یقیناً سخت بھوکی تھی یا پھر اسے ڈر تھا کہ مکھن میں سے بال کی طرح کوئی اس کو ہال سے نہ نکال دے۔

میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ میری نگاہ چند لڑکیوں پر پڑی جو اس بچی سے قریب والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑی تھیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چاول کی پلیٹ تھی تو دوسرے ہاتھ میں مرغے کی ران جسے وہ دانتوں سے نوچنے میں مصروف تھیں۔ بچی نے کھانا کھانے کے بعد پھٹا ہوا دوپٹہ سر پہ ٹھیک کیا جو تھوڑا سا سرک گیا تھا۔ پلیٹ صاف کی اور انگلیاں چاٹیں۔ لڑکیوں میں سے ایک نے اسے دیکھتے ہوئے ٹیڑھا سا منہ بنایا اور دوسری کو ٹہوکا۔ میں نے دوسری کے منہ سے ''بدتہذیب'' کے الفاظ کا ہیولا نکل کے اڑتے دیکھا۔

مجھ پر سوچوں کے دریچے وا ہوتے گئے۔ میں سوچ جھٹک کے حقیقت میں واپس آیا تو وہ بچی جا چکی تھی۔ اب ذہن کی تختی پر بہت سے سوال نقش تھے۔ ایک طرف بامہذب لڑکیاں مردانہ کرتے، اسکرٹ، ٹی شرٹ، ساڑھیاں اور تنگ تنگ پاجامے گھٹنوں تک چڑھائے، چڑیل جیسے ناخنوں والے ہاتھ میں پلیٹ تھامے' چہرے پہ میک اپ سجائے گلے میں پھندے لٹکائے ادھر ادھر ٹہل ٹہل کر مسکراہٹیں بکھیر رہی تھیں۔ دوسری طرف وہ معصوم سی غریب بچی پھٹا پرانا دوپٹہ سر پہ اوڑھے انتہائی معصومیت سے بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھی۔ میرے ذہن کی تختی پہ یہی الفاظ ابھر رہے تھے کہ ''مہذب کون ہے؟؟''

یہ پہلی جون کا واقعہ ہے۔ صبح سویرے ڈاؤسن کمپنی کا ٹرک تھرڈ ایونیو کی ایک عمارت کے قریب رکا۔ ڈرائیور نے ٹرک سے اُتر کر جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ عمارت کے پتے سے اُس کا موازنہ کیا اور مطمئن ہو کر عمارت میں داخل ہو گیا۔ اپارٹمنٹ نمبر ۱۳ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک مزدور کمرے میں رنگ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ڈرائیور اندر داخل ہو گیا۔

اس اپارٹمنٹ کے پرانے کرائے دار اپارٹمنٹ خالی کر گئے تھے اور نئے کرائے دار کے لیے رنگ و روغن ہو رہا تھا۔

''کیا آپ پرانا سامان لینے کے لیے آئے ہیں؟'' اُسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر مزدور نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''یہ سب سامان آپ کے لیے پڑا ہے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ سامان لے جائیں تو میں اپنا کام سہولت سے شروع کر سکوں۔'' مزدور نے کہا۔

چند ٹوٹی ہوئی کرسیاں، ایک میز، ٹین کے خالی ڈبے اور بوتلیں، کچھ پرانی کتابیں اور رسالے، چند ایک تصاویر کے علاوہ کافی مقدار میں ردی بکھری ہوئی تھی جو ڈرائیور کو لے جانی تھی۔ وہ فوراً ہی اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور چند ہی پھیروں میں سارا سامان ٹرک میں پہنچا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اسی طرح وہ اپنے معمول کے مطابق کئی جگہ اور بھی گیا اور شام تک اُس نے سارا سامان جمع کر کے گودام میں اُتار دیا۔ اپنا کام ختم کر کے اُس نے ٹرک قریبی شیڈ میں کھڑا کیا پھر گودام کا دروازہ بند کیا اور تالا لگا کر اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

☆☆

دوسرے روز ڈاؤسن کمپنی کا مالک، اسٹیو سانتیز گودام کا جائزہ لینے آیا۔ خاصی چیزیں جمع ہو گئی تھیں، جنھیں علیحدہ کرنا تھا۔ کپڑے تھے، جنھیں دھو کر اور استری کر کے دکان پر پہنچانا تھا۔

بجلی کی کچھ چیزیں تھیں، جن کی مرمت کر کے انھیں کام کا بنایا جا سکتا تھا۔ پرانی کتابیں تھیں، جنھیں فروخت کیا جا سکتا تھا۔ آخر میں اُس کی نظر ایک کنارے رکھی ہوئی تصاویر پر پڑ گئی۔ چھ تصاویر تھیں۔ اسٹیو کو آرٹ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مصور کون تھے، اُسے اس سے بھی غرض نہیں تھی۔ ہاں، تصاویر خوبصورت تھیں، اگر انھیں دکان کے شوکیس میں سجا دیا جائے تو شاید کوئی خرید لے۔ وہ اس خیال سے تصاویر اپنے ساتھ ہی دکان پر لے آیا۔

دو دن بعد آرٹ اسٹوڈیو کا مالک جان ونٹر اسٹیو کی دکان کے سامنے سے گزر رہا تھا، شوکیس میں لگی ہوئی تصاویر دیکھ کر رک گیا۔ چند منٹ انھیں دیکھتا رہا، پھر دکان میں داخل ہو گیا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اسٹیو نے شائستگی سے پوچھا۔

''اس تصویر کی کیا قیمت ہے؟'' جان ونٹر نے شوکیس میں رکھی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

اسٹیو نے ایک ہی نظر میں گاہک کو بھانپ لیا تھا۔ اُس کے عمدہ کپڑے، سوٹ کی تراش خراش اور اُس کے چلنے کے انداز ہی نے اُسے بتا دیا تھا کہ گاہک عمدہ قیمت دے سکتا ہے۔ ''آپ خوش قسمت ہیں، بس اسی ہفتے ہم نے اپنی دکان میں یہ تصاویر رکھی ہیں۔ پرانی چیزوں کی دکان میں کبھی کبھار ہی تصاویر نظر آتی ہیں۔''

''قیمت۔''

اسٹیو کی چرب زبانی نے ذرا بھی اُس کا ساتھ نہ دیا۔

''پچاس ڈالر۔'' اُس نے کہا۔

گاہک کے چہرے سے اُسے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ اُس نے قیمت کم یا زیادہ تو نہیں مانگی۔

''اور وہ دوسری تصویر؟'' جان ونٹر نے ایک پورٹریٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ذرا مہنگی ہے۔ بس سو ڈالر۔'' بغیر کچھ کہے جان ونٹر باہر جانے لگا تو اُس نے پکار کر کہا ''سنیے! میں آپ کو یہ دونوں تصاویر سو ڈالر میں فروخت کر دوں گا۔''

''میں ان دونوں تصاویر کے صرف تیس ڈالر دوں گا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' جان ونٹر نے مڑ کر کہا۔

ایک مرتبہ تو اسٹیو کے دل میں آئی کہ منع کر دے لیکن پھر سوچا کہ تصاویر کے گاہک تو بہت کم آتے ہیں اور کیا معلوم، ان تصاویر کے یہ تیس ڈالر بھی زیادہ ہوں۔

''اچھا، آپ تیس ڈالر ہی دے دیجیے۔'' اسٹیو نے کہا۔

''چیک کس کے نام بناؤں؟'' جان ونٹر نے چیک بک نکالتے ہوئے کہا۔

☆☆

ہفتے کو ڈاؤسن سٹی میوزیم کا گائیڈ، سڈنی واکر مہمانوں کے ایک گروہ کو عجائب گھر کی سیر کروانے لایا۔ وہ تیس سالہ خوش شکل نوجوان تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ اُس کے تمام مہمان جمع ہو جائیں تو انھیں میوزیم کی سیر کروائی جائے۔ جب اُس کے تمام مہمان اُس کے گرد جمع ہو گئے تو اس نے کہا ''آپ حضرات میرے ساتھ ساتھ تشریف لائیے اور دیکھیے، آپ میں سے کوئی اِدھر اُدھر ہو جائے تو میری گزارش ہے، مقررہ وقت پر بس میں پہنچ جائے۔''

وہ ان سب کو میوزیم کے پہلے کمرے میں لے گیا۔ وہ ایک ایک تصویر کے پاس رکتا۔ تصویر کی خوب صورتی بیان کرتا۔ مصور کا تعارف کرواتا اور تصویر کی تاریخی اہمیت سے آگاہ کرتا۔ مہمان اُس کی سحر انگیز تقریر پر اس طرح سر ہلاتے جیسے وہ تصویر کی خوبیوں سے بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ ایک ایک کمرے سے گزرتا ہوا آخر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اُس کمرے میں صرف ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر کمرے کی تمام بتیاں روشن کر دیں تاکہ اُس کے مہمان تصویر کا صحیح جائزہ لے سکیں۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر ایسی رونق تھی جو کسی کامیابی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

''حضرات! اب آپ کے ملاحظے کے لیے مشہور مصور ریمبراں وان رِن کی نادر و نایاب تصویر موجود ہے۔ اسے ذرا غور سے دیکھیے۔ محتاط اندازے کے مطابق اس کی قیمت ڈھائی لاکھ ڈالر سے زیادہ ہے۔''

یہ سنتے ہی مجمع میں بھنبھناہٹ سی ہوئی اور لوگ تصویر سے اور زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ ذرا سی دیر بعد سڈنی کو اپنے قریب ہی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ ہنسی کی آواز اُسے دوبارہ اپنے قریب سنائی دی۔ اِس کے قریب ہی کھڑا ہوا ایک ادھیڑ عمر آدمی ہنس رہا تھا۔

''معاف کیجیے گا، کیا ریمبراں کی تصویر میں آپ کو کوئی ایسی بات نظر آ رہی ہے جو آپ کے استہزا کا سبب ہے؟'' سڈنی نے ذرا طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ سوائے اس کے کہ یہ مجھے ریمبراں کی اصل تصویر نظر نہیں لگتی۔''

"کیا مطلب؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ تصویر اصل ریمبراں کی نہیں۔"

"جی ہاں! آپ درست سمجھے۔ میرا خیال ہے' یہ ریمبراں کی نقل ہے۔"

سڈنی کا چہرہ سرخ ہوگیا' تنک کر بولا "محترم! آپ کے شک کی وجہ جاننا چاہوں گا۔"

"میں آرٹسٹ ہوں اور اسی لیے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ تصویر نقلی ہے۔"

اس گفتگو کے دوران سارے مہمان اُن کی طرف متوجہ ہوکر شک بھری نظروں سے سڈنی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سڈنی کا غصے سے برا حال تھا۔ ایک طرف تو اس کی اپنی عزت خطرے میں پڑی ہوئی تھی کہ وہ اس فن سے آگاہ نہیں' دوسری طرف میوزیم کی شہرت بھی خطرے میں تھی۔

"براہ مہربانی آپ حضرات یہیں میرا انتظار فرمائیں۔ میں ابھی یہ مسئلہ طے کرنا چاہتا ہوں۔" سڈنی کمرے سے چلا گیا' لیکن چند ہی منٹ بعد واپس آگیا۔ اس کے ساتھ چھوٹے سے قد کا ایک بوڑھا آدمی بھی تھا۔

"حضرات! یہ میوزیم کے منتظم اعلیٰ اور مشہور محقق مسٹر ڈیل برٹ بروک ہیں اور یہ آپ کو....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اُس کی نظر ڈیل برٹ بروک پر پڑ گئی تھی جو تصویر کے سامنے کھڑا اُسے غور سے دیکھتے ہوئے دم بہ خود نظر آتا تھا۔ اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا' ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے اور چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

آخر کار ڈیل برٹ لوگوں کی طرف مڑا اور پوچھا "آپ میں سے وہ کون صاحب ہیں' جنھوں نے کہا ہے کہ یہ تصویر ریمبراں کی نہیں؟"

"میں نے۔" اسی شخص نے آگے بڑھ کر کہا جس نے تصویر پر اعتراض کیا تھا۔

"مہربانی کرکے آپ ذرا یہاں ٹھہریں۔" ڈیل برٹ نے مؤدبانہ کہا۔ پھر وہ سڈنی سے مخاطب ہوکر بولا "ان تمام صاحبان کے ٹکٹ کے پیسے واپس کرنے کا انتظام کرو اور معذرت چاہو۔ میرا خیال ہے کہ زبردست غلطی ہوگئی ہے۔"

سڈنی تمام شائقین کو لے کر کمرے سے باہر آگیا۔ سارا کمرا خالی ہوگیا تو مسٹر بروک معترض شخص سے مخاطب ہوئے "کیا میں آپ کا نام اور پتا معلوم کرسکتا ہوں؟"

"بے شک۔ میرا نام وارڈ فیلو ہے۔" اُس نے اپنا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی لکھوا دیا۔ "کوئی اور خدمت میرے لائق؟"

مسٹر بروک کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن رک گئے۔ "بہت بہت شکریہ مسٹر وارڈ! ہم..... میں آپ سے بعد میں ضرور رابطہ قائم کروں گا۔"

☆☆

تھوڑی ہی دیر بعد سی آئی ڈی کا لیفٹیننٹ، ولیم مسٹر بروک کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے پنسل اور نوٹ بک نکالی اور مسٹر بروک سے بولا "آپ کا کہنا ہے کہ اس تصویر کی مالیت ڈھائی لاکھ ڈالر سے زیادہ ہے؟"

"بے شک۔"

"تصویر کا انشورنس ضرور ہوا ہوگا۔"

"ہاں۔ تصویر کا انشورنس ہے' لیکن بات صرف رقم کی نہیں۔ مجھے اصل تصویر ہر قیمت پر واپس چاہیے۔ اس پورے عجائب خانے میں ریمبراں کی ایک ہی تصویر ہے' پوری دنیا میں چند یادگار تصاویر میں سے ایک۔ مجھے امید ہے کہ آپ تصویر واپس لانے میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔" مسٹر بروک کے لہجے میں انتہائی بے چارگی جھلک رہی تھی۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا' لیکن پہلے میرے سوالات کا جواب دیجیے۔ تصویر کب چرائی گئی؟"

"میں نہیں کہہ سکتا۔ اصل تصویر کی جگہ جو نقلی تصویر رکھی گئی ہے' وہ بہت عمدہ نقل ہے۔"

"لیکن آپ نے پھر بھی اُسے فوراً ہی پہچان لیا؟"

لیفٹیننٹ! بات یہ ہے کہ میں ہر روز پورے میوزیم کا معائنہ نہیں کرتا اور جب کرتا بھی ہوں تو سرسری نظر سے' کیوں

کہ مجھے کوئی خدشہ ہی نہیں تھا۔ آج جب میں نے تصویر غور سے دیکھی تو مجھے نقل کا احساس ہوا۔"

"لیکن محافظ تو ہر روز اُسے دیکھتے ہیں۔"

"بے شک دیکھتے ہیں' لیکن وہ تصویر کی باریکیوں سے کہاں واقف ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ تصویر کسی بھی وقت چوری ہو سکتی ہے۔ ایک ہفتے پہلے' ایک مہینے پہلے یا ایک سال پہلے۔"

"ایک سال پہلے؟ نہیں۔" یہ تو بہت طویل عرصہ ہے۔

لیفٹیننٹ نے اپنی نوٹ بک بند کی اور کہا "مسٹر بروک! میں آپ کو مایوس کرنا نہیں چاہتا' لیکن آپ کی تصویر برآمد ہونے کے آثار بہت کم ہیں۔"

"لیکن وہ اصل ریمبراں....."

"اصل ریمبراں کوئی سینٹ کی شیشی نہیں' جسے ہر جگہ فروخت کیا جاسکے۔ آپ کے کہنے کے مطابق دنیا میں ریمبراں کی چند ایک ہی تصاویر ہیں۔ جس کسی نے بھی تصویر چرائی وہ یہاں فروخت نہیں کرسکتا' اس لیے ممکنات میں سے ہے کہ تصویر ملک سے باہر روانہ کردی گئی ہو۔ بہرحال امکان اپنی جگہ موجود ہے' اگر یہاں کسی شخص نے اپنے نوادر میں اضافے کے لیے اُسے چوری کروایا ہے تو اُمید کی جاسکتی ہے کہ تصویر مل جائے۔ سب سے پہلے ہمیں اس آرٹسٹ کا پتا چلانا پڑے گا جس نے نقلی تصویر بنائی ہے تاکہ مزید کوئی سراغ مل سکے۔"

"ہمارے حفاظتی اقدامات کے ہوتے ہوئے یہ سب کچھ کیسے ہوسکتا ہے لیفٹیننٹ!" مسٹر بروک بڑبڑائے۔

"میرے اندازے کے مطابق چور دن میں عام لوگوں کے ساتھ آیا اور موقع دیکھ کر کھڑکی کھول کر چلا گیا۔ شام کو وہ کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا اور اطمینان سے اپنا کام کرکے چلتا بنا۔"

مسٹر بروک نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

☆☆

۸ جون کو پیر کی صبح میوزیم کا ایک ملازم' ٹام کروڈ' جان ونٹرز آرٹ اسٹوڈیو کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ ایک دم ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس اسٹوڈیو کے شوکیس میں میوزیم سے چرائی ہوئی ریمبراں کی اصل تصویر رکھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ اس کا بغور معائنہ کرتا رہا۔ پورا اطمینان کر لینے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ آدھ گھنٹے بعد اسٹوڈیو کے پاس ایک کار آکر رکی اور اس میں سے سادہ لباس میں لیفٹیننٹ ولیم اور ڈیل برٹ بروک اُترے۔ کار سے اترتے اترتے بروک نے تصویر پہچان لی۔ وہ لپک کر شوکیس کے پاس گیا اور لمحہ بھر دیکھ کر تیزی سے دکان میں داخل ہونے لگا۔ لیفٹیننٹ ولیم نے ہاتھ پکڑ کر اُسے روک لیا۔ "اطمینان سے۔ تمھارا کیا خیال ہے' تم کیا کرنے جارہے ہو؟"

"یہ چوری کی تصویر ہے۔ میں..... میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

"اگر آپ نے کوئی ایسا اقدام کیا تو میں آپ کی گرفتاری پر مجبور ہوجاؤں گا۔"

"لیکن یہ تم کیا کہہ رہے ہو لیفٹیننٹ۔ تمھیں معلوم ہے' وہ چوری کی....."

"مسٹر بروک! جو شخص تصویر چرائے گا' وہ اُسے اس طرح نمائش کے لیے نہیں رکھ دے گا۔ ذرا صبر سے کام لیجیے۔"

مسٹر بروک کا جوش کم ہوا تو وہ دونوں اسٹوڈیو میں داخل ہوئے۔ جان ونٹر نے نگاہ اٹھا کر انھیں دیکھا۔ مسٹر بروک کو دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرایا۔ "خوش آمدید' مسٹر بروک! میری بڑی عزت افزائی ہے۔"

"مسٹر ونٹر!" بروک غصے سے بولا۔ وہ لیفٹیننٹ سے کیا ہوا وعدہ بھلا بیٹھا تھا۔

"اصل ریمبراں تصویر میوزیم سے چُرا لی گئی ہے اور اب وہ آپ کے شوکیس میں نمایاں نظر آرہی ہے۔"

"معاف کیجیے' میں سمجھا نہیں۔" جان ونٹر نے کہا۔

"اتنے معصوم نہ بنیے۔ یہ اصل ریمبراں ہے اور میں اسے واپس لے جانا چاہتا ہوں۔" مسٹر بروک شوکیس کی طرف بڑھ

رہے تھے لیکن لیفٹیننٹ نے فوراً ہی انھیں روک دیا۔

''اَب آپ مزید کوئی بات نہ کریں اور یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' لیفٹیننٹ نے بروک سے کہا اور ونٹر کی طرف مخاطب ہو کر بولا ''آپ بتا سکتے ہیں' یہ تصویر آپ نے کس طرح حاصل کی؟''

''یہ بتانا ضروری تو نہیں تھا' لیکن اگر میوزیم سے اصل ریمبراں کھو گئی ہے اور وہ میرے شوکیس میں نظر آ رہی ہے تو میں ضرور بتاؤں گا۔''

''تمھیں خوب معلوم ہے کہ یہ اصل ریمبراں ہے اور چوں کہ تم خود بھی آرٹ ڈیلر ہو اور اس سے اچھی طرح واقف ہو اس لیے تم ہی نے اسے چُرایا ہے۔'' بروک نے مشتعل ہو کے کہا۔

''بس بس مسٹر بروک! آپ کو اب فوراً اپنی زبان بند کر لینی چاہیے۔'' لیفٹیننٹ نے سختی سے کہا' ''مسٹر ونٹر! آپ بتایئے' آپ کو تصویر کہاں سے ملی؟''

''یہ میں نے برانڈ اسٹریٹ پر پرانی چیزوں کی ایک دکان سے خریدی ہے۔''

''چوری کی چیزوں کا خریدار بھی کسی رعایت کا مستحق نہیں۔ لیفٹیننٹ میں کہتا ہوں.....''

''مسٹر بروک فوراً خاموش ہو جائیں۔'' لیفٹیننٹ دھمکی آمیز انداز میں بولا اور پھر ونٹر سے مخاطب ہوا ''ہاں تو مسٹر ونٹر! آپ کہہ رہے تھے.....''

''میں نے چوری کی کوئی چیز نہیں خریدی۔ ایک گھر سے کچھ چیزیں ایک دکان کو دی گئی تھیں اور یہ دکانیں بعض اوقات تو مسترد گھریلو سامان کی کوئی قیمت بھی ادا نہیں کرتیں۔ چوری کی چیزیں بھی اس قسم کے سامان کے ساتھ دکانوں پر آ جاتی ہیں' یا ہو سکتا ہے دکان دار ہی نے انھیں خریدا ہو لیکن عموماً اچھے دکان دار نہایت احتیاط سے پرانی چیزیں خریدتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے' چوری کی چیزیں برسوں پڑی رہ جاتی ہیں اور کبھی فوراً بک جاتی ہیں۔ یہ میری قسمت ہے کہ میں نے ایسی قیمتی چیز وہاں سے خرید لی اور یہ خرید بالکل قانونی ہے۔''

''ایسا ہرگز نہیں۔ یہ چوری کی چیز ہے اور ہرگز تمھاری ملکیت نہیں۔'' بروک نے چلا کر کہا۔

''مسٹر ونٹر! کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ آپ نے دکان سے خریدی ہے؟'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

''بے شک! آپ دکان سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے چیک سے اس کی قیمت ادا کی تھی' وہ بھی اس کا ثبوت ہے۔''

''تو پھر اُس دکان میں سے کسی نے چرائی ہو گی۔'' بروک نے پھر چلا کر کہا۔

''میرا خیال ہے' معاملہ اُلجھتا جا رہا ہے مسٹر بروک! اس سے پہلے کہ آپ ہر ایک کو مجرم ٹھہرائیں' بہتر یہی ہے کہ اس معاملے کی مزید تحقیقات کر لی جائیں۔''

☆☆

تھوڑی دیر بعد وہی کارڈاؤسن کمپنی کی دکان پر رکی ہوئی تھی۔ اسٹیو ساتیز نے پہلی ہی نظر میں لیفٹیننٹ کو پہچان لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں دکان میں داخل ہوتے' وہ ان کے استقبال کے لیے تیار تھا۔

''کیا آپ حضرات کے لیے میں کوئی خدمت انجام دے سکتا ہوں؟'' وہ ان دونوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''شاید!'' لیفٹیننٹ ولیم نے کہا اور اپنا پولیس بیج دکھایا۔

''کیا چند روز پہلے آپ نے ایک تصویر جان ونٹر نامی آرٹ ڈیلر کو فروخت کی تھی؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''اصل ریمبراں.....'' مسٹر بروک نے پیچھے سے کہا۔

''بیچی تھی؟''

''مجھے تصاویر کا فرق ذرا نہیں معلوم۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں نے پچھلے دنوں دو تصاویر ایک صاحب کو فروخت کی تھیں اور میرا خیال ہے کہ اُن کا نام بھی یہی تھا جو آپ نے بتایا۔ ان کا نام ان کے چیک پر چھپا ہوا تھا اور یہ بھی مجھے صرف اس لیے یاد ہے کہ تصاویر بیچنے کا ہمارا کبھی کبھار اتفاق

ہوتا ہے۔''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ تصاویر آپ کو کس طرح حاصل ہوئیں؟''

''نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ جب مکان خالی کرتے ہیں تو ہم سے کہہ دیتے ہیں کہ فالتو اشیاء وہاں سے اٹھا لیں۔ ہم اُن کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھتے۔''

''لیکن ان کا پتا تو آپ ضرور لکھتے ہوں گے ورنہ ڈرائیور چیزیں کس طرح لائے گا؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''ہاں ہم پرچے پر اس کا پتا نوٹ کر لیتے ہیں اور وہی پرچا ڈرائیور کو دے دیتے ہیں۔''

''آپ کا ڈرائیور ایک ہی ہے؟''

''جی ہاں۔''

''اس کا نام اور پتا؟''

''اس کا نام مائک وارک ہے اور اس وقت وہ اپنی ڈیوٹی پر نہ معلوم کہاں ہو گا۔ شام سے پہلے اس سے ملاقات مشکل ہے۔''

''بہرحال مسٹر بروک! ہم اس معاملے میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس دوران ہم یہ کر سکتے ہیں کہ وارڈ فیلو سے ملاقات کر لیں۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

''وارڈ فیلو؟''

''وہ آرٹسٹ جس نے نقلی تصویر پہچانی تھی۔''

''اوہ لیفٹیننٹ! میں تو بالکل بھول گیا تھا۔ کیا تمھارے خیال میں اُسی نے.....''

''ضروری نہیں لیکن ہو سکتا ہے وہ کچھ مفید باتیں بتا سکے۔''

☆☆

وارڈ فیلو اسٹوڈیو میں اپنے کام میں مشغول تھا۔ اُن دونوں کو آتا دیکھا تو کھڑا ہو گیا۔

''تشریف لایئے مسٹر بروک! کیا ہوا تصویر کا۔ نقلی ہی نکلی نا؟'' اس نے مسکرا کر مسٹر بروک سے پوچھا۔

''جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا تھا۔'' مسٹر بروک نے جواب دیا۔

''مجھے پہلی نظر ہی میں پتا چل گیا تھا کہ تصویر نقلی ہے۔'' اُس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''مسٹر فیلو!'' لیفٹیننٹ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کون کون سے آرٹسٹ نقلی تصویر مہارت سے بنا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔ میں آپ کو کم از کم پچاس نام گنوا سکتا ہوں۔ اُن میں میرا نام بھی شامل ہے۔''

''پھر تو بڑا مشکل مسئلہ ہے۔'' مسٹر بروک نے فکر انگیز لہجے میں کہا۔

''جی ہاں! اوّل تو اُن سب سے ملاقات کرنا اور پھر آپ کے خیال میں اُن میں سے کوئی شخص کیوں تسلیم کرے گا کہ اُس نے نقلی پینٹنگ بنائی تھی؟'' فیلو نے کہا۔

''مسٹر فیلو صحیح کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں واپس چل کر ٹرک ڈرائیور ہی سے کچھ پوچھنا چاہیے۔ مصور کو تلاش کرنا آسان کام نہیں۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

ٹرک ڈرائیور شام ۵ بجے تک گودام میں واپس آ گیا تھا۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ جیسے ہی اُس نے لیفٹیننٹ کو دیکھا وہ رک گیا۔

''ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پچھلے پیر کو تم کسی جگہ سے چند تصاویر لائے تھے؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''تصویریں۔ ہاں ہاں۔ پچھلے پیر کو تصاویر لایا تھا۔'' ٹرک ڈرائیور نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیا تمھیں اُس جگہ کا پتا یاد ہے۔'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''اُس جگہ کا پتا۔'' ڈرائیور نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا ''ذرا ایک منٹ ٹھہریں۔'' اُس نے آگے بڑھ کر میز کی دراز کھول لی۔ کافی کاغذات اُس میں بھرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ پرچیاں دیکھتا رہا پھر ایک پرچی ان میں سے نکال

لی۔ ''پتا یہ رہا۔'' اُس نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد پولیس کار تھرڈ ایونیو کی عمارت کے سامنے رکی۔ لیفٹیننٹ اور مسٹر بروک کار سے اتر کر اپارٹمنٹ نمبر ۱۳ میں چلے گئے۔ ایک مرد اور ایک عورت فرنیچر ترتیب سے لگا رہے تھے۔ ان دونوں کو قریب آتے دیکھ کر دونوں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ سے پہلے جو صاحب یہاں مقیم تھے کیا آپ ہمیں ان کا موجودہ پتا بتا سکتے ہیں؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ وہ ہمارے یہاں آنے سے پہلے جا چکے تھے۔ اگر آپ کو اُن کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں تو منیجر سے شاید معلوم ہو جائے۔'' مرد نے جواب دیا۔

وہ دونوں ان کا شکریہ ادا کر کے منیجر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جیسے ہی لیفٹیننٹ نے منیجر کو اپنا بیج دکھایا، اُس نے فوراً اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دے دی۔

''ہم اپارٹمنٹ نمبر ۱۳ کے پچھلے کرائے دار کو تلاش کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہمیں اُن کا پتا بتا سکتے ہیں؟''

''جی نہیں۔ مسٹر اینڈریو ایک ماہ قبل یہاں سے گئے ہیں اور جاتے وقت انھوں نے اپنا پتا نہیں بتایا۔''

''وہ یہاں کتنے عرصے سے مقیم تھے؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''تقریباً چھ ماہ سے۔''

''کیا وہ اکیلے رہتے تھے؟''

''جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔''

''کیا آپ اُن کا حلیہ بتا سکتے ہیں؟''

''ادھیڑ عمر، لمبی لمبی مونچھیں، کافی گھنی بھنویں اور لمبے لمبے بال، آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔''

لیفٹیننٹ نے نوٹ بک میں حلیہ درج کر لیا لیکن وہ مایوسی سے سر ہلا رہا تھا۔

''کیوں؟ کیا آپ اس حلیے سے مطمئن نہیں؟'' مسٹر بروک نے دریافت کیا۔

''ہرگز نہیں۔ جب کوئی شخص اپنا حلیہ تبدیل کرتا ہے تو کچھ ایسا ہی روپ دھارتا ہے جس کی نمایاں چیزیں ہر شخص کو یاد ہو جائیں۔ بعد میں جب وہ اُن سے نجات حاصل کر لیتا ہے تو کوئی بھی اُسے پہچان نہیں سکتا۔ ڈاڑھی اور مونچھیں صاف کی جا سکتی ہیں، بال تراشے جا سکتے ہیں اور اس سے شکل میں اتنی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ عام آدمی تو ایک طرف، خاص لوگ بھی آسانی سے نہیں پہچان سکتے۔''

''اُس کی آواز کافی بھاری تھی۔'' منیجر نے تبصرہ کیا۔

''اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکے گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

پولیس کار میں واپس آ کر لیفٹیننٹ نے بڑی مایوسی سے کہا ''مسٹر بروک! مجھے افسوس ہے لیکن نتائج ابھی تک ہمارے خلاف جا رہے ہیں۔''

''لیکن اس طرح آپ اپنی تفتیش بند تو نہیں کر دیں گے؟'' مسٹر بروک نے پوچھا۔

''نہیں ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ کل صبح تک ہم میوزیم کے ملازمین سے پوچھ گچھ کریں گے۔ شاید چوری کے وقت کا صحیح تعین ہو سکے۔ اس کے علاوہ شہر کے تمام آرٹسٹوں کے بارے میں جو ریمبراں کی تصویر کی نقل بنا سکتے ہوں، معلومات حاصل کریں گے۔ شاید کہیں کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے لیکن اس میں بڑا وقت لگے گا۔''

مسٹر بروک لیفٹیننٹ کی بات سے مطمئن نہیں تھے۔ انھیں تو اصل تصویر شوکیس میں سجی ہوئی نظر آ رہی تھی جسے حاصل کرنا اُن کا حق تھا۔

دوسرے دن وہ ایک وکیل ایڈورڈ تھامسن اور انشورنس کمپنی کے ایک نمائندے کے ساتھ جان ونٹر کے اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ کار سے اترتے ہی مسٹر بروک کو ایک دھچکا لگا۔ تصویر شوکیس سے غائب تھی۔ وہ تیزی سے دکان میں گھستے چلے گئے۔ جان ونٹر سامنے ہی کھڑا ہوا تھا۔

''کیا کیا تم نے میری تصویر کا؟'' انھوں نے غصے سے

پوچھا۔

''کون سی تصویر؟''

''وہی میری ریمبراں جو شوکیس میں رکھی ہوئی تھی اور جسے تم نے چرا لیا ہے۔''

''مسٹر بروک! کیا ہم دوبارہ اُسی طرح جھگڑیں گے؟'' جان ونٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے تصویر محفوظ جگہ پہنچا دی ہے اور ضروری نہیں میں کسی کو بتاؤں کہ وہ کہاں ہے۔''

''میں ڈھونڈ لوں گا۔ میں تمھاری دکان کی تلاشی لوں گا۔'' بروک نے دھاڑ کر کہا۔

''ہرگز نہیں۔ عدالت سے تلاشی نامہ لائے بغیر آپ ہرگز کچھ نہیں کر سکتے۔'' جان ونٹر نے تلخی سے کہا۔

ایڈورڈ تھامسن نے آگے بڑھ کر بروک کو ہاتھ سے پکڑ لیا ''ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔'' اس نے مسٹر بروک سے کہا اور مڑ کر انشورنس کمپنی کے نمائندے سے پوچھا ''تصویر کا انشورنس کتنی رقم کے لیے ہے؟''

''دو لاکھ ڈالر لیکن اگر تصویر مل گئی ہے تو ہم یہ رقم کبھی ادا نہیں کریں گے۔''

''ملی کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے، مل گئی تھی لیکن وہ پھر غائب ہے۔'' مسٹر بروک نے چلا کر کہا۔ پھر غصے سے لرزتی اُنگلی جان ونٹر کی طرف کر کے کہا ''اس نے چرائی ہے۔''

''اپنی تصویر میں نے چرائی ہے۔ بہت خوب۔'' جان ونٹر کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''کوئی اپنی تصویر بھی چراتا ہے۔''

ایڈورڈ تھامسن نے جان ونٹر سے مخاطب ہو کر کہا ''مسٹر ونٹر تصویر کے بارے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

''سب سے پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آیا واقعی میرے پاس اصل ریمبراں ہے۔ اس سلسلہ میں کم از کم دو تین ماہروں کی رائے جاننا چاہوں گا۔''

''اگر آپ کو یقین ہو گیا کہ آپ کے پاس واقعی اصل ریمبراں ہے پھر آپ کیا کریں گے؟''

''اس صورت میں، میں فروخت کے لیے اخبار میں اشتہار دے دوں گا۔''

''تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ تم نے تصویر چرائی ہے۔'' مسٹر بروک چیخ کر بولے۔

''اگر اب آپ نے مجھ پر چوری کا الزام لگایا تو میں آپ کے خلاف پولیس میں شکایت درج کروا دوں گا۔'' جان ونٹر نے بردباری سے کہا۔

بڑی مشکل سے وہ دونوں مسٹر بروک کو کار تک لانے میں کامیاب ہو سکے۔ مسٹر بروک غصے سے لرزتے نہ جانے کیا کیا اول فول بک رہے تھے۔ کار میں بیٹھنے کے بعد ایڈورڈ تھامسن نے بروک سے کہا۔ ''مسٹر بروک! سرِ دست میں آپ کو کوئی قانونی مشورہ نہیں دے سکتا۔ معاملہ بہت پیچیدہ ہے، مجھے ہر پہلو پر غور کرنا پڑے گا۔ بظاہر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ عدالت سے احکام جاری کروا کے اُس کی فروخت روک سکتے ہیں۔ وہ بھی مشکل مسئلہ ہے کیونکہ جب تک ہم یہ ثابت نہ کر دیں کہ تصویر چرائی گئی ہے اور چور کی نشان دہی نہ کر دیں، جان ونٹر قانونی طور پر تصویر کا مالک ہے۔''

مسٹر بروک میوزیم واپس آ گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ پریشان تھے۔ اُن کی دماغی حالت اور بے چینی کے اثرات چہرے پر نمایاں تھے۔ میوزیم سے واپس آتے ہی انھوں نے ٹیلی فون پر لیفٹیننٹ سے رابطہ قائم کیا۔

''نہیں ابھی کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ کوششیں جاری ہیں۔ ہم عمارت کے دوسرے لوگوں سے رابطہ قائم کر کے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آرٹسٹوں سے بھی پوچھ گچھ جاری ہے۔''

''لیکن یہ سلسلہ تو نہ معلوم کب تک جاری ہے گا۔ ہو سکتا ہے مہینوں لگ جائیں۔''

''زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں لیکن آپ پریشان نہ ہوں، ہم آخر کار آپ کی تصویر واپس لانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ اس دوران اپنے وکیل کے ذریعے تصویر کی

فروخت ضرور رکوادیں۔"

"وہ پہلے ہی اپنا کام دکھا چکا۔" مسٹر بروک نے کہا اور ٹیلی فون رکھ دیا۔

مسٹر بروک شش و پنج میں تھے۔ زندگی بھر کا حاصل' اُن کی شہرت' عزت' سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ اُن کی ساری زندگی کا سرمایہ یہی تصاویر تھیں۔ تصویر کی واپسی کی بہت ہی کم امید تھی اور اگر یہ معاملہ طول پکڑ گیا تو اخبارات یہ داستان شائع کر دیں گے اور میوزیم کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ مسٹر بروک کو کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑی لیکن آخر کار انھوں نے فیصلہ کرلیا۔ وہ میوزیم سے اُٹھ کر اپنے بینک گئے۔ وہاں سے جان ونٹر کے اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ اُن کا رویہ بہت بدلا ہوا تھا۔

"مسٹر ونٹر میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں نے آپ پر چوری کا الزام لگا دیا تھا۔" انھوں نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

ونٹر نے کچھ جواب نہ دیا۔

"کیا میں آپ سے اکیلے میں بات کر سکتا ہوں؟" مسٹر بروک نے دوبارہ کہا۔

"تشریف لائیے۔" جان ونٹر نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے مہمان ہیں۔"

"مسٹر ونٹر! آپ کو معلوم ہے کہ آرٹ میری زندگی ہے۔ ساری عمر میں نے اسی کام میں گزاری ہے۔ مجھے میوزیم کے منتظم اعلیٰ کے عہدے کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں سے برائے نام تنخواہ لیتا ہوں۔ میرے پاس اپنی دولت کافی ہے لیکن میں نے یہ عہدہ صرف اس لیے قبول کیا کہ زیادہ سے زیادہ اُن چیزوں کے قریب رہ سکوں جن کے لیے میں نے اپنی زندگی تج دی ہے۔"

ونٹر نے سر کی جنبش سے اثبات کا اظہار کیا۔

"مسٹر ونٹر! اگر یہ بات اخبارات میں چھپ گئی کہ ریمبراں کی اصل تصویر جو میوزیم کی جان ہے' چرالی گئی اور اس کی جگہ نمائش کے لیے نقلی تصویر رکھ دی گئی ہے تو میوزیم کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مجھے بھی ریٹائر کر دیا جائے گا اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے رک گئے۔ اُن کا گلا اس لمبی بات سے بالکل خشک ہو گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑی جمنے لگی تھی۔

"مسٹر ونٹر! میں آپ سے تصویر خریدنا چاہتا ہوں۔"

"آپ تصویر خریدنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں! میری کافی رقم خرچ ہو جائے گی لیکن وہ تصویر میں واپس اُس کی جگہ رکھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میں آپ کو ایک لاکھ ڈالر دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"لیکن میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اس تصویر کا انشورنس دو لاکھ ڈالر کا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن وہ صرف اسی صورت میں رقم ادا کریں گے جب یہ ثابت ہو جائے کہ تصویر چوری ہو گئی ہے اور وہ اب مل نہ سکے گی لیکن اس میں نہ معلوم کتنا وقت لگے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ بات اخبارات تک پہنچے۔ اچھا میں..... میں آپ کو دو لاکھ ڈالر دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"اور آپ پولیس سے بھی اپنا کیس واپس لے لیں گے۔"

"بے شک! میں اس معاملے کی تشہیر نہیں چاہتا۔ ہم کیس بھی فوری طور پر واپس لے لیں گے۔"

"لیکن یہ معاملہ آپ کو مجھے تحریر میں دینا پڑے گا۔"

"بہتر ہے۔"

☆☆

تین دن بعد مسٹر ونٹر تفریح کے لیے سوئٹزرلینڈ روانہ ہو گئے۔ دو لاکھ ڈالر وہ پہلے ہی سوئٹزرلینڈ میں اپنے بینک کو روانہ کر چکے تھے۔ اعلیٰ درجے کے شان دار ہوٹل میں اُن کا قیام تھا۔ رات کو ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں انھوں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُن کی میز پر ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے' مسٹر وارڈ فیلو!

●●●

اُڑتی سی اِک خبر ہے

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

اخبار کی اَن گنت خوبیاں عیاں کرتا شوخ و شنگ قلم پارہ

اخبار بڑے کام کی چیز ہے۔ اس سے آپ مکھی مچھر اڑا اور مار سکتے ہیں' ٹکی بنا کر لاؤڈ اسپیکر کا کام لے سکتے ہیں۔ اسی ٹکی سے بچوں کی تہذیب اور تادیب میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اخبار کو آپ بارش اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے چھاتے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اشیائے خوردنی پر ڈھک سکتے ہیں۔ بچھا کر حسبِ موقع بیٹھ یا لیٹ سکتے ہیں۔ اخبار سے دسترخوان کا کام لے سکتے ہیں' ہاتھ منہ پونچھ سکتے ہیں۔ سردیوں میں اس سے آگ تاپی جاسکتی ہے۔ گرمیوں میں پنکھا جھل سکتے ہیں۔ ردّی میں بیچ کر رقم بھی کھری کی جاسکتی ہے' حتیٰ کہ اسے اخبار کی پالیسیوں کے خلاف بطور احتجاج نذرِ آتش بھی کیا جاسکتا ہے۔ غرض اخبار سے کئی مفید کام لیے جاسکتے ہیں۔ ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ ہم اخبار خریدتے ہی اس لیے ہیں کہ اتنے سارے کام لیے جاسکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کثیر المقاصد شے ہم نے کوئی اور نہیں دیکھی۔

البتہ بعض حضرات کو کہتے سنا گیا ہے کہ اخبار کا ایک اور استعمال بھی ہے اور وہ ہے مطالعہ جس پر ہمیں از حد حیرت ہوتی ہے۔ اگر اخبار صرف پڑھنا ہی ہے تو خریدنے کی کیا ضرورت ہے' یہ کام تو پڑوس کے اخبار سے بھی لیا جاسکتا ہے۔ اخبار چھاپنے کا اصل مقصد اگر پڑھنا ہے تو یہ مقصد صرف انگلستان تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انگریز کو اخبار خرید کر پڑھنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا ملک بڑی حد تک اس لعنت سے محفوظ ہے۔ اول تو بہت کم لوگ اخبار پڑھتے ہیں اور جو پڑھتے ہیں وہ بھی اڑوس پڑوس سے مانگ تانگ کر' نائی کی دکان پر' کتب خانوں میں اور بسوں ریل گاڑیوں میں ایک دوسرے کے کندھوں سے جھانک کر اخبار پڑھ لیتے ہیں۔ البتہ جو معدودے چند لوگ اخبار خرید کر پڑھنے کی علت میں مبتلا ہیں' وہ جب تک صبح سویرے تازہ اخبار کے درشن نہ کرلیں ان کے حلق سے ناشتا نہیں اترتا۔ اخبار کے ناغے والے دن انہیں زندگی میں ایک طرح کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ سارا دن پژمردہ اور ملول سے رہتے ہیں۔ ان حضرات کو اخبار کی چھٹی والے دن باسی اخبار بھی پڑھتے دیکھا گیا ہے لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ یہ اخبار میں پڑھتے کیا ہیں؟ آخر اخبار میں ہوتا ہی کیا ہے؟

مثال کے طور پر صفحۂ اول کو لیجیے۔ اس صفحہ پر چند تصاویر اور کئی سرخیاں ہوتی ہیں۔ یہ تصاویر یا تو کسی خوبصورت کھلاڑی کی ہوں گی یا کسی بدصورت سیاست دان کی جنھیں دیکھ کر صرف وہ خود ہی خوش ہو سکتے ہیں۔ باقی رہی سرخیاں! سو وہ ان بیانات پر مشتمل ہوتی ہیں جو سیاست دان' سرکاری افسران اور وزرا عوام کی تفریحِ طبع کے لیے دیتے ہیں لیکن ان بیانات سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے کیونکہ اخبار میں مزاحیہ کالم بھی ہوتا ہے اور قارئین ہنسنے ہنسانے کے لیے اس

کالم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان خبروں کو صرف محکمۂ اطلاعات کا عملہ ہی توجہ سے پڑھتا ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ انھیں اس کام کے پیسے ملتے ہیں۔

اکثر کسی اداکارہ کی ساتویں طلاق اور آٹھویں شادی کی بھی خبر ہوتی ہے جس میں اس کے سابقہ شوہر اور جملہ امیدوار ہی دلچسپی لے سکتے ہیں۔ باقی رہ گئیں قدرتی آفات و حادثات مثلاً سیلاب، زلزلہ، بجٹ، الیکشن وغیرہ کی خبریں تو جناب! بہت سے ہوشیار مدیر ایک ہی حادثے یا واقعے کی خبریں ادل بدل کر سارا سال بلکہ سالہا سال آفات وحادثات کی خبریں چھاپتے رہتے ہیں۔ مثلاً پچھلے سال اگر موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے ٹھنڈی سڑک پر پانی جمع ہو گیا تھا اور اس کی تصویر فائل میں موجود ہے تو اس سال بوندا باندی شروع ہوتے ہی ایڈیٹر صاحب اسے صفحۂ اول پر چھاپ دیں گے۔ انھیں یقین کامل ہے کہ ٹھنڈی سڑک پر نکاسی آب کا نظام ہنوز توجہ طلب ہے اور اس موسم برسات میں بھی وہاں پانی ضرور جمع ہوگا۔ یہی تصویر اگلے سال سیلاب کے موقع پر بھی کام آئے گی اور اسے پانی کی پائپ لائن پھٹنے اور گٹر ابلنے کی خبروں کے ساتھ بھی وقتاً فوقتاً چھاپا جائے گا۔

ان خبروں کے علاوہ اخبارات کی محبوب خبر برطانیہ کے شاہی خاندان کے متعلق ہوتی ہے۔ اگر کسی شاہی شخصیت کو چھینک بھی آجائے تو یہ خبر چار کالمی سرخی میں چھپتی ہے جس کے گرد سیاہ ماتمی حاشیہ ہوتا ہے، ساتھ ہی ایک تصویر ہوتی ہے ''شہزادی فلاں چھینک مارتے ہوئے''۔

دنیا کے کبھی شاہی خاندانوں کے افراد کی ذاتی زندگی کی تمام تفصیلات آپ تک نہایت تسلی بخش طریقے سے پہنچائی جاتی ہیں مثلاً کس شہزادے کا معاشقہ کس اداکارہ کے ساتھ چل رہا ہے یا ہجر و وصال کے کن مراحل سے گزر رہا ہے، کون سی شہزادی طلاق لینے یا شاہی تخت کے وارثوں میں ایک آدھ کا مزید اضافہ فرمانے والی ہیں۔ اس طرح آپ کی معلومات میں ہر روز بیش بہا اضافہ کیا جاتا ہے۔ ان خبروں کے بغیر آپ حالاتِ حاضرہ سے افسوس ناک حد تک ناواقف رہیں گے۔ شاہی خاندان کی مایوسی اور دل گرفتگی اس پر مستزاد ہے۔

اب وہ صفحہ کھولیے جس پر اداریہ شائع ہوتا ہے۔ یہ بات تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ اخبار کا اداریہ پڑھنے کی چیز نہیں۔ اسے اخبار کا کوئی قاری نہیں پڑھتا یہاں تک کہ کاتب بھی اسے بغیر پڑھے کتابت کر لیتا ہے کیوں کہ اسے علم ہے، ہر اداریے کا موضوع، لہجہ، متن اور الفاظ تک بعینہٖ وہی ہوں گے جو روز اوّل سے چلے آرہے ہیں۔ بعض ماہر اداریہ نویس تو مہینے بھر کے اداریے ایک ساتھ لکھ ڈالتے ہیں۔ روز روز کون بور ہونا پسند کرتا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ اداریہ چھاپنے کا مقصد آخر کیا؟ اس کا جواب بہت سیدھا سادہ ہے: اگر اداریہ نہ چھاپا جائے تو خالی جگہ بہت بری معلوم ہوگی۔

خواتین کا صفحہ بھی اخبار میں ہوتا ہے۔ اس صفحے پر ایک بڑی سی رنگین تصویر ہوگی جس میں میک اپ میں لتھڑی ہوئی ایک بی بی دانت نکالے بیٹھی ہیں۔ ان محترمہ کے انٹرویو میں لکھا ہوگا کہ انھیں گاہے گاہے خدمتِ خلق کا شدید دورہ پڑتا ہے اور علاج کے لیے مجبوراً اخبارات میں تصویر اور خبر دینا پڑتی ہے کہ محترمہ فلاں سماجی خدمت کے کئی اداروں کی سربراہ اور سرپرست ہیں۔ قصابوں کی عالمی کانفرنس ہو یا شوقیہ حلق پھاڑنے والوں کا مقابلۂ موسیقی، فیتہ کاٹنے کے لیے انہی کو بلایا جاتا ہے۔

انھیں بالعموم کھانا پکانے کا شوق ہوتا ہے، جس کا خمیازہ ان کے اہلِ خانہ کو اکثر بدہضمی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ کھانے میں تھالی کا بینگن، کپڑوں میں بے تکا پاجامہ اور رسی نما دوپٹہ اچھا لگتا ہے، پھولوں میں گوبھی کا پھول اور رنگوں میں چیک بک کا رنگ بہت پسند ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ سماجی خدمت کے بعد بقیہ زندگی سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں پر یادِ الٰہی میں گزار دیں۔ اب اگر آپ اس بصیرت افروز انٹرویو سے

محروم رہے تو واللہ کتنی بڑی نعمت سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ انٹرویو آپ کی فہم و دانش کو دو چند کرتا ہے۔ اسی لیے اسے ہر ہفتے شائع کیا جاتا ہے۔ بس تصویر اور خاتون کا نام تبدیل کر دیا جاتا ہے تاکہ آپ یکسانیت کی وجہ سے بیزار نہ ہو جائیں۔

اخبار میں ہر ہفتے ایک کالم ''یہ ہفتہ آپ کے لیے منحوس رہے گا'' کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے چار سالہ ''ولی عہد'' کی قسمت کا حال جاننا چاہا۔ ہمیں مندرجہ ذیل تحریر نظر آئی ''آپ کا ستارہ مریخ اس وقت زہرہ سے عشق کی پینگیں بڑھا رہا ہے، یہ بات زحل کو بہت ناگوار گزرے گی اور وہ مریخ پر دھاوا بول دے گا۔ نتیجے میں آپ کے حالات دگرگوں ہو جائیں گے، کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ بچوں کی صحت خراب رہے گی، ملازمین غبن کریں گے۔ بیوی سے ناچاقی کا امکان ہے، والدین سے اختلافات کا اندیشہ ہے، حادثے کا خطرہ ہے لیکن اگر مشتری مریخ کی مدد کو آگیا تو پھر وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ہن برسنے لگے گا۔ علم وادب کی طرف رجحان رہے گا۔ بیرونِ ملک سفر کریں گے۔ کنوارے ہیں تو شادی ہو جائے گی اور شادی شدہ ہیں تو دوسری شادی ہوگی، بلکہ تیسری کے بھی امکانات ہیں۔ البتہ قمر کا زوال آپ پر زوال لا سکتا ہے۔ ادھر پلوٹو کی سٹس سے ناچاقی ہوگئی ہے۔ ادھر عطارد، مریخ کے گھر میں ہے اور مریخ زہرہ کے گھر میں۔ خود زہرہ خدا جانے کہاں ہے؟ اگر یہ وضع فلکی یوں ہی برقرار رہی تو آپ کا اللہ ہی حافظ ہے کیونکہ زہرہ کے گھر میں مریخ کو ہبوط ہوتا ہے۔ اتوار پیر نحس ہیں۔ منگل بدھ سعد ہیں۔ جمعرات یونہی سا ہے۔ جمعہ ٹھیک ٹھاک ہے اور ہفتہ کوئی خاص نہیں''۔

وہ تو خیریت گزری کہ ہمارے چار سالہ بچے کو اس درہم برہم قسم کے نظامِ شمسی کی اطلاع نہ مل سکی اور وہ ستاروں کے اشاروں پر نہ چل سکا ورنہ بڑی تباہی پھیلتی اور وہ ہفتہ صاحب زادے کی سوانح عمری کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہوتا۔ اب اگر اخبار میں یہی کچھ ہوتا ہے تو لوگ اخبار کیوں پڑھتے ہیں؟ ہر شخص اخبار بینی کے لیے مختلف وجوہ رکھتا ہے، مثلاً کچھ لوگ محض اس لیے اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں کہ بین الاقوامی سیاسیات اور اقتصادیات کے ان مسائل پر خون کھولا سکیں جن کے بارے میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بحث کرنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکتے۔

کچھ حضرات کی اخبار بینی محض فلموں کے اشتہارات تک محدود ہوتی ہے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ فلم ''جٹ دا پتر'' کون سے سینما میں چل رہی ہے، اخبار ان کے لیے کاغذ کا ایک لمبا چوڑا ٹکڑا رہ جاتا ہے جس پر وہ فلم دیکھنے کے دوران پکوڑے اور گنڈیریاں رکھ کر کھا سکتے ہیں۔ بعض باذوق حضرات فلمی صفحے پر بھی نظر کرم ڈالتے اور عمر رسیدہ ہیروئن کو تو ندیل ہیرو کے پہلو میں دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔ ایک صاحبِ دل صرف یہ جاننے کے لیے اخبار پڑھتے ہیں کہ کہیں فلم اسٹار مس دلِ آرام کی شادی تو نہیں ہوگئی اور یہ معلوم کر کے ان کے دل کو آرام آجاتا ہے کہ موصوفہ ہنوز کنواری ہیں۔

سماج سدھار تحریک سے وابستہ ایک بزرگ یہ دیکھنے کے لیے اخبار پڑھتے ہیں کہ کہیں اس میں کوئی ایسی خبر یا تصویر تو شائع نہیں ہوگئی جس سے بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق کو ناقابلِ تلافی ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہو چنانچہ کن انکھیوں سے تصویر دیکھتے اور لاحول پڑھتے جاتے ہیں چونکہ انھیں نئی نسل کے اخلاق کی بے حد فکر ہے لہٰذا ان کو دن میں کئی بار لاحول پڑھنا پڑتا ہے۔

لاحول تو خیر ہم نہیں پڑھتے لیکن ان لوگوں پر ملال ضرور ہوتا ہے جو اخبار پڑھ کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں اور نہ صرف قیمتی وقت، بلکہ اخبار بھی ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ اخبار کے جو مفید استعمال ہم نے شروع میں بتائے ہیں، ان سے وہ ناواقف ہیں۔ شکر ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو اخبار بینی جیسی بری عادت میں مبتلا ہیں۔ اللہ آپ کو بھی امان میں رکھے۔

"میرا نصب العین...... مسلمان حکومت کے پیچھے جمعہ ادا کرنا......"

وہ بہت چکرایا۔ یہ کیسا نعرہ ہے؟ مگر کتبے پر تو یہی کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ پڑھ کر اس وقت وہ ڈبل ڈیکر بس کی بالائی منزل میں بیٹھا تھا۔ سفر میں، خواہ وہ بس کا سفر ہو یا لاری کا یا ریل گاڑی کا، اس نے ہمیشہ کھڑکی کے برابر بیٹھنا پسند کیا کہ یوں آدمی اندر کے اچھے بُرے لوگوں کے ہجوم کا حصہ بننے سے بچتا اور باہر کے تیزی سے بدلتے منظر سے رشتہ استوار کر لیتا ہے۔ اگر ظفر اس کے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا تو وہ شاید اندر کے منظر سے مکمل لاتعلقی پیدا کر لیتا مگر ظفر نے بیٹھے بیٹھے اسے پھر ٹہوکا۔ "اشتہار دیکھ رہے ہو؟"

اس نے اگلی نشست پر نظر ڈالی جس کی طرف ظفر نے اشارہ کیا تھا۔ جانے وہ آدمی کس وقت آ بیٹھا تھا، ہاتھ میں لمبی سی چھڑی، چھڑی سے ٹنگی ہوئی گتّے کی تختی، تختی پر لکھا ہوا "میرا نصب العین...... مسلمان حکومت کے پیچھے جمعہ ادا کرنا۔"

دونوں نے کتبہ پڑھا، پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے۔

اب بس کی سب نشستیں پر ہو چکی تھیں، بلکہ کچھ لوگ تو زینے کے قریب ڈنڈا پکڑے کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ ان سے لاتعلق ہو کر وہ پھر باہر دیکھنے لگا تھا کہ اچانک کتبے والے آدمی نے جھرجھری لی اور کھڑا ہو گیا۔ اِس طرف سے اُس طرف تک، اِس کونے سے آخری نشست تک بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا، کھنکھارا، اور شروع ہو گیا:

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں ناؤ کاغذ کی کبھی چلتی نہیں

اے میرے مسلمان بھائیو! عرصہ گزر گیا ہے انصاف مانگتے...... انصاف، احتساب۔ یاد کرو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کُرتے پر اعتراض ہوا تھا مگر یہ جہاں مسلمان آزاد ہوں وہاں شہ زور بھی کمزور ہے۔ میں یہ کچھ نہیں کر سکتا تو سوا کے سوا جیسے محمد علی کلے......"

برابر کی نشست پر بیٹھا ہوا شخص جس نے قدرے قدرے میلا سوٹ پہن رکھا تھا اور زانو پہ ایک کالا چرمی بیگ رکھا ہوا تھا' کچھ کسمسایا، کچھ سٹپٹایا اور بولا' 'محمد علی کلے؟"

کتبے والا آدمی اس کا سٹپٹانا دیکھ کر طنزیہ ہنسی ہنسا اور کہا

دوسرا راستہ

انتظار حسین

"میرے عزیز نے محمد علی کلے کا نام سُن کر تعجب کیا مگر کیوں کیا۔ ذات باری کی قسم، محمد علی کلے کمزور آدمی ہے۔ کس لیے؟ اس لیے کہ وہ محکوم ہے اور اب تم پوچھو گے کہ پھر چینی کیوں نایاب ہوئی اور آٹا کیوں مہنگا ہوا۔ تو یاد کرو حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا چھنے ہوئے آٹے کی روٹی دیکھ کر گریہ کرنا۔ مسلمانو! عرصہ گزر گیا انصاف مانگتے۔ انصاف کہیں ملا مجھے مگر حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز۔ کیوں؟ مجھے اس کا علم چاہیے۔ میرا سوال پاکستان کے چھ اخباروں میں شائع ہو چکا ہے۔ ایمان والو! مجھے جواب دو سات پیسے کا کارڈ لکھ کر۔ والد زبانی بحث میں جھگڑے کا ڈر ہے اور فساد منع ہے اور یہ اسلام۔ جہالت کا عمل اور علم کا عمل...... عمل کا علم اور عمل کی جہالت۔ جہالت کے عمل سے کیسے بچا جائے، مجھے اس کا علم چاہیے"......"

ظفر نے مسکراتے ہوئے اسے پھر ٹہوکا "امتیاز سُن رہے ہو؟"

"سن رہا ہوں۔" وہ بیزار ہو کر بولا۔ پھر باہر دیکھنے لگا۔ اور دیکھتے دیکھتے دفعتاً چونکا "یار، ہم کدھر جا رہے ہیں؟"

ظفر اس کی گھبراہٹ پر تھوڑا چکرایا "کیوں کیا ہوا؟"

"یار، یہ تو بہاولپور روڈ پر مڑ گئی ہے۔"

پیچھے کی نشست پر بیٹھے بیٹھے کسی آدمی نے اونچی آواز میں پوچھا "کنڈیکٹر یہ بس کدھر جا رہی ہے؟"

پھر کسی نے غصیلی آواز میں کہا "کیا ڈرائیور کا دماغ چل گیا ہے؟"

کنڈیکٹر نے سٹپٹا کر باہر جھانکا۔ پھر جواب دیے بغیر کسی قدر گھبراہٹ میں ایک عجلت کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ کتبے والا آدمی بولتے بولتے چپ ہو گیا اور اپنی نشست پر آ بیٹھا تھا۔

بس بہاولپور روڈ پر مڑی اور تھوڑی دور چل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پھر چونکا "یار یہ کون سا بس سٹینڈ ہے؟"

بیگ والے شخص نے باہر جھانک کر دیکھا، پھر کہا "یہاں کوئی سٹینڈ نہیں۔ پتا نہیں کیوں کھڑی ہو گئی۔"

"ڈرائیور کوئی نیا آدمی معلوم ہوتا ہے۔" کسی نے ٹکڑا لگایا۔

کنڈیکٹر سیڑھیاں چڑھ کر تیزی سے اوپر آیا۔ اعلان کیا: "گاڑی ریگل نہیں جائے گی جسے اُترنا ہو اتر جائے۔"

"ریگل نہیں جائے گی؟" تعجب پھر غصہ "کیوں نہیں جائے گی؟"

"اُدھر گڑبڑ ہے جی... ریگل والے جلدی کریں۔ اُتر جائیں۔"

گھبراہٹ کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ چند سواریاں اُٹھیں اور ہبڑ دبڑ نیچے اتر گئیں۔

"مگر اسٹیشن تو جائے گی؟" بیگ والے شخص نے سوال کیا۔

"اسٹیشن جائے گی۔" یہ کہتے کہتے کنڈیکٹر کی آواز نے پھر اعلان کا رنگ اختیار کر لیا۔ "اسٹیشن والی سواریاں بیٹھی رہیں۔"

اسے ڈر سا لگا۔ سوچا کہ بس تو ان دنوں بہت غیر محفوظ سواری ہے۔ یہاں اُتر پڑو اور ٹیکسی کر کے آگے چلو۔ پھر اُس نے تامل کیا۔ ظفر میرے بارے میں کیا سوچے گا۔ ظفر کے خیال سے اس نے اپنے خوف پر قابو پایا۔ اس نے مزید سوچا' گڑبڑ تو ریگل کی طرف ہے۔ بس نے ریگل کا راستہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ بس ڈرائیور نے عاقبت اندیشی دکھائی۔ اس نے ڈرائیور کو عاقبت اندیشی پر دل ہی دل میں داد دی۔ پھر دریچے سے باہر جھانکنے لگا۔

وہ دیر تک دریچے سے باہر دیکھتا رہا۔ کئی بار دریچے سے منہ نکال کر جھک کر نیچے دیکھا۔ پھر منہ اندر کرتے ہوئے بولا "یار سمجھ میں نہیں آتا کہ بس کدھر جا رہی ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔"

ظفر نے اسے جھڑکا "تم کس چکر میں پڑے ہوئے ہو۔

بس کو اسٹیشن پہنچنا ہے۔ جس راستے سے بھی پہنچے بہر صورت پہنچ جائے گی۔"

دوسری طرف کی نشست پر دریچے کے برابر بیٹھے ہوئے اس شخص نے جس نے بھینسیا رنگ کی ملگجی سی اچکن پہن رکھی تھی' دریچے سے باہر دیکھا اور تشویش کے ساتھ اونچی آواز میں سوال کیا "کنڈیکٹر ہم کدھر جارہے ہیں۔"

کنڈیکٹر جواب میں دریچے سے باہر منہ نکال کر دیکھنے لگا۔ پھر منہ اندر کرتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں بولا "ٹھیک جارہے ہیں جی۔"

اچکن والا آدمی مطمئن ہو بیٹھا۔ پھر برابر بیٹھے ہوئے ثقہ صورت فرنچ کٹ ڈاڑھی والے شخص سے مخاطب ہوا "صاحب کیا خیال ہے آپ کا، حالات بگڑتے ہی چلے جا رہے ہیں۔"

ثقہ آدمی نے گمبھیر لہجے میں کہا "عزیز، حالات اس وقت بہت خراب ہیں۔"

اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے جوان العمر شخص نے جس نے عینک لگا رکھی تھی اور صاف ستھرا سوٹ پہن رکھا تھا، مڑ کر ثقہ آدمی کو دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔

اچکن والے آدمی نے تائیدی لہجے میں کہا "صاحب میرا بھی یہی خیال ہے اور کل ایک عجب واقعہ ہوا۔"

"کیا؟"

"صاحب عجب سا واقعہ ہے۔ کل میری ایک مرغی نے یکا یک بالکل مرغ کی طرح بازو پھڑ پھڑائے، گردن پھلائی اور بانگ دینی شروع کردی۔"

بیگ والے شخص نے چونک کر پوچھا "مرغی نے؟"

"جی ہاں مرغی نے۔ میں نے فی الفور اس کی گردن پر چھری پھیر دی۔"

"حیرت کی بات ہے"۔ بیگ والا بولا جیسے اسے یقین نہیں آرہا۔

"حیرت کی بات ہے اور تشویش کی بھی۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے۔" اچکن پوش نے ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہوگیا۔

عینک والے آدمی نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ غور سے اچکن پوش پر نظر کی اور ایک دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں پھیرتے ہوئے پھر اپنے رُخ دیکھنے لگا۔

اچکن پوش کو عینک والے آدمی کا مسکرانا کچھ بھایا نہیں۔

"کیوں جناب آپ ان باتوں کو نہیں مانتے؟"

"نہیں۔"

"آپ مت مانیں مگر ایسا ہوتا ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے تایا جان کی ایک خیلیا ساس تھیں۔ وہ دلّی کی تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ قلعہ سے رمضان کے رمضان افطاری کے خوان جمعہ مسجد جایا کرتے تھے۔ اس برس بھی گئے مگر ایک شام کو کیا ہوا کہ خوان قلعہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ جانے کسی طرف سے چیلیں منڈلاتی آئیں۔ ایسا جھپٹا مارا کہ خوان اوندھے ہوگئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا۔ اس شام جمعہ مسجد میں افطاری تقسیم نہیں ہوئی۔ اسی رمضان میں عید سے پہلے پہلے دلی میں قیامت برپا ہوگئی۔ پھر غدر مچ گیا۔ پھر کال پڑا، ایسا کال..... بس یہ سمجھ لو کہ زبردست کال پڑا تھا۔"

ثقہ آدمی توجہ سے سنتا رہا پھر کہنے لگا "ہاں عزیز یہ اشاراتِ غیبی ہوتے ہیں۔ قدرت رزق چھیننے سے پہلے کسی نہ کسی رنگ میں اشارہ ضرور کرتی ہے۔ اب کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔"

بیگ والے آدمی نے جھرجھری لی اور بولا "جناب آپ کی اس بات پر مجھے اپنا ایک خواب یاد آگیا۔ جیسے میں اپنے صحن میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہوں۔ تھالی میں روٹیاں رکھی ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا، پشاوری پراٹھے سے بڑی روٹیاں اور ایسی سفید جیسے میدے کی ہوں اور ایسی نرم جیسے لوچیاں۔ اتنے میں ایک موٹا سا بندر دیوار سے کودتا ہے۔ میرے سامنے سے ساری روٹیاں اُٹھاتا ہے اور یہ جا وہ جا۔"

اچکن پوش نے کچھ تعجب، کچھ افسوس سے پوچھا "ساری روٹیاں؟"

"جی ساری روٹیاں۔" بیگ والے نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ "کوئی روٹی نہیں چھوڑی۔ تھالی خالی..... اور جناب آپ کو شاید یہ بات عجیب سی نظر آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد میں پنپا نہیں۔ کاروبار پٹ ہوگیا۔ سارا اثاثہ غارت ہوگیا۔ یہ نوبت آگئی کہ موٹر بھی بک گئی۔ اب میں بس میں سفر کرتا ہوں۔"

ثقہ آدمی نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔ "یہ خواب تم نے کب دیکھا تھا؟"

"کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ شاید اس سے بھی پہلے کی۔ یا شاید اس کے بعد کی۔"

"صدقہ دیا تھا؟"

"نہیں۔"

"دے دینا چاہیے تھا۔"

ثقہ آدمی کا لہجہ تشویشناک تھا۔ بیگ والے شخص نے اس آدمی کی تشویش بھری صورت دیکھی اور سوچ میں پڑ گیا۔ اچکن پوش نے جو غور سے سب کچھ سُن رہا تھا' کہا "بھائی جان، شاید آپ اس بات کو مبالغہ سمجھیں مگر اس میں بالکل مبالغہ نہیں۔ ایسی روٹی جو آپ بیان کررہے ہیں ہم نے بچپن میں سچ مچ کھائی ہے مگر بھائی اب نہ ویسا گیہوں نہ دیسی روٹی۔"

ثقہ شخص افسردہ لہجے میں کہنے لگا "صاحب، اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ ہم ہی نے وہ زمانہ بھی گزارا جب ایک روپے کے گیہوں کے لیے مزدور کرنا پڑتا تھا۔ مزدور منڈی سے گھر تک آتے آتے پسینا میں شرابور ہوجاتا۔ ہم ہی یہ زمانہ دیکھ رہے ہیں کہ روپے کا آٹا اللہ جھوٹ نہ بلوائے مٹھی میں آجاتا ہے۔"

بس کی رفتار اچانک بہت تیز ہوگئی۔ اس نے دریچے سے باہر دیکھتے دیکھتے بے چین ہوکر ظفر کو دیکھا اور کہا "یار ظفر، مارے گئے۔"

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"لگتا ہے کہ کوئی جلوس ہے۔"

کنڈیکٹر نے اعلان کیا "بادشاؤ، اپنے اپنے سر اندر کرلو۔"

جو جو آدمی گردن نکالے باہر دیکھ رہا تھا' اس نے گردن اندر کرلی۔ سب اس طرح سکڑ سمٹ گئے جیسے وہ پوٹلی بن گئے ہیں۔ عینک والا آدمی ہنوز سر نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ ثقہ شخص نے متانت سے کہا "عزیز، سر اندر کرلو۔ اینٹ سرد دیکھ کر آتی ہے۔"

عینک والے آدمی نے قدرے توقف کے بعد، بغیر کسی عجلت کے آہستہ سے سر اندر کرلیا جیسے کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ اپنے طور پر اس نے یہ اقدام کیا ہے۔

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ اگر اینٹ میری طرف آئی تو؟ اس نے اپنی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ دریچے کے برابر تو میں بیٹھا ہوں۔ ظفر میری اوٹ میں ہے۔ تو گویا میں اینٹ کی زد میں ہوں۔ میں نے ہی بیٹھنے میں عجلت کی۔ جیسے ہم دونوں بس میں چڑھے تھے مجھے چاہیے تھا کہ تھوڑے رسمی تکلف سے کام لیتا۔ اس صورت میں ظفر دریچے کے برابر ہوتا اور میں اس کی اوٹ میں۔ اب میں دریچے کے قریب اور اینٹ کی زد میں ہوں اور اینٹ نہ بھی لگے، یہ کمبخت شیشہ جب ٹوٹ کر بکھرے گا تو خونم خون کردے گا۔

"بادشاؤ، سر اندر کرلو۔ اے بھائی ٹوپی والے بابو، سر اندر۔" کنڈیکٹر نے پچھلی نشست پر کسی کو باہر جھانکتے دیکھا تو اسے تنبیہ کرنے لگا۔

اس نے جھرجھری لی اور بولا "یار ظفر، عجیب سی بات ہے۔"

"کیا؟"

''وہی زمانہ واپس آ گیا۔''

''کون سا؟''

''ہماری اسپیشل ریل رات کے وقت مشرقی پنجاب سے گزری تھی۔ میں رات بھر سگریٹ نہیں پی سکا۔ ایک دفعہ ماچس جلائی تھی کہ ڈبے والوں نے شور مچا دیا' ماچس بجھاؤ، روشنی پر گولی آتی ہے۔''

''امتیاز گھیلا مت کرو۔'' ظفر نے کسی قدر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''وہ قصہ اور تھا یہ قصہ اور ہے۔''

''کیسے؟''

''وہ ہندو مسلمان کا قصہ تھا۔''

''اور یہ؟''

''یہ پیدل سوار کا قصہ ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''سیدھی صاف بات ہے۔ اس وقت ہم بس میں سوار اور ہوائی منزل میں بیٹھے ہیں' اس لیے اینٹ کی زد میں ہیں۔''

اس نے سوچا پھر کہا ''اگر میں اگلے اسٹاپ پر اُتر جاؤں پھر؟''

''پھر تم بھی اینٹ مارنے والوں میں ہو گے۔''

''ہرگز نہیں۔''

''تو پھر تماشائیوں میں ہو گے۔''

''ہرگز نہیں۔''

وہ اس بات کا جواب دینے لگا تھا کہ بس دفعتاً رک گئی۔ وہ بولا ''کیا بات ہوئی؟ بس رک گئی۔''

''کوئی اسٹاپ ہو گا۔'' ظفر بولا۔

''جب اپنے روٹ ہی پر نہیں چل رہی ہے تو اسٹاپ پر رکنے کا کیا سوال۔'' یہ کہتے کہتے اس نے دریچے سے پوری گردن باہر نکال کر نیچے دیکھا۔ شاید اسٹاپ ہی تھا، یا شاید کوئی اسٹاپ نہیں تھا۔ ایک شخص دھوتی باندھے، میلا کرتا پہنے زور زور سے سیڑھیاں چڑھا آیا اور قریب کی نشست پر بیٹھ کر بولا ''باؤ جی، کونسا نمبر ہے یہ؟''

ظفر نے اسے دیکھا اور کہا ''جب یہ بس چلی تھی تب تو اس کا ایک نمبر تھا اور وہ ہمیں معلوم تھا۔ اب پتا نہیں کہ اس کا کیا نمبر ہے؟''

وہ شخص اس جواب سے کچھ چکرایا، پھر سیدھا سوال کیا ''باغبانپورے جائے گی؟''

''اب یہ بس کسی بھی رخ جا سکتی ہے۔'' ظفر کہنے لگا ''ہو سکتا ہے، یہ باغبانپورے ہی کی طرف نکل جائے۔''

وہ شخص ان جوابوں سے کچھ شک میں پڑ گیا۔ کچھ سوچ کر ایکا ایکی اُٹھ کھڑا ہوا اور عین اس وقت جب کنڈیکٹر کی سیٹی بج چکی تھی' وہ تیزی سے سیڑھیاں اُتر گیا۔

''یار ظفر'' اسے بھی اب بے چینی ہونے لگی۔ ''ہم آج اسٹیشن پہنچ بھی جائیں گے؟''

''کہیں نہ کہیں تو پہنچیں گے۔''

ظفر کی یہ بات اس نے سنی اور جواب دیے بغیر کسی قدر فکر کے ساتھ دریچے سے باہر جھانکنے لگا۔ ''پتا نہیں بس کس کس راستے سے جا رہی ہے۔ کوئی بہت ہی آڑا ترچھا روٹ اختیار کیا ہے۔'' وہ رُکا پھر بولا ''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ اس وقت بس کی کوئی سمت نہیں۔ بس اندھا دُھند چلے جا رہی ہے۔''

ثقہ شخص نے یہ فقرہ سُن کر کسی قدر بے چارگی کے ساتھ کہا ''آج تو ہم ڈرائیور کے رحم و کرم پر ہیں۔''

عینک والے نے تھوڑی برہمی سے کہا ''ڈرائیور کوئی نہایت غلط قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

''ارے صاحب میں اس ڈرائیور کو جانتا ہوں۔'' اچکن پوش نے اپنی واقفیت عامہ کا ثبوت بروقت فراہم کیا۔ ''یہ ڈرائیور کئی حادثے کر چکا ہے۔ اس کا کمال ہے کہ سواریوں کی ہڈیاں پسلیاں تڑواڈالتا اور خود صاف بچ نکلتا ہے۔''

ثقہ شخص نے ٹھنڈا سانس بھرا ''غلط ڈرائیور سے ڈرنا چاہیے۔''

عینک والے نے پھر اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ ''بہت ہی پھیر دے کر لیے جا رہا ہے۔''

اچکن پوش بولا ''اماں، ہم پہنچ جائیں تو غنیمت سمجھنا۔''

عینک والا بولا ''راستہ تو سیدھا تھا۔ بجائے اس طرف آنے کے مزنگ چونگی سے جیل روڈ پر مڑ جاتی۔ جیل روڈ سے ریس کورس روڈ۔ ریس کورس روڈ سے ڈیوس روڈ سے نکل کر شملہ پہاڑی۔ شملہ پہاڑی سے سیدھی اسٹیشن۔''

بیگ والے آدمی نے عینک والے کو غور سے دیکھا۔ پھر کہا ''بابو صاحب سیدھے راستے اس وقت سب بند ہیں۔''

ثقہ شخص نے اردگرد دیکھا ''کنڈیکٹر کہاں گیا؟''

''ابھی تو یہاں تھا' شاید نیچے اُتر گیا۔''

''کنڈیکٹر کو گولی مارو جی۔'' اچکن پوش غصے سے بولا ''نیچے جا کے دیکھنا چاہیے کہ ڈرائیور بھی ہے یا نہیں مجھے تو کچھ یوں لگتا ہے کہ بس اس وقت بغیر ڈرائیور کے چل رہی ہے۔''

کتبے والے نے اچانک جھرجھری لی۔ کھڑا ہوا اور شروع ہو گیا: ''مجھے اپنے مسلمان بھائی کی یہ بات سن کر افسوس ہوا۔ بس کا چلنا بغیر ڈرائیور کے ناممکن۔ یہ کلمۂ کفر سے احتراز کرو، مگر شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

جہازِ عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں سوار کاہے کو بے اختیار بیٹھے ہیں

مگر شاعر نے یہ بات کہاں سے لی۔ ایہا الناس! اے لوگو ایسے اونٹوں پر سوار ہو جن کی باگیں تمہارے ہاتھوں میں نہیں۔ سوار اور اونٹ دونوں سو رہے ہیں اور چل رہے ہیں، بے سمت بے منزل۔ مگر مسلمانو! حضرت ابوذر غفاریؓ تو نہیں سو سکتے تھے کیونکہ اونٹ کی پیٹھ ننگی تھی۔ مجھے اپنے مسلمان بھائی کی بات سن کر بہت افسوس ہوا۔ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ چھنے ہوئے آٹے کی روٹی دیکھ کر کیوں روئے، ہاں کیوں روئے۔ میرا جواب۔ حضرت علیؓ شیر خدا کے دسترخوان پر رکھی ہوئی بھوسی کی روٹی۔ پھر کیا ہوا؟ صدیاں گزر گئیں انصاف مانگتے' انصاف نہیں ملا مجھے!

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے بعد آج ہم کدھر جا رہے ہیں؟ یہ میرا سوال ہے۔ مجھے جواب دو۔ سات پیسے کا کارڈ لکھ کر کیونکہ زبانی بحث میں جھگڑے کا ڈر ہے اور فساد منع ہے از روئے اسلام۔ چھنے ہوئے آٹے کی روٹی، بھوسی کی روٹی، نانِ جویں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کرتا اور فرمانا اس جناب کا کہ کاش ایران اور عرب کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہوتا اور ٹکڑے ٹکڑے کرنا ایرانی قالین کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کہ نثار ہوں ہماری تمہاری جانیں ان پر سے، اگر جانیں ہم میں تم میں باقی ہیں مگر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ داخل ہوئے دارالامارۃ میں تو روئے دیکھ کر دیباوحریر کو کیوں؟ جواب دو مجھے سات پیسے کا کارڈ لکھ کر کہ زبانی بحث...''

سنتے سنتے وہ کسمسا کر بولا ''ظفر یار اس شخص کی باتوں میں تمہیں کوئی ربط نظر آتا ہے؟''

''ربط آج کل کن کی باتوں میں نظر آتا ہے؟'' ظفر نے بے پروائی سے کہا اور پھر دلچسپی کے ساتھ کتبے والے آدمی کی تقریر سننے لگا.....

''ہاں سات پیسے کا کارڈ لکھ کر کہ زبانی بحث میں جھگڑے کا ڈر ہے اور فساد منع ہے از روئے اسلام۔ جہالت کا عمل اور علم کا عمل اور عمل کا.....''

ثقہ شخص نے کہ اپنی ہی سوچ میں گم تھا۔ اچانک بیگ والے آدمی کو مخاطب کیا ''میرے عزیز ایک بات بتاؤ۔''

''جی فرمایئے۔'' بیگ والا آدمی مؤدب ہو بیٹھا۔

''کچھ یاد ہے کہ وہ دن کون سا تھا؟''

''دن؟ کون سا دن؟'' بیگ والا چکرایا۔

''جب تم نے خواب دیکھا تھا۔''

''اچھا جب خواب دیکھا تھا۔'' سوچ کر بولا ''صاحب یہ تو اب مجھے یاد نہیں۔''

''وقت یاد ہے؟''

''نہیں صاحب۔ خاصا ہی عرصہ ہو گیا اس بات کو۔ بس اتنا یاد رہے کہ وہ بہت موٹا بندر تھا۔ میں سہم گیا۔ اس نے ساری روٹیاں سمیٹیں اور غائب۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔''

ثقہ شخص سوچ میں پڑ گیا۔ بیگ والا آدمی جواب کے انتظار میں اسے تکتا رہا۔ پھر جب کچھ جواب نہ آیا تو کہنے لگا: ''ویسے صاحب! عجب بات ہے میں خواب میں بندر بہت دیکھتا اور عجیب عجیب صورتوں میں دیکھتا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے کارخانہ ہے۔ کارخانے میں بہت سا ریشم ہے اور بندر ہیں۔''

''جی کیا کہا ریشم اور بندر؟'' اچکن پوش نے بہت تعجب سے ٹوکا۔

''جی ہاں۔'' بیگ والا بولا ''یہی تو مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ کارخانے میں ریشم ہی ریشم اور بندر۔ جیسے ہر بندر نے ریشم کی ایک ایک گچھی لے رکھی ہے اور دانتوں سے جیسے اسے سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور میں کہہ رہا ہوں کہ یہ کیا سلجھائیں گے' یہ تو ریشم برباد کر رہے ہیں۔ ایک بندر نے ریشم دانتوں سے کاٹتے کاٹتے میری طرف غرا کے دیکھا جیسے اب مجھ پر لپکا۔ میں بھاگا..... اور بندر میرے پیچھے پیچھے..... بس پھر میری آنکھ کھل گئی۔''

''آنکھ کھل گئی؟'' اچکن پوش نے ایسے افسوس کے ساتھ پوچھا جیسے اچھی بھلی فلم چلتے چلتے اچانک ریل کٹ جائے۔

''ہاں بس پھر میری آنکھ کھل گئی۔'' بیگ والے نے بات دہرائی اور چپ ہو گیا۔

اچکن پوش کچھ سوچتا رہا۔ پھر ہنسا اور بولا ''ویسے صاحب، یہ بندر بھی عجیب جانور ہے۔ یہاں تو خیر ہوتا نہیں مگر ہم نے اسے ہندوستان میں دیکھا ہے کہ.....''

بیگ والے نے فوراً بات کاٹی ''کیا فرمایا پاکستان میں بندر نہیں ہوتے۔'' ثقہ شخص کو مخاطب کرتے کرتے ہنسا۔ ''صاحب آپ سُن رہے ہیں۔''

ثقہ شخص نے غور سے اچکن پوش کو دیکھا۔ بیگ والا آدمی اب زور زور سے ہنس رہا تھا..... ''صاحب آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔''

اچکن پوش بہت کھسیانا ہوا۔ کچھ جواب دینے کی بجائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

ثقہ شخص نے کہ خواب سنتے سنتے کس سوچ میں پڑ گیا تھا' سر اُٹھایا اور کہا'' کچھ یاد ہے یہ خواب آپ نے کب دیکھا تھا؟

بیگ والا آدمی ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر افسوس کے لہجے میں بولا ''صاحب یہی تو میرے ساتھ خرابی ہے۔ خواب بالکل ذہن سے اُتر جاتا ہے۔ پھر یونہی بلا وجہ، بلا سبب کسی وقت یاد آ جاتا ہے مگر پورا کہاں یاد آتا ہے۔ کب دیکھا تھا یہ تو بالکل ہی یاد نہیں آتا.....''

ثقہ شخص نے بہت سنجیدگی سے کہا ''یہ بُری عادت ہے خواب یاد رکھنا چاہیے۔''

''ہاں یاد تو رکھنا چاہیے''۔ بیگ والے آدمی نے کسی قدر احساسِ ندامت کے ساتھ کہا۔ چپ ہوا۔ پھر بولا ''ویسے صاحب بندر کو خواب میں دیکھنا کیسا ہے؟''

''بندر کو خواب میں دیکھنا.....'' ثقہ شخص نے تامل کیا۔ وہ آگے کچھ کہنے لگا تھا کہ اچکن پوش نے باہر دیکھتے دیکھتے اچانک اندر کی طرف دیکھا۔ چہرے پر تشویش کے آثار، آواز گھبرائی ہوئی ''اِس بس کے تو سب شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔''

''جی؟'' سب نے گھبرا کر اچکن پوش کو دیکھا۔

''جی ہاں سب شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔''

ثقہ شخص نے تحمل سے پوچھا ''بھائی تم کون سی بس کی بات کر رہے ہو۔''

''یہی ڈبل ڈیکر جو ابھی گزری ہے۔ خالی پڑی تھی اور سب شیشے چکنا چور تھے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ.....'' بیگ والا آدمی تشویش سے بولا..... ''آگے گڑبڑ ہے۔''

ثقہ شخص نے دُکھی لہجے میں کہا ''سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔''

عینک والے آدمی نے پلٹ کر ثقہ شخص کو دیکھا اور برہمی سے کہا ''کیا فرمایا؟ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟''

ثقہ شخص آہستہ سے بولا ''ہاں لوگوں ہی کو کہا جائے گا اور کس کو کہا جائے۔''

''لوگوں کو؟'' عینک والا آدمی غصے سے کانپنے لگا ''لوگوں کو کیوں کہا جائے گا۔ آپ کو پتا ہے آج صبح کیا ہوا ہے؟''

''آج صبح؟'' بیگ والے آدمی نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں آج صبح میں خود وہاں موجود تھا۔'' یہ کہتے کہتے عینک والے آدمی نے یوں جھرجھری لی جیسے کوئی عجب سا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ہے پھر وہ دانتوں میں ہونٹ چباتے ہوئے بڑبڑایا ''حرامزادے'' اور چپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے لیے سب چپ ہو گئے پھر بیگ والے آدمی نے برابر والے سے دبی سی آواز میں پوچھا ''صبح کیا ہوا تھا؟''

''پتا نہیں صاحب میں تو ابھی گھر سے نکلا ہوں۔''

اچکن پوش بڑبڑانے لگا ''عجیب زمانہ ہے۔ صبح کچھ، دوپہر کچھ، شام کچھ، عقل حیران ہے کہ ہو کیا رہا ہے۔''

ثقہ شخص نے افسردگی کا لہجہ اختیار کیا۔ بولے ''بہرحال حالات اچھے نہیں ہیں۔''

فقرے نے اس مرتبہ عجب اثر کیا۔ بس میں ایک تشویش بھری خاموشی چھا گئی۔ اچکن پوش، بیگ والا آدمی، خود عینک والا غرض سب چپ سے ہو گئے۔

اس نے باری باری سب چہروں کو دیکھا۔ چہرے دفعتاً عجب سے ہو گئے جیسے انھیں کسی بڑے خوف نے آلیا ہو۔ بس ایک شور کے ساتھ دوڑے چلی جا رہی تھی اور اب اسے احساس ہوا کہ بس چلتے ہوئے کتنا شور کرتی ہے۔ اس وقت یہی خواہش تھی کہ بس کی رفتار دھیمی ہو جائے۔ اس کی تیز اور پُرشور رفتار اسے خواہ مخواہ ڈرا رہی تھی۔ پھر اسے اس ڈبل ڈیکر کا خیال آیا، جو ابھی مقابل سے آتی ہوئی برابر سے گزری تھی۔ کیا واقعی اس کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے؟

ڈبل ڈیکر جب گزر رہی تھی' وہ اندر بیگ والے آدمی کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ آخر اتنی ہنسی کی کون سی بات ہوئی جو وہ ہنسے جا رہا ہے۔ گزرتی ہوئی بس پر اس کی نظر ضرور پڑی تھی مگر سرسری سی۔ اگر بس کے شیشے واقعی ٹوٹے ہوئے تھے تو مطلب یہ کہ آگے..... اور یہ سوچتے سوچتے اس نے پھر بڑی بے چینی سے اپنی صورت حال کا جائزہ لیا۔ میں تو درمیچ کے برابر بیٹھا اور بالکل اینٹ کی زد میں ہوں۔

''مسلمانو! مبادا تمہیں میرا سوال یاد نہ رہے۔'' کتبے والا آدمی پھر شروع ہو گیا ''مبادا تم نے میرا سوال اخباروں میں نہ پڑھا ہو کیونکہ اخبار والوں نے، یہاں کوئی اخبار والا بھائی ہو تو مجھے معاف کر دے۔ اخبار والوں نے اسی روز یہود نواز جانسن کی تصویر پہلے صفحہ پر چھاپی مگر میرا سوال اندر کے اس صفحہ پر جہاں منڈیوں کے بھاؤ چھپتے ہیں، ضرورتِ رشتہ کے اشتہار کے نیچے شائع کیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار مگر مجھے اخبار والوں سے کوئی گلہ نہیں۔ گلہ کیوں ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں تو کوئی اخبار نہیں تھا۔ بس مسجد نبوی تھی۔ تو میں نے اپنا سوال الگ چھپوالیا ہے۔ آپ یہ اشتہار گھر لے جا کر غور سے پڑھیں۔''

یہ کہتے کہتے کتبے والے آدمی نے اپنی نشست پر رکھا ہوا ایک ٹاٹ کا تھیلا اُٹھایا اس میں سے اشتہاروں کا ایک پلندہ نکالا ''تو اہلِ اسلام میرا سوال غور سے پڑھیں اور سات پیسے کے کارڈ پر جواب لکھ بھیجیں کیونکہ زبانی بحث میں جھگڑے کا ڈر

ہے اور.....''

اچانک ایک اینٹ اس کی پیچھے والی سیٹ کے شیشے پر آ پڑی۔ شیشہ تیز شور کے ساتھ چکنا چور ہو کر بکھر گیا۔ اس نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنے آپ کو سمیٹا، سر ظفر کی کمر اور نشست کی پشت کے درمیان ٹھونس لیا۔ پھر اسے کچھ معلوم نہ ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہاں اس نے اسی طرح آنکھیں بند کیے ظفر کی کمر اور نشست کی پشت کے درمیان منہ ٹھونسے محسوس کیا کہ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی ہے اور لوگ ہڑ دبڑ سیڑھیوں سے اُتر رہے ہیں۔ دل اس کا دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ بس ٹھہر گئی تھی اور وقت بھی۔

ظفر نے اسے ٹہوکا' تو اس نے سر اُٹھایا، جانے کتنی دیر کے بعد مگر بس اب چل پڑی تھی۔ اس نے ارد گرد، آگے پیچھے نظر ڈالی' اس طرف سے اُس طرف تک سب نشستیں خالی پڑی تھیں۔ اس کی نشست کے آس پاس شیشے کے کچھ بڑے بڑے ٹکڑے اور بہت سی کرچیاں بکھری پڑی تھیں۔ ہاں کتبے والا آدمی اپنی نشست کا سہارا لیے بت بنا کھڑا تھا۔ اس کا کتبہ اور اشتہار نیچے گرے پڑے تھے۔ کتبے والا آدمی جھکا' احتیاط سے اشتہار بٹورے، انھیں درست کر کے تھیلے میں رکھا۔ پھر تھیلا نشست پر اپنے برابر رکھ اور کتبہ ہاتھ میں تھام خاموش بیٹھ گیا۔ اب پھر کتبہ اپنے جلی حروف کے ساتھ اس کے اور ظفر کے بالمقابل تھا۔

''میرا نصب العین..... مسلمان حکومت کے پیچھے جمعہ ادا کرنا۔''

رفتہ رفتہ اس کا حوصلہ بحال ہوا۔ اس نے پھر باہر جھانک کر دیکھا' سڑک دور تک خالی پڑی تھی۔ کبھی کبھار گزرتا شور کرتا رکشا' کوئی سٹ پٹ کرتا تیزی سے گزرتا پیدل آدمی، جا بجا بکھری ہوئی اینٹیں، کہیں کہیں پڑے ہوئے شکستہ شیشے

زمانہ

زمانہ ایک دریا ہے ..... لوگ قطرے ہیں .....
پتا لگائیے یہ دریا کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے؟؟

مگر آپ اس کے آغاز و اختتام کا پتہ کیسے لگا سکتے ہیں؟ آپ خود اس کے ساتھ بہہ رہے ہیں..... اور اختتام تک پہنچنے سے پہلے آپ ختم ہو چکے ہوں گے۔

نظروں کے سامنے سے گزرتا ہوا اسٹاپ۔ اسٹاپ بے آدم، سائبان خالی۔ نہ کوئی برقعہ پوش عورت نہ کوئی اونگھتا ہوا بوڑھا۔ سامنے ساری سڑک پر اینٹیں بکھری پڑی تھیں اور ایک گرے ہوئے بڑے سے سائن بورڈ سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اسے لگا کہ گاڑی کسی دور دراز کے ویران سنسان اسٹیشن سے گزر رہی ہے۔

''یار ظفر ہم اسٹیشن ہی کی طرف جا رہے ہیں؟''

''کچھ پتا نہیں چل رہا''۔ اب ظفر کے لہجے میں بھی تشویش کا رنگ پیدا ہو چلا تھا۔

آگے کی نشست پر کتبے والا آدمی بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ کتبہ اسی طرح اپنے جلی حروف کے ساتھ اس کے اور ظفر کے بالمقابل تھا:

''میرا نصب العین..... مسلمان حکومت کے پیچھے جمعہ ادا کرنا۔''

اس نے پھر ظفر کو ٹٹولا ''یار ظفر؟''

''ہوں۔''

''ہم سلامت نکل جائیں گے؟''

ظفر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر لمبے تامل کے بعد بولا ''کیا کہا جا سکتا ہے۔''

●○○

پروفیسر سید محبوب ظفر انوار حمیدی

گمنام شعراء کے مشہور اشعار

ان شعروں کا اچھوتا تذکرہ جو زبان زدِ عام و خاص ہو چکے

اردو میں متعدد اشعار گمنام شعراء کی تخلیقات ہیں لیکن انھیں مشہور شاعروں کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔ کمال کی بات یہ کہ ایسے کئی اشعار دھڑلے سے سیاسی اور مذہبی تقریروں میں علامہ اقبال سے منسوب کر کے پیش کیے جاتے ہیں مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجیے

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اس شعر کو عام طور پر اقبال کی تخلیقی ہنرمندی کا نتیجہ تصور کیا جاتا ہے جبکہ یہ شعر اقبال کا نہیں اگر مذکورہ شعر اقبال کا ہوتا تو شاعرِ مشرق کے کلیات میں ہونا چاہئے تھا مگر اس میں اس شعر کا ذکر نہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ اقبال نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''بانگ درا'' جب شائع کیا تو بہت سے اشعار حذف کر دیے تھے۔ حذف کردہ اشعار کو مولوی احمد دین نے اپنی کتاب ''اقبال'' (جو اقبال کی شاعری پر پہلی تنقیدی کتاب ہے۔) میں شامل کیا تھا، اس میں بھی یہ شعر موجود نہیں ہے تو بھلا اس شعر کو اقبال سے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟

''برمحل اشعار اور ان کے مآخذ'' کتاب کے مؤلف خلیق الزماں نصرت نے ''حفیظ جونپوری حیات و شاعری'' صفحہ ۲۸ کے حوالے سے لکھا ہے ''یہ شعر شہیر مچھلی شہری کا ہے'' (صفحہ ۱۱۲)۔ شہیر مچھلی شہری ۱۸۵۶ء میں جونپور میں پیدا ہوئے۔ مچھلی شہر کے محلہ سیّد واڑہ میں ان کے آباؤ اجداد نیشاپور سے آ کر بس گئے تھے۔ شہیر، منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے۔ امیر مینائی شہیر کو نامور شعراء میں شمار کرتے تھے۔ وہ حفیظ جونپوری کے معاصرین میں تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا ایک دیوان ''خیابان ترنم'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے شاگرد سروش مچھلی شہری نے اس دیوان کو شائع کیا۔ ۱۹۲۹ء میں شہیر کا انتقال ہوا۔ طفیل احمد انصاری کے حوالے سے خلیق الزماں نصرت نے لکھا ہے ''۱۶ فروری ۱۹۹۱ء کو شہیر کا مذکورہ شعر ہفت روزہ بلٹز (بمبئی) کے آخری صفحے پر تصویر کے ساتھ شائع ہوا''۔ (برمحل اشعار اور ان کے مآخذ ''رضوی کتاب گھر'' جامع مسجد دہلی، ۲۰۱۲ صفحہ ۱۱۲)۔

☆☆

ایک نہایت مشہور شعر اکثر و بیشتر خواندہ اور نا خواندہ افراد ایک دوسرے کو سناتے رہتے ہیں اور خدا کی مشیّت کو ''مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ'' کے مصداق قرار دیتے ہیں بلکہ ان کی دلی آواز یہ ہوتی ہے کہ دشمن چاہے جتنی بھی تدبیر اپنا لے، اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی نہیں ہوگی، تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا اور ایسے ہی موقع پر درج ذیل شعر وہ نہایت اعتماد کے ساتھ پڑھتے ہیں

مدّعی لاکھ بُرا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے، جو منظورِ خدا ہوتا ہے

یہ شعر کس شاعر کا ہے، عام طور پر اہل علم حضرات بھی اس

سے بے خبر ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی سے آغا محمد باقر کا مرتبہ ''غزلیات برق'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۸۲ پر مذکورہ شعر برق لکھنوی سے منسوب ہے۔ خلیق الزماں نصرت کی تحقیق بھی یہ بتاتی ہے کہ یہ شعر برق لکھنوی کا ہے، جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''برمحل اشعار'' میں صفحہ ۵۷ پر کیا ہے۔

برق لکھنوی کا نام مرزا محمد رضا خاں تھا۔ وہ برق تخلص کیا کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام کاظم علی خاں تھا۔ برق ناسخ کے شاگردوں میں تھے۔ ان کا ایک دیوان ان کی حیات میں ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔

☆☆

لکھنؤ کے شعراء میں ثاقب لکھنوی کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی وہ تلخ حقیقتیں موجود ہیں، جن کی وجہ سے ان کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے۔ میر اور غالب کی پیروی کرتے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام ''دیوانِ ثاقب'' کے نام سے شائع ہو چکا۔ علاوہ ازیں غزل انسائیکلو پیڈیا (مرتبہ ذکی کاکوروی، مرکز ادب لکھنؤ ۱۹۶۸ء) میں بھی ان کے کلام کا نمونہ موجود ہے۔ ''غزلیات ثاقب'' کے عنوان سے بھی ان کے منتخب کلام شائع ہو چکے۔ سید احتشام حسین نے ثاقب لکھنوی کے فن کے بارے میں لکھا ہے:-

''مرزا ذکر حسین ثاقب (۱۸۶۰ء-۱۹۴۶ء) بھی لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے۔ والد کی ملازمت کے سبب سے الٰہ آباد، بھوپال اور آگرہ میں بھی رہے، مگر زیادہ وقت لکھنؤ میں ہی گزرا۔ شعر گوئی میں اس طرح محو ہو جاتے تھے کہ ادھر ادھر کی خبر نہ رہتی تھی۔ زیادہ تر غزلیں کہتے تھے اور میر و غالب کی پیروی کو ہی اپنے لیے فخر کی بات جانتے۔ ان کے کلام میں تھوڑا بہت لکھنؤ کا مصنوعی رنگ بھی ملتا ہے مگر بیشتر جذباتِ قلب کے اظہار سے ان کی شاعری کا اثر بڑھا ہوا ہے'' (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۱۹۹۷ء صفحہ ۲۴۹)۔

ثاقب لکھنوی کا ایک نہایت مشہور شعر جو مضمون نگار، مقررین اور اہل ذوق حضرات اکثر و بیشتر استعمال میں لاتے ہیں، لیکن انھیں اس کا علم نہیں کہ یہ شعر ثاقب لکھنوی کا ہے۔ یہ شعر بھی ان ہی درجنوں اشعار میں سے ایک ہے جو پڑھا اور لکھا تو بہت جاتا ہے، لیکن شاعر کے نام سے عام طور پر بے خبری پائی جاتی ہے۔ ثاقب لکھنوی کا مشہور زمانہ شعر ملاحظہ کیجئے اور شاعر کے درد کو محسوس کیجئے۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(بحوالہ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ صفحہ ۲۴۹، سوانحی انسائیکلو پیڈیا جلد اول مرتبہ رضا الرحمٰن عاکف دہلوی صفحہ ۲۰۰، برمحل اشعار اور ان کے مآخذ صفحہ ۱۱۷)۔

ثاقب لکھنوی کے اشعار میں ضرب المثل بننے کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ شعر گوئی میں محویت اور دنیا سے بے خبری کا ہی یہ عالم تھا کہ ثاقب لکھنوی کے متعدد اشعار ضرب المثل بن گئے جو انسانی درد کی مجسم تصویر بن کر ہمارے سامنے آئے۔ ثاقب کے یہ دو اشعار بھی قارئین کی نذر ہیں جو ان کی فنکاری اور تجربات زندگی کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

(جدید غزل گو صفحہ ۹۹)

مٹھیوں میں خاک لے کے دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

(جدید غزل گو صفحہ ۹۹)

☆☆

شکیب جلالی نے بھی ثاقب لکھنوی کی طرح نہایت خوبصورت اور اثر آفریں انداز میں اسی مفہوم کو اپنے ایک شعر میں یوں باندھا ہے۔

اِک سانس کی طناب جو ٹوٹی تو اے شکیب
دوڑے ہیں لوگ جسم کے خیمے کو تھامنے

(کلیات شکیب جلالی، دہلی ۲۰۰۷ء صفحہ ۳۵)

مولانا ظفر علی خان اپنی دھار دار طنزیہ صحافت کی وجہ سے تاریخ صحافت میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اخبار ''زمیندار'' کے مدیر کے طور پر ان کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیلی۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے، لیکن ان کی شاعری کو شہرت حاصل نہ ہو سکی بلکہ ''زمیندار'' کے ایڈیٹر کے طور پر انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ظفر علی خان ایک شعلہ بیان مقرر بھی تھے اور ان کی تحریروں میں بھی یہی صفت پائی جاتی تھی۔ وہ خلافت اور کانگریس کی تحریکوں کے قائد تھے۔ ان کی تحریک کا اصل مقصد ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنا تھا۔ ان کی زندگی کا معتدبہ حصہ قید و بند میں گزرا۔ نوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ ظفر علی خان کا ایک نہایت مشہور شعر ہے، جسے عام طور پر کچھ لوگ اقبال اور بعض اہل علم حالی سے منسوب کرتے ہیں، لیکن جس شعر کا یہاں ذکر مقصود ہے، اس کے تخلیق کار مولانا ظفر علی خان ہیں اور وہ شعر ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(بحوالہ برمحل اشعار اور ان کے مآخذ صفحہ ۱۱۸)

ظفر علی خان کا ہی ایک اور شعر جو بہت زیادہ نقل کیا جاتا ہے اور خطبا اسے اپنی تقریروں کا حصہ بناتے ہیں وہ یہ ہے۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

(بحوالہ برمحل اشعار اور ان کے مآخذ صفحہ ۱۱۸)

میر تقی میر اور امیر مینائی کے نام سے ایک شعر مدتوں سے منسوب کیا جاتا رہا ہے، لیکن تحقیق سے پتا چلا کہ وہ شعر میر تقی میر کا نہیں بلکہ نواب محمد یار خاں امیر ٹانڈوی کا ہے۔ میر سے منسوب کرتے ہوئے اسے غلط طور پر کچھ اس طرح پڑھا جاتا رہا ہے

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

لیکن اصل شعر کی صورت کچھ اس طرح ہے اور یہی زیادہ درست اور مستند مانا گیا ہے

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس شعر کے متعلق ماہنامہ شاعر بمبئی شمارہ اگست ۲۰۰۹ء صفحہ ۳۳ پر مذکور ہے کہ یہ شعر نواب محمد یار خاں امیر کا ہے۔ راز یزدانی نے ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جون ۱۹۶۲ء کے شمارے میں ایک مضمون بعنوان ''نواب محمد یار خاں امیر'' (صفحہ ۵ تا ۱۱) شائع کروایا تھا۔ اس میں محمد یار خاں امیر کی شخصیت اور شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اپنے مضمون میں مذکورہ شعر کے حوالے سے راز یزدانی نے لکھا ہے:-

ایک شعر اور پیش ہے

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

غلطی سے یہ شعر میرؔ سے منسوب کر کے اس طرح پڑھا جاتا ہے

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

لیکن حقیقت میں یہ شعر نہ میر تقی میر کا ہے نہ امیر مینائی کا (جیسا کہ کچھ اور حضرات کو شبہ ہوا ہے) بلکہ نواب محمد یار خاں امیر کا ہے۔

ایسے سینکڑوں اشعار ہیں جو تحقیق کے متقاضی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان اشعار کو کن شعراء نے لکھا ہے، حالانکہ وہ اشعار دوسرے شعراء سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ اردو کے متعدد گمنام شعراء ایسے ہیں، جن کے ایک یا دو اشعار اتنے مشہور ہوئے کہ وہ لوگوں کے حافظے کا حصہ بن گئے، لیکن لوگ ان اشعار کے اصل سخنور کے نام سے لاعلم ہیں۔ ان گمنام

آشنا

زلف آوارہ، گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں
تاثیر

نا آشنا نہیں، رہ و رسمِ جہاں سے ہم
لائیں مگر فریب کی صورت کہاں سے ہم
حفیظ جالندھری

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جانِ من
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا
احمد فراز

مدتیں گزریں اسی بستی میں لیکن اب تلک
لوگ ناواقف، فضا بیگانہ، ہم نا آشنا
احمد فراز

شاعری الفاظ کی ہیرا تراشی کا ہے فن!
وہ جو ہیں فن آشنا، ان سے حسد کرتے ہو کیوں
مرتضیٰ برلاس

آفتاب

وہ ولولے وہ جوش جوانی کے اب کہاں
ساتھ آفتاب کے گئی دھوپ آفتاب کی
ہری چند اختر

دو چار ہو رہا ہوں تمہارے شباب سے
گویا ملا رہا ہوں نظر آفتاب سے
بیخود دہلوی

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں
جلیل مانک پوری

افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح
اور آفتابِ عمر لبِ بام آ گیا
غلام ہمدانی مصحفی

شبنم کے چند قطروں کو پھولوں سے چھین کر
کیا مل گیا ہے پوچھے کوئی آفتاب سے
حکیم ناصر

شعراء کے بعض اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں یا ان کے شعر کا کوئی ایک مصرع زبان زد خاص و عام ہو چکا۔ یہاں ایسے ہی چند اشعار اور شاعر کے نام پیش کیے جا رہے ہیں، جو شاعر سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے
(پنڈت مہتاب رائے تاباں، بحوالہ شاعر اگست ۲۰۰۹ء صفحہ ۲۹)

جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں، بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹخ دیں، چشمۂ زمزم نکلتا ہے
(ریاض خیر آبادی، بحوالہ سوانحی انسائیکلوپیڈیا، صفحہ ۳۱۲)

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے
(ظریف لکھنوی، بحوالہ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، صفحہ ۲۵۱)

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
(مرزا محمد علی فدوی، بحوالہ برمحل اشعار اور ان کے مآخذ، صفحہ ۳۰)

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے
(احمد حسین امیر اللہ تسلیم، بحوالہ جدید شاعری، صفحہ ۱۹۷)

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
(وزیر لکھنوی، بحوالہ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، صفحہ ۱۰۳)

گمنام شعراء کے ایسے سینکڑوں اشعار ہیں جو شاعر سے زیادہ مشہور ہیں، جن پر تفصیل سے لکھنے کی گنجائش بنتی ہے۔

''پاک بحریہ سے کرکٹ کے میدان تک'' کا بقیہ حصہ

روشنیوں کے شہر پہنچ کر فخر کچھ عرصہ پریشان رہا۔ تیز رفتار شہری زندگی سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے اُسے وقت لگا۔ ایک دن اس کی پاک بحریہ کی کرکٹ اکیڈمی کے کوچ' ناظم خان سے ملاقات ہوئی۔ فخر نے انھیں بتایا کہ وہ بھی پاک بحریہ کی کرکٹ ٹیم میں شامل ہونا چاہتا ہے۔

ناظم خان نے پوچھا کہ نوجوان' تم کس پوزیشن پر کھیلتے ہو؟ فخر نے بتایا کہ وہ بائیں ہاتھ سے اوراوپنر کے طور پر کھیلتا ہے۔ کوچ نے ایک میچ میں بطور آزمائش اُسے اوپنر بھجوا دیا۔ اور لیجیے' فخر نے دیکھتے ہی دیکھتے چوکوں چھکوں کی مدد سے میچ میں سنچری جڑ دی۔ یہ دیکھ کر ناظم خان بہت خوش ہوئے اور انھوں نے فخر کو شاباش دی۔

اب پاک بحریہ کے کوچ کو احساس ہوا کہ اس نوجوان کی صلاحیتیں چمکا دی جائیں' تو وہ بہترین کرکٹر بن سکتا ہے۔ تب وہ ملک وقوم کے لیے اثاثہ ثابت ہوتا۔ فخر کی مزید جانچ پرکھ کے لیے انھوں نے اُسے اعظم خان کوچ کے پاس بھجوا دیا جو نوجوان کرکٹروں کی صلاحیتیں جانچنے کے ماہر تھے۔ اعظم خان نے بھی چار میچوں میں فخر کو کھیلنے کا موقع دیا۔ چاروں میں اُس نے عمدہ کارکردگی دکھائی۔

جہاں دیدہ اور تجربہ کار ناظم خان جان گئے کہ فخر زمان کی قسمت میں نیوی سیلر نہیں بلے باز بننا لکھا ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ پاک بحریہ کے مجاز افسران کو یہ درخواست دی جائے کہ وہ فخر زمان کو نیوی سیلر نہیں پیشہ ور کھلاڑی کی حیثیت سے بھرتی کر لیں۔

فخر تو بچپن سے کرکٹ کا دیوانہ تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ پاک بحریہ کے تعاون ومہربانی سے پروفیشنل کرکٹر بن سکتا ہے، تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ من بلیوں اچھلنے لگا مگر اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب فخر کے والد نے یہ درخواست دینے کی مخالفت کر دی۔ وہ بیٹے کو نیوی سیلر ہی بنانا چاہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ کھلاڑی کی حیثیت سے بیٹے کا کوئی مستقبل نہیں اور وہ دربدر مارا مارا پھرے گا مگر اللہ تعالیٰ کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے؟ فخر کو مایوس و پژمردہ دیکھ کر ناظم خان نے خود فقیر گل سے بات کی اور حکم خداوندی کے بل پہ انھیں درخواست دینے پر قائل کر لیا۔

درخواست میں ناظم خان نے نوجوان فخر کی بہت تعریف کی۔ چنانچہ وہ منظور ہو گئی اور ۲۰۰۸ء میں فخر بطور پروفیشنل کھلاڑی پاک بحریہ کی کرکٹ ٹیم کا حصہ بن گیا۔ یہ مردان کے تہی دست نوجوان کے لیے ایک انقلابی دن تھا کیونکہ اب اُسے آگے بڑھنے کی خاطر ایک پلیٹ فارم مل چکا تھا۔ رفتہ رفتہ ناظم خان اور اعظم خان اس ناتجربے کار نوجوان کی صلاحیتیں پالش کر کے اُسے ایک عمدہ کھلاڑی کے روپ میں ڈھالنے لگے۔ گو ترقی و بڑھوتری کا یہ سفر بڑا کٹھن اور مشکلات سے پُر تھا۔

مشکلوں سے مقابلہ

پہلی مشکل فخر کو والد کی ناراضی کی صورت برداشت کرنا پڑی۔ دراصل نیوی سیلر بن کر اس کی تنخواہ زیادہ ہو جاتی۔ تب وہ گھریلو اخراجات میں سرگرمی سے والد اور بھائیوں کا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ اب تنخواہ کم تھی جس سے فخر کے اخراجات ہی بمشکل پورے ہو پاتے مگر وہ سنہرے مستقبل کے سپنے آنکھوں میں بسائے شدید محنت کرتا رہا۔ اعظم خان کوچ بتاتے ہیں کہ وہ باؤلنگ مشین کے سامنے گھنٹوں شاٹس کھیلنے کی مشق کرتا تاکہ اپنے کھیل کو بہتر بنا سکے۔ یہ باؤلنگ مشین ۹۵ میل فی گھنٹا کی رفتار سے گیندیں کرواتی ہے۔

فخر زمان فطری طور پر جارح مزاج اور خطرے مول لینے والا کھلاڑی تھا۔ اس کے دونوں سرپرست کوچوں نے اُسے مبادیات کرکٹ بتاتے سکھاتے ہوئے یہی کوشش کی کہ وہ ہر میچ میں بے خوف وخطر اپنا فطری کھیل کھیلے۔ کوچوں کی زیر سرپرستی فخر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ اُسے کراچی کے انڈر

۱۹ اور انڈر ۲۳ کرکٹ ٹیموں میں بھی شامل کرلیا گیا۔

لیکن فخر جب کچھ میچوں میں اچھا اسکور کرنے میں ناکام رہا تو اس پر مایوسی چھا گئی۔ وہ پژمردگی کے عالم میں سوچنے لگا ''کیا کرکٹ میں میرا مستقبل چھپا ہے؟ اگر میں کامیاب نہ ہوسکا تو پھر؟ میری زندگی تو پھر تباہ ہوجائے گی۔'' جب فخر پر مایوسی کا دورہ پڑتا' تو اعظم خان اس کی ہمت بندھاتے اور کہتے کہ دیکھنا' ایک دن ضرور آئے گا جب کامیابی تمھارے قدم چومے گی۔

استاد کی ناراضی

فخر زمان اس مشکل دور کو یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے ''سچ یہ ہے کہ جب بھی میں کسی میچ میں بڑا اسکور نہ بنا پاتا' تو سوچنے لگتا کہ کرکٹ کھیلنا چھوڑ دوں۔ ایک بار میں اہم ٹورنامنٹ کے ابتدائی تین میچوں میں صرف ۲۵ رن بنا پایا۔ مجھ پر مایوسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ تب اعظم بھائی نے کہا' بیٹا! حوصلہ مت ہار۔ دیکھو اب تک تم پر میرا اعتماد بحال ہے۔ میں تمھیں اگلے ٹیسٹ میں بھی کھلاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے بھلا کیا اور میں نے اگلے تین میچوں میں مسلسل سینچریاں بنائیں۔ یہ آخری بار تھا کہ میں نے کرکٹ کو تج دینے کا سوچا۔

حقیقت ہے کہ اعظم بھائی میری ہمت افزائی نہ کرتے' تو میں دنیائے کرکٹ سے رخصت ہوجاتا۔ میں ان کا تاعمر شکر گزار رہوں گا۔''

ناظم خان اور اعظم خان کی مدد حاصل ہونے کے باوجود فخر زمان کچھ بے صبرا ہوگیا۔ نوجوانی میں انسان جلد باز ہوتا ہے اور فوراً کچھ کر دکھانے کا متمنی اس لیے غلطیاں ہوجاتی ہیں۔ ہوا یہ کہ فخر جلد از جلد لسٹ اے کرکٹ (ایک روزہ قومی کرکٹ) شروع کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کراچی میں مقابلہ بڑا سخت ہے اور وہ شہر کی ٹیم میں شامل نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ وہ مردان چلا گیا جہاں مقابلہ سخت نہ تھا۔

اعظم خان اور ناظم خان' دونوں کا کہنا تھا کہ فخر کو کراچی ہی رکنا چاہیے۔ یہ بڑا شہر ہے اور یہاں سیکھنے اور بڑھنے کے مواقع زیادہ ہیں۔ تاہم فخر اپنے اساتذہ کی باتیں ان سنی کرتے مردان چلا گیا۔ آخر چھ ماہ بعد اُسے احساس ہوا کہ مردان میں تو واقع کرکٹ محدود پیمانے پر کھیلی جاتی ہے اور یہاں ترقی کا موقع بہت کم ہے۔ چنانچہ وہ اوائل ۲۰۱۱ء میں واپس کراچی آ گیا۔

دونوں استاد اپنے شاگرد سے سخت ناراض تھے۔ انھوں نے فخر سے کئی دن تک بات چیت نہ کی۔ جب فخر نے معافیاں مانگیں' تو آخر اعظم خان کا دل پسیج گیا۔ ان کی کوششوں سے آخر فخر زمان کو لسٹ اے کرکٹ کی ٹیم' کراچی زیبرا میں شامل کرلیا گیا۔ فخر نے ۲۷ر جنوری ۲۰۱۲ء کو اپنا پہلا لسٹ اے میچ ملتان ٹائیگرز کے خلاف کھیلا۔ اس میچ میں فخر ۱۰ رن بنا پایا تھا۔

فخر زمان کے والد انٹرویو دیتے ہوئے

۲۰۱۲ء میں وہ شہر کی فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے والی ٹیم' کراچی بلیوز کا حصہ بن گیا۔ فخر نے ۱۹ر جنوری ۲۰۱۳ء کو ملتان ٹائیگرز کے خلاف اپنا پہلا فرسٹ کلاس چار روزہ میچ کھیلا۔ اس میچ میں فخر کی کارکردگی تسلی بخش رہی۔ اس نے پہلی اننگ میں ۷۹ اور دوسری میں ۸۳ رن بنائے۔

اسی سال اپنے کوچوں کے مشورے سے فخر نے پاک بحریہ کو خیر باد کہہ دیا۔ اس عسکری مادر علمی نے مردان کے نوجوان کی صلاحیتیں چمکا دی تھیں۔ اب اُسے دنیا والوں کے سامنے ان کا اظہار کرنا تھا۔

خودداری سے جینا سیکھو

فخر زمان کی نظریں قومی کرکٹ ٹیم پر جمی تھیں۔ وہ اس کا

حصہ بننے کے لیے بے تاب تھا مگر منزل ابھی دور تھی اور کانٹوں و رکاوٹوں سے پُر! مگر پاک بحریہ میں ملازمت کے دوران اُسے بڑے نظم وضبط سے مشکلات کا مقابلہ کرنا سکھایا گیا تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ کٹھن سے کٹھن وقت میں بھی حوصلہ نہ ہارو اور بہادروں کی طرح مشکلوں سے نبرد آزما رہو۔ یہی وجہ ہے' فخر میچ میں بڑا اسکور نہ بنا پاتا' تو اسے افسوس ضرور ہوتا مگر مایوسی اب قریب نہ پھٹکتی..... وہ خودداری اور بردباری سے جینا سیکھ چکا تھا۔

کہتے ہیں اللہ کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں۔ فخر زمان کی داستان حیات پر یہ مقولہ فٹ بیٹھتا ہے۔ پاکستان سمیت تمام ممالک میں جن خوش قسمت کھلاڑیوں کو قومی ٹیم کا حصہ بننا ہو' وہ عموماً اٹھارہ بیس سال کی عمر میں یہ مقام پالیتے ہیں۔ مگر فخر اپریل ۲۰۱۷ء میں ستائیس سال کا ہونے والا تھا اور دور دور تک یہ امکان نہیں تھا کہ اُسے قومی کرکٹ ٹیم میں شامل کرلیا جائے لیکن جہاں چاہ وہاں راہ۔

۲۰۱۷ء میں فخر کو پاکستان سپر لیگ کی ٹیم' لاہور قلندرز ٹیم میں جگہ مل گئی اور اُس نے قومی چیمپئن شپ کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ مشہور بلے باز' یونس خان نے فخر کو لاہور قلندرز میں لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ مقابلے قومی ٹیم کے کوچ' مکی آرتھر نے بھی دیکھے۔ اس کی تجربے کار نگاہوں نے بھانپ لیا کہ جارح مزاج فخر قومی ٹیم کا حصہ بن کر فتوحات دلوانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اوائل مارچ ۲۰۱۷ء میں فخر کو ٹی ٹونٹی بین الاقوامی میچ کھیلنے والی قومی ٹیم میں شامل کرلیا گیا۔ یوں فخر اور اس کے اہل خانہ اور دوست احباب کی دعائیں رنگ لائیں اور اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔

اب فخر کے سامنے یہ جاں گسل امتحان درپیش تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بہترین کھیل دکھائے اور پوری دنیا کو چونکا دے۔ اس کی محنت وسعی تبھی سب پر آشکار ہوسکتی تھی۔ اس نے ۳۰ر مارچ ۲۰۱۷ء کو ویسٹ انڈیز کے خلاف اپنا پہلا (ٹی ٹونٹی) بین الاقوامی میچ کھیلا۔ یہ تین میچوں کی سیریز تھی۔ بدقسمتی سے وہ سیریز میں متاثر کن کارکردگی نہیں دکھا پایا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ مکی آرتھر نے فخر پر اپنا اعتماد بحال رکھا۔ چنانچہ کوچ اور کپتان سرفراز احمد نے چیمپئنز ٹرافی کھیلنے والی ٹیم میں اُسے بھی شامل کرلیا۔

ایک خود پروردہ کھلاڑی

فخر بھارت کے خلاف پہلے میچ میں نہیں کھیلا مگر جب اس مقابلے میں احمد شہزاد نہ چل پایا تو فخر کو جنوبی افریقا کے خلاف اپنا پہلا ایک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلنے کا سنہری موقع مل گیا۔ تب فخر کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ اگلے دو ہفتے اس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب لانے والے ہیں۔

اس نے سری لنکا اور انگلینڈ کے خلاف کھیلتے ہوئے نصف سینچریاں بنائیں' تو فخر کے جارحانہ کھیل نے پاکستانی قوم کا دل موہ لیا۔ تبھی بیشتر پاکستانی فخر زمان کے نام وکھیل سے واقف ہوئے اور ان پر منکشف ہوا کہ وہ ایک خود پروردہ (سیلف میڈ) کھلاڑی ہے۔ صحافیوں کی کھوج سے انھیں یہ بھی پتا لگا کہ اب تک اس کے اہل خانہ خوشحال نہ تھے۔ والدین ۱۴ انچ کے چھوٹے سے ٹی وی پر اپنے سپوت کے میچ دیکھ رہے تھے جن میں وہ کارنامے دکھلا رہے تھے۔ جب یہ حقیقت حال سامنے آئی' تو لاہور کے ایک ٹی وی چینل نے فخر کے گھر بڑی سی ایل سی ڈی بھجوادی۔

جب فخر نے بھارت کے خلاف فائنل میں سینچری بنائی' تو اُسے بین الاقوامی شہرت وعزت مل گئی اور نامور ماہرین کرکٹ اس کے کھیل کو سراہنے لگے۔ یوں پاک بحریہ کی آغوش میں پلنے بڑھنے اور اپنی صلاحیتوں کو مانجھ لینے والے نوجوان نے اپنے کھیل سے دنیا بھر میں ملک وقوم کا نام روشن کردیا۔ اپنی زبردست کامیابی سے اُسے بھی عزت' دولت اور شہرت نصیب ہوئی۔

فخر زمان کی داستان جدوجہد میں ہمارے لیے کئی سبق پوشیدہ ہیں۔ اوّل یہ کہ وسائل نہ رکھنے والا ایک دیہاتی

نوجوان بھی اپنی محنت و دلیری سے دنیاوی کامیابیاں پا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اُسے راہ دکھلانے والے جہاں دیدہ استاد اور حوصلہ افزائی کرنے والے ادارے مل جائیں۔ دوم یہ سبق

فخر اپنے گھر میں عمائدین علاقہ سے ملتے ہوئے

کہ انسان کو چاہیے کہ وہ راستے میں آنے والی مشکلات سے نہ گھبرائے اور ہمت جوان رکھے۔ کامیابی ایک نہ ایک دن اسے سرخرو ضرور کرے گی۔

کٹلا نگ کے باسی کی حیات ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ایک پاکستانی نوجوان جو شعبہ چن لے اس میں نام پیدا کرنے کے لیے خوب محنت کرے۔ اگر سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں کوئی پاکستانی نوجوان کارہائے نمایاں انجام دے گا‘ تو قوم اُسے بھی سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

انکسار کا دامن نہ چھوڑنا

عزت‘ شہرت اور دولت پانے کے بعد فخر زمان زندگی کے نئے دور میں داخل ہوچکا۔ اس دوران اُسے دوست احباب نے مستقبل کے لائحہ عمل کے سلسلے میں مشورے بھی دیے۔ یونس خان کا مشورہ فخر نے پلے باندھ لیا ہے کیونکہ وہ اُسے بہت پسند آیا۔ یونس خان نے ٹیلی فونک گفتگو میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے نئے ستارے کو بتایا:

”فخر! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ شہرت دھوکا اور سراب ہے۔ جو اس دھوکے میں پھنس جائے‘ وہ تباہ ہو جاتا ہے لہٰذا تم اس سراب میں گرفتار نہ ہونا اور ہمیشہ اپنے قدم زمین پر رکھنا۔ غرور و تکبر کو قریب مت پھٹکنے دینا اور انکسار سے کام لینا۔ آج میڈیا نے تمھاری تعریفوں کے پل باندھ رکھے ہیں، لیکن کل تم کسی میچ میں ناکام رہے‘ تو یہی میڈیا تم پر یلغار کر دے گا۔ لہٰذا مستقبل میں ناکامی پر خود کو تنقید کا نشانہ بننے کے لیے تیار رکھو۔“

فخر کہتا ہے ”مجھے یونس بھائی کے جملے کبھی نہیں بھولیں گے۔ اب میری کوشش ہوگی کہ اپنا کھیل بہتر سے بہتر بناؤں۔ میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ چیمپئنز ٹرافی میں‘ میں نے اتفاقیہ طور پر متاثر کن کھیل پیش نہیں کیا۔ میں ہر میچ میں عمدہ کارکردگی دکھانے کی صلاحیت و اہلیت رکھتا ہوں۔“

فخر زمان کی کامیابی کے پیچھے نظم و ضبط کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ ہر کام بڑی ترتیب سے اور بروقت کرتا ہے۔ اس کی عادات دیکھ کر ہی قومی ٹیم کے ساتھی اُسے ”فخر فوجی“ کہنے لگے۔ اس عرف پر فخر زمان کو بجا طور پر ناز اور مان ہے۔

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاک بحریہ کے دلیر جوانوں نے دشمن کی بندرگاہ‘ دوارکا پر حملہ کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ باون سال بعد پاک بحریہ کے ہی ایک بہادر سپوت نے کھیل کے میدان میں غرور و تکبر سے بھرے دشمن کو ایسی ذلت آمیز شکست دینے میں اہم کردار ادا کیا جسے وہ طویل عرصہ یاد رکھے گا۔

توپ خانے کا ترانہ

صوفی تبسم

ہمارا توپ خانہ، ہمارا توپ خانہ
بلا کا ہے، ہمارا توپ خانہ

جہاں دشمن نے سر اپنا اُٹھایا
کہیں سے بھی قدم آگے بڑھایا
وہیں ہم نے کیا اس کا صفایا
بلا کا ہے ہمارا توپ خانہ

عدو جس طرح چاہے سر چھپائے
ہزاروں پردوں میں چھپ کے آئے
نہیں ممکن وہ ہم سے بچ کے جائے
خطا جاتا نہیں اپنا نشانہ

کبھی جب ہوش میں آتے ہیں ہم لوگ
تو رعد و برق بن جاتے ہیں ہم لوگ
عدُو پر آگ برساتے ہیں ہم لوگ
قیامت ہے ہمارا توپ خانہ

یہ رعد و برق ہیں طاقت ہماری
ہے ان کی گھن گرج شوکت ہماری
یہ شوکت ہے فقط دولت ہماری
ہے ان کے خوف سے لرزاں زمانہ

یہ توپیں اپنی ہمّت کا نشاں ہیں
ہماری عظمتوں کا ترجماں ہیں
یہی ہم اور یہی اپنا جہاں ہیں
یہی اپنا علم، اپنا ترانہ

اپنے وطن پر سلام

منیر نیازی

اے وطن! اسلام کی اُمید گاہِ آخری، تجھ پر سلام
گُل جہاں کی تیرگی میں اے نظر کی روشنی، تجھ پر سلام

نامور شعراء کا افواجِ پاکستان کو روح پرور خراج تحسین

تُو ہُوا قائم خدا کی برتری کے نام پر
بازوئے حیدرؓ، جمالِ احمدیؐ کے نام پر
مرگِ دانش کے جہاں میں لہلہاتی زندگی، تجھ پر سلام
تُو بھی ہے ہجرت کدہ شہرِ مدینہ کی طرح
ہم نے بھی دہرائی ہے اِک رسم آبا کی طرح
اے جلالِ حق کے مظہر، اے نشانِ سرخوشی، تجھ پر سلام
میں ہوں فانی، حسن تیرا مستقل
یاد رکھنا مجھ کو بھی اے شمعِ دل!
سایۂ افلاک تو میں اے بہارِ دائمی، تجھ پر سلام

سپاہی
مجید امجد

تم اس وقت کیا تھے
تمہارے محلکوں، تمہارے گھروں میں تو سب کچھ تھا
آسائشیں بھی، وسیلے بھی
اس کبریائی کی ہر تمکنت بھی!
سبھی کچھ تمہارے تصرف میں تھا..... زندگی کا ہر اِک آسرا بھی،
کڑے بام و در بھی،
خزانے بھی زر بھی
چمن بھی، ثمر بھی،
مگر تم خود اس وقت کیا تھا،
تمہاری نگاہوں میں دُنیا دُھوئیں کا بھنور تھی،
جب اُڑتی ہلاکت کے شہپر تمہارے سروں پر سے گزرے،
تمہاری نگاہوں میں دُنیا دُھوئیں کا بھنور تھی
اگر اس مقدس زمیں پر مراخوں نہ بہتا،
اگر دشمنوں کے گرانڈیل ٹینکوں کے نیچے
مری کڑکڑاتی ہوئی ہڈیاں خندقوں میں نہ ہوتیں،
تو دوزخ کے شعلے تمہارے معطر گھروندوں کی دہلیز پر تھے،
تمہارے ہر اِک بیش قیمت اثاثے کی قیمت
اسی سرخ مٹی سے ہے، جس میں میرا لہو رچ گیا ہے،

تو ہے عزیز ملت
ناصر کاظمی

تو ہے عزیزِ ملت تو ہے نشانِ حیدر
احساں ہے تیرا ہم پر اے قوم کے دلاور
تو عزم کا ستارہ، تو ہے ہلالِ جرأت
تو خادمِ وطن ہے، تجھ سے وطن کی عزت
گاتے ہیں تیرے نغمے راوی، چناب، جہلم
تاروں کی سلطنت پر اُڑتا ہے تیرا پرچم
سلہٹ سے تا کراچی پھیلے ہیں تیرے شہپر
تو ہے عزیز ملت تو ہے نشان حیدر
رَن کچھ کے معرکے میں جوہر دکھائے تو نے
واہگہ کی سرحدوں سے لشکر ہٹائے تو نے
توپوں کے مُنہ کو موڑا، ٹینکوں کا مان توڑا
جو تیری زد میں آیا تو نے نہ اُس کو چھوڑا
زندہ کیا وطن کو تو نے شہید ہو کر
تو ہے عزیز ملت تو ہے نشان حیدر
اونچی تیری اُڑانیں، کاری ترے نشانے
تو نے جلا کے چھوڑے دُشمن کے آشیانے
باندھا ہے وہ نشانہ دُشمن کے گھر میں جا کر
تو نے گرائے ہنٹر اِک آن میں جھپٹ کر
بجلی ہیں تیرے بمبر، شاہیں ہیں تیرے سیبر
تو ہے عزیز ملت تو ہے نشان حیدر
سانڈل کے آسماں سے روکے ہیں تو نے حملے
راوی کی وادیوں پر احسان ہیں تیرے کتنے
چھنب اور جوڑیاں میں گاڑا ہے تو نے جھنڈا
اے دوارکا کے غازی زندہ ہے نام تیرا
ہیبت سے تیری لرزاں کُہسار اور سمندر
تو ہے عزیز ملت تو ہے نشانِ حیدر
وہ شہر بِلّھے شاہ کا بستا ہے تیرے دم سے

خوشحال خاں کی نگری ہے تیرے دَم قدم سے
داتا کا شہر تُو نے پائندہ کر دیا ہے
اقبال کے وطن کو پھر زندہ کر دیا ہے
پردیس، ہر نگر میں چرچا ہے تیرا گھر گھر
تو ہے عزیز ملت تو ہے نشان حیدر

اے غازیانِ پاک
عاصی کرنالی

اے غازیانِ پاک اکیلے نہیں ہو تم
ہر دم خدا کا فضل و کرم ہے تمہارے ساتھ
فتح و ظفر تمہاری قدم بوس کیوں نہ ہو
مقصد کی تیغ، حق کا علم ہے تمہارے ساتھ
ہے غازیوں کے ساتھ کروڑوں دلوں کا زور
پیارو! تمام قوم کا دم ہے تمہارے ساتھ
ہر حق پسند مُلک تمہارا معین ہے
حامی اگر عرب ہے عجم ہے تمہارے ساتھ
تُرکی ہو یا کہ چین ہو یا انڈونیشیا
راہِ عمل میں سب کا قدم ہے تمہارے ساتھ
تُم غازیانِ بدر و اُحد کے عزیز ہو
اُن کی دُعا خدا کی قسم ہے تمہارے ساتھ
شاعر ہو یا خطیب، صحافی ہو یا ادیب
ہر فرد کا جہادِ قلم ہے تمہارے ساتھ
تاریخِ صدق و عدل لہو سے لکھے چلو
توقیر دیں، شکوہِ حرم ہے تمہارے ساتھ
ہے اس جہادِ وقت میں پورا وطن شریک
ہر ہم وطن کا نام رقم ہے تمہارے ساتھ
لشکر تمہارے ساتھ ہیں عزم و ثبات کے
ہیں قافلے تمہارے جلو میں حیات کے
اے غازیانِ پاک اکیلے نہیں ہو تم

تیرے نام اے وطن
سید ضمیر جعفری

میری صبح میری شام
تیرے نام اے وطن
میری پاک سر زمین
میرا دین، دل یقین
میرا ذکر، فکر، دھیان
آن، شان، جندِ جان
میرا قلم - کلام
تیرے نام اے وطن!
میرے ''ہالیوں'' کے ہل
میرے ''مالیوں'' کے پھل
نہر، ندیوں کے چھل
کھیت، باغ، جل، تھل
راہ منزل و مقام
تیرے نام اے وطن!
شہر، دشت، در، جبال
خوش جمال، پُر جمال
میرے خواب اور خیال
یہ جواب، یہ سوال
یہ تمام کے تمام
تیرے نام اے وطن!
رنگ، رسم، رس، رواج
انگ، سنگ، ننگ، لاج
پھول وادیوں کا روپ
ہری چھاؤں، کھری دھوپ
پیار، پیاس کے پیام

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

انرجی ڈرنکس پر پابندی

آج کل سافٹ ڈرنک کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ بچے بڑے اور بوڑھے سب اُسے پینا واجب سمجھتے ہیں۔ موسم گرمی کا ہو یا سردی کا یا جیسا بھی ہو لوگ اب اپنی پیاس بجھانے کے لیے کولا اور انرجی ڈرنک وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ خاص کر بچے۔ گزشتہ کچھ ہفتوں پہلے میڈیا میں یہ خبریں گردش کرتی رہی ہیں کہ تعلیمی اداروں کی کینٹینوں پر فروخت ہونے والے انرجی اور کولا ڈرنکس نہ صرف جعلی بلکہ ان میں نشہ آور کیمکل کا استعمال بھی کیا جارہا تھا۔ یہ بھی انکشاف ہوچکا کہ مختلف پرائیویٹ و سرکاری تعلیمی اداروں میں منشیات کی سپلائی اور فروخت ہورہی تھی جو انتظامیہ کے حرکت میں آنے کے بعد کنٹرول میں ہے۔ پھر پنجاب میں فوڈ اتھارٹی ایکشن میں آئی اور صوبے بھر کے تعلیمی اداروں میں انرجی و کولا ڈرنکس پر پابندی لگادی۔ یہ ایک اچھا اقدام ہے ایسا تمام صوبوں میں ہونا چاہیے تاکہ اس میٹھے زہر سے اپنے بچوں کو بچایا جاسکے۔

(عبدالجبار خان دریشک۔ راجن پور)

ٹیکنالوجی کا غلط استعمال

سیاست کوئی جرم نہیں لیکن ہم اخلاقیات، مذہب، حب الوطنی چھوڑ کر گالی گلوچ اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں ہی لگے ہوئے ہیں۔ دکھ ہے کہ جس مقصد کے لیے اس جدید ٹیکنالوجی کو اپنایا گیا ہم اس کا غلط استعمال کررہے ہیں۔ یہی وہ کمپیوٹر ہے جس سے غیر ملکی بہت کچھ سیکھ کر ترقی کی چھلانگیں لگا رہے ہیں تو دوسری طرف ہم ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے میں لگے ہیں۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ ہمیں آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہمارے بچے دنیا کا مقابلہ کرسکیں۔ یہ مقام صرف سائنس وٹیکنالوجی اور علم حاصل کرکے ہی پانا ممکن ہے۔

ترقی اور مثبت سوچ اپنا کر آگے بڑھنا ہوگا۔ ہم جیت جائیں گے اگر نیت صاف اور بہتر مستقبل کی فکر ہو۔

(شاہ محمود خان مہمند، میاں منڈی گندھاب)

☆☆☆☆☆

میرے لڑکپن کے زمانے کا ذکر ہے، پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے ابھی چار پانچ برس ہوئے تھے۔ لاہور سے ایک نیم فلمی نیم ادبی رسالہ نکلا کرتا تھا ''فلم لائٹ''..... ایڈیٹر تھے خان عیسیٰ غزنوی جو خود شاعر تھے اور اپنے پرچے میں سوالوں کے جوابات دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اُن سے پوچھا گیا

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجیے

انہوں نے جواب دیا

ہے آپ کے سوال کا مطلب یہی حضور
پرچے میں میرا نام ذرا چھاپ دیجیے

سو آپ نے دیکھ لیا پرچے میں نام چھپوانے کا شوق خاصا پرانا ہے تاہم ایسے شوق انسان کو بس ایک خاص عمر تک ہی گھیرتے ہیں پھر بڑھتی عمر کے ساتھ یہ کم ہوتے ہوتے آخر کار ختم ہو جاتے ہیں۔ پچھلے ماہ آپ کو خط لکھنے کا مقصد اپنا نام چھپوانا نہیں محض ایک مسئلے کی نشاندہی کرنا تھا۔ آپ نے نہ صرف اُسے شائع کیا بلکہ جواب میں ادارے کی طرف سے پہلے ایک فون کال اور پھر دکھ کا مداوا کرنے کی تحریری طور پر بھی پیش کش ہوئی۔ خوشگوار حیرت کے ساتھ ساتھ میرے اس یقین کو مہمیز ملی کہ گھر کو یا ادارہ، افراد کی تربیت کا بار ہمیشہ اُس کے سربراہ کے کندھوں پر ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ ایک ہی ہے کہ مناسب راہنمائی کے ساتھ ساتھ خود نمونہ بن کر دکھایا جائے۔ آج جس بڑے پن کا مظاہرہ آپ سب کررہے ہیں، اس کی بنیاد بہت عرصہ پہلے ادارے کے سربراہ جناب اعجاز حسن قریشی صاحب رکھ چکے تھے۔ چودہ پندرہ سال پہلے میں نے کچھ لکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ جو کچھ لکھ سکا وہ اُردو ڈائجسٹ بھیج دیا۔ دوسرے ہی دن ڈاکٹر اعجاز صاحب کا فون آگیا اور انہوں نے نہ صرف میری راہنمائی کی بلکہ حوصلہ افزائی کے لیے مجھے جوابی خط بھی لکھا۔ اتنے سالوں بعد پھر سے وہی حوصلہ افزائی اور بھرپور فوری ریسپانس ملا تو وہ دِن پھر سے یاد آ گئے۔ دعا گو ہوں کہ یہ عمل سدا چلتا رہے اور یونہی چراغ سے چراغ جلتا رہے۔

(محمد سلیم، راولپنڈی)

☆☆☆☆☆

اس بار ایڈیٹر نوٹ ہمارے اجتماعی، سیاسی اور سماجی رویوں کا جائزہ لیے ہوئے تھا۔ یورپی ملک کینیڈا کا آنکھوں دیکھے واقعہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ بلاشبہ وہ معاشرے اخلاقی اقدار میں ہم سے کہیں آگے ہیں۔ اُن کو بات کرنے کا ڈسپلن اور طریقہ آتا ہے۔ یہ سب چیزیں شعور اور کردار سازی سے آتی ہیں جو ہمارے ہاں تقریباً ناپید ہوچکی ہیں۔ سرورق کہانی شہزادہ سلمان بھرپور تجزیاتی رپورٹ تھی۔ الطاف حسن قریشی کا انٹرویو بھی کمال کی چیز تھا۔

(اویس شیخ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

☆☆☆☆☆

اردو ڈائجسٹ ماشاء اللہ برس ہا برس سے اپنا اعلیٰ علمی و ادبی وقار قائم رکھے ہوئے ہے اور اُردو کی بہترین تحریریں ایک ہی رسالے میں مل جاتی ہیں۔ اگست کا شمارہ بھی ماشاء اللہ لاجواب ہے۔ کمال ہے ایک ہی پرچے میں اتنی معیاری تحریریں اور درست تلفظ اور معنوں کے ساتھ ایک ہی ماہ میں کیسے منصۂ شہود میں آجاتا ہے؟؟

آپ سب کو لاکھوں لاکھ دعائیں اور بہت پیار اور اللہ آپ سب کو مزید ہمت اور وافر ترین رزقِ حلال عطا فرمائے آمین

(پروفیسر ڈاکٹر سیّد مجیب ظفر انوار حمیدی، کراچی)

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item/ percentage rates are hereby invited on relevant MRS of finance Department for the works mentioned below from the eligible Contractors/ Films enlisted/renewed for the year 2017 with Public Health Engineering Department as well as registered with **Punjab Revenue Authority(PRA).** Tender request should be accompanied with original copies of enlistment/up to date renewal letter, fee receipt, P.E.C license for 2017 and copy of N.I.C. Authority letter on pad form of the Contractor/Firm along with registered partnership deed, attested power of Attorney on stamp paper along with prescribed tender fee. **The tender/bidding documents are available and will be issued by the Divisional Head Clerk of this office upto 14-09-2017 during the office hours on production of paid 32 A Challan form of tender fee/printing charges deposited in National Bank of Pakistan** as admissible under the rules. Tender rates and amounts should be filled in figures as well as in words. Tender should be signed as per general direction given in the tender documents.

Tender will be received in the office of Commissioner, Sargodha Division, Sargodha up to 1:00 PM on the date of receiving of tenders and will be opened after 30 minutes by the Tender Committee in the presence of intending contractors or their representatives. Conditional Tenders will not be accepted. Undersigned may reject all bids or proposal at any time prior to the acceptance of a bid or proposal and shall, upon request, communicate to any bidder the grounds for its rejection of all bids or proposal but shall not be required to justify those grounds. Tenders not accompanied with **02% estimated price** in the shape of deposit call of schedule Bank, will not be entertained.

"As per amendments by the Finance Department notification No. RO (Tech) FD 1-2/2010 dated 04-09-2012 in tender document/contract form for execution of works." The lowest evaluated bidder will have the deposit additional performance security from the schedule Bank equal to the tender amount below estimate cost within 15 days of receipt of notice or within expiry period of the bid whichever is earlier.

Performance security as per PPRA Rules 2014, clause No. 56, chapter VIII will be applicable.

Tenders will be issued upto 14-09-2017 during office hour
Tenders will be received on 16-09-2017 at 01:00 PM

S. #	Name of Scheme/Works	Estimated Cost (Rs.) in Million)	2% of estimated/ Bid price	Tender Fee	Time Limit
1	Construction of PCC Road in UC **Kund** L=11221 Rft in District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
2	Construction of PCC Road in UC **Waheer** L=11221 Rft in District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months

S. #	Name of Scheme/Works	Estimated Cost (Rs.) in Million)	2% of estimated/ Bid price	Tender Fee	Time Limit
3	Construction of PCC Road in UC **Nali** L=11221 Rft in District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
4	Construction od PCC Road in UC **Nari** L=11221 Rft in District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
5	Construction of PCC Road in UC **Katha** L=11221 Rft in District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
6	Construction of PCC Road in UC **Daiwal** L=11221 Rft in District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
7	Construction of PCC Road in UC **Talukar** L=11221 Rft in District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
8	Construction of PCC Road in UC **Jabbi** L=11221 Rft in District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
9	Extension of Rural Water Supply Scheme **Malwal**, District Khushab	21.305	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
10	Construction of Water Supply Scheme of **Rehman Colony** MC Hadhali, District Khushab	26.472	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
11	Construction of Drainage/ Sewerage Scheme **Rehman Colony** MC Hadhali, District Khushab	29.158	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
12	Construction of Water Supply Scheme of **Zaman Colony** MC Hadhali, District Khushab	26.872	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
13	Construction of Drainage / Sewerage Scheme **Zaman Colony** MC Hadhali, District Khushab	27.523	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
14	Construction of PCC Road from **Bypass Aslam Colony To Jamia Masjid Hujam To Al-Najaf Chaki** i/c left over area L=3280 Rft, District Khushab	1.233	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months

S. #	Name of Scheme/Works	Estimated Cost (Rs.) in Million)	2% of estimated/ Bid price	Tender Fee	Time Limit
15	Extension / Improvement of Water Supply Scheme, **Kuradhi** UC Uchhali, District Khushab	18.598	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
16	Rehabilitation / Improvement of Water Supply Scheme, **Khoora** UC Khoora, District Khushab	10.987	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
17	Rehabilitation / Improvement of Water Supply Scheme, **Fateh Pur Maira** UC Gunjial Shumali, District Khushab	10.826	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
18	Rehabilitation of Water Supply Scheme, **Kufri** UC Kufri, District Khushab	13.382	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
19	Rehabilitation of Water Supply Scheme, **Warcha** UC Warcha, District Khushab	21.685	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
20	Construction of PCC Slab, **UC Choha**, District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
21	Construction of PCC Slab, **Rokhla Mandi**, UC Warcha, District Khushab	9.175	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
22	Provision of Drainage System in UC **Ukhli Mohla** District Khushab	16.537	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
23	Construction of PCC Derajat, **UC Uttra** District Khushab	18.349	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
24	Construction of PCC Slab, **UC Gunjial**, District Khushab	27.522	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
25	Construction of PCC Slab, **UC 14 MB**, District Khushab	18.349	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
26	Provision of Drainage System in MC **Quaidabad** District Khushab	45.216	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months

S. #	Name of Scheme/Works	Estimated Cost (Rs.) in Million)	2% of estimated/ Bid price	Tender Fee	Time Limit
27	Rehabilitation of Water Supply Scheme **Dhok Dullay Wali** UC Warcha, District Khushab	6.850	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	12 Months
28	Provision of 100 Hand Pumps at **Mahar Area**, District Khushab	26.854	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months
29	Provision of Drainage System in MC **Mitha Tiwana**, District Khushab	45.776	2% of estimated Price	Rs. 1000/-	24 Months

IPL-11174

Executive Engineer, Public Health Engg; Division Khushab

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلابیر فرانس کا ممتاز لکھاری گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ''لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، بوجھتے ہیں۔''

اُردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھایئے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اُردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاؤلو کیولو کا یہ قول بھی مدنظر رکھیے:

''ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجزیوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔'' (ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

ادارتی آفس 325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

ملاقاتیں کیا کیا۔ الطاف حسن قریشی پاکستان کی سیاسی تاریخ پر ایک شاندار کتاب

قومی اور عالمی راہنماؤں کی زبانی، سیاست کے نادر ابواب

قیمت 1490 روپے

پاکستان سے بنگلہ دیش۔ اَن کہی جدوجہد	شریف الحق دالیم	860	امریکہ کی عوامی تاریخ		ہاورڈ زن	600
بادشاہی سے جلاوطنی۔ بہادر شاہ ظفر	فرخ سہیل گوئندی	380	مسلمان اُندلس میں		سٹینلے لین پول	380
ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ وتہذیب	فرخ سہیل گوئندی	480	ناموس	ناول	ایلف شفق	580
بکھرتا سماج	فرخ سہیل گوئندی	400	رسولِ کائناتؐ (سیرتِ نبوی)		عبدالکریم ثمر	400
عالمی بینکاروں کی دہشت گردی	فرخ سہیل گوئندی	180	سرخ میرا نام	ناول	اورحان پاموک	780
سلطنتِ عثمانیہ سے جمہوریہ ترکیہ	ضمیر احمد ہاشمی	400	اُجڑے دیار	ناول	انطونیو توریس	500
تاریخِ عالم	ڈاکٹر فیدور کرووکن	750	سرزمین	ناول	انطونیو توریس	300
اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)	جہاں آراء امام	650	چلتا مسافر	ناول	الطاف فاطمہ	800
سکندرِ اعظم۔ دنیا فتح کرنے کی تاریخ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	540	خواب گر	ناول	الطاف فاطمہ	800
سلیمان عالیشان۔ تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ	ہیرالڈ البرٹ لیمب	520	بوئے گل	ناول	یشار کمال	480
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ البرٹ لیمب	590	اناطولیہ کہانی	ناول	یشار کمال	580
حیاتِ قائداعظم	ہیکٹر بولتھو	580	بابِ اسرار۔ دو درویش، شمس تبریز اور رومی		احمت امیت	980
ایم ٹی وی سے مکہ تک۔ اسلام نے کیسے میری کایا پلٹ دی	کرسٹیان بیکر	990	مزاحمت کی سرگوشیاں	ناول	احمت امیت	980
سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان	اعتزاز احسن	800	شیشے کا آدمی (مختصر روسی افسانے)		ڈاکٹر نجم السحر بٹ	550
ایشیا کا مقدمہ (سابق وزیراعظم ملائیشیا کی کتاب)	مہاتیر محمد	200	استنبول (داستانوں کا شہر)	ناول	ماریو لیوی	1600
دہشت گردی۔ ایک فکری مطالعہ	سلمان عابد	780	بادِ بہار	ناول	ژلفو لیوانلی	700

مردِ آہن۔ روسی صدر پوتن کی سنسنی خیز سوانح

Rs.600

کہانی جلال الدین رومی کی

چالیس چراغ عشق کے (ترجمہ)

ایلف شفق

Rs.880 (The Forty Rules Of Love)

Free Delivery ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز. 2۔ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com